مجالسِ حکیم الاسلام

مع سوانح حیات

۲

حکیم الاسلام

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ

کی مجالس جو علم و حکمت اور اہل اللہ کے واقعات سے بھرپور ہیں

اِدارہ تالیفاتِ اشرفیہ

بیرون بوہڑ گیٹ ملتان۔ فون: ۴۰۵۰۱

جلد

مجالس حکیم الاسلام

دوم

نعتِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم

نبئ اکرم شفیعِ اعظم دُکھے دِلوں کا پیام لے لو
تمام دُنیا کے ہم ستائے کھڑے ہوئے ہیں سلام لے لو

شِکستہ کشتی ہے تیز دھارا نظر سے روپوش ہے کِنارا
نہیں کوئی ناخدا ہمارا خبر تو عالی مقام لے لو

قدم قدم پہ ہے خوفِ رہزن زمیں بھی دشمن فلک بھی دشمن
زمانہ ہم سے ہُوا ہے بدظن تمہیں محبت سے کام لے لو

کبھی تقاضا وفا کا ہم سے کبھی مذاقِ جفا ہے ہم سے
تمام دُنیا خفا ہے ہم سے خبر تو خیرُ الانام لے لو

یہ کیسی منزل پہ آگئے ہیں نہ کوئی اپنا نہ ہم کسی کے
تم اپنے دامن میں آج آقا تمام اپنے غلام لے لو

یہ دِل میں ارماں ہے اپنے طیّب مزارِ اقدس پہ جاکے اِک دِن
سُناؤں ان کو میں حالِ دِل کا کہوں میں ان سے سلام لے لو

زندگی کے آخری ایام میں پیش آنے والے جگر خراش اور جانکاہ حادثات نے
حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری **محمد طیب** صاحب نوّر اللہ مرقدہٗ کے حساس دل کو
جس طرح زخمی کیا اس کا حال ان کی زندگی کی اس "آخری نعت" کے ایک ایک حرف سے عیاں ہے

ماخوذ از ماہنامہ خیر المدارس

بحوالہ: دینی دسترخوان (جدید اسلامی انسائیکلوپیڈیا) جلد اوّل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مجالسِ حکیم الاسلام رحمہ اللہ

جلد دوم

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ

مہتمم دارالعلوم دیوبند

کی مجالس جو علم و حکمت اور اہل اللہ کے واقعات سے بھرپور ہیں

مع

حیاتِ طیبہ کے آخری لمحات

تالیف و ترتیب: حضرت مولانا حبیب اللہ قاسمی

ادارہ تالیفاتِ اشرفیہ

پرانی غلہ منڈی ○ بیرون بوہڑ گیٹ ○ ملتان

نام کتاب	مجالس حکیم الاسلام جلد ۲
باہتمام	محمد اسحاق عفی اللہ عنہ
طباعت	اعلان حق پریس ملتان
طبع اول پاکستان	۱۴۱۷ھ
تعداد	ایک ہزار
قیمت	

مجالس حکیم

ملنے کے پتے

- ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان
- طیب اکیڈمی بیرون بوہڑ گیٹ ملتان
- مولانا محمد اقبال نعمانی بکی مسجد کراچی
- ادارہ اسلامیات ۱۹۰ انار کلی لاہور
- مکتبہ رحمانیہ اردو بازار لاہور
- مکتبہ العارفی ستیانہ روڈ فیصل آباد
- یونیورسٹی بک ایجنسی خیبر بازار پشاور
- مکتبہ رشیدیہ سرکی روڈ کوئٹہ
- مکتبہ رشیدیہ راجہ بازار راولپنڈی

فہرست مجالس حکیم الاسلام جلد ۲

فہرست مضامین تذکرہ مجالس حکیم الاسلام

مجلس ۲۴ ۱۲ ر اپریل ۷۲ء

چونکہ مجلس ۲۳ کے مضامین مکمل نہیں ہوئے تھے اس لیے بقیہ مضامین اسی مجلس ۲۴ میں پیش کیے جا رہے ہیں۔

سوال:۔ مولانا محمد الیاس صاحب گونڈوی نے سوال کیا کہ حضرت اگر کسی پر علم کا غلبہ ہو تو اس کے لیے شریعت کا کیا حکم ہے؟

حضرت حکیم الاسلامؒ نے فرمایا کہ علم ہی تو اصل ہے اگر علم نہ ہو تو نہ شوقِ جہاد ہوگا اور نہ شوقِ عبادت ہوگا علم حاوی ہے ساری چیزوں پر یہ اُم الطرق ہے۔ یہی تو راستہ دکھلاتا ہے مگر علم کا کوئی مستقل دروازہ نہیں رکھا گیا ہے چونکہ اس مجلس میں بہت سے طلبا دار العلوم موجود تھے اس لیے غازی صاحب نے فرمایا کہ حضرت ان کا مقصد یہ ہے کہ طلبا کے متعلق کیا حکم ہے حضرت نے فرمایا کہ طلبا میں واقعی جو طلبا ہیں وہ یہاں ہی سے جنت کے راستے پر چل رہے ہیں کیونکہ حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ جو شخص طلبِ علم کے لیے نکلتا ہے وہ جنت کا راستہ طے کرتا ہے اسی لیے ملائکہ علیہم السلام پر بچھاتے ہیں مگر اس سے مراد وہ طلبا ہیں جن کی غرض خالص علم و عمل ہو دنیاوی اغراض مثلاً مال و دولت و شہرت وغیرہ نہ ہوں ان کی عظمت الٰہی سے ہے اور وہ جنت ہی کے راستے پر چل رہے ہیں۔ اس کے بعد حضرت تھوڑی دیر خاموش رہے ہم نے سوال کیا کہ حضرت ان پانچ بزرگوں یعنی حضرت امام غزالیؒ، حضرت شیخ محی الدینؒ ابن عربی، حضرت مجدد الف ثانیؒ، حضرت شاہ ولی اللہؒ، حضرت نانوتویؒ کے علاوہ اپنے اکابرین

میں بہت سے مصنفین ہیں ان میں سے کن حضرات کی تصانیف میں فیوض و برکات زیادہ محسوس ہوتے ہیں۔ حضرت نے فرمایا کہ جس کی کتاب دیکھو گے اس سے راستہ ملے گا۔ یہاں پر تو امتیازی شان فرمائی گئی ہے مگر قدرِ مشترک سارے ہی علما اور مشائخ شامل ہیں ان کی کتابوں سے نورانیت اور برکت پیدا ہوتی ہے اس میں درجات کا فرق ہے۔

حضرت تھانوی اور ان کی تصنیفات

چونکہ اپنے اکابرین میں سے کسی کا نام لے کر حضرت نے اس کی تفصیل بیان نہیں فرمائی اس لیے بعض حضرات نے سوال کیا خصوصاً غلام رسول صاحب کشمیری نے ہمارے پاس خط روانہ کیا ہے کہ حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی تصانیف کے بارے میں حضرت نے کچھ تذکرہ نہیں فرمایا اس لیے ہم نے حضرت سے خود ہی سوال کیا کہ حضرت تھانویؒ کی تصانیف کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟

حضرت نے فرمایا کہ میں کیا چیز ہوں جو حضرت تھانویؒ کی تصانیف کے متعلق رائے پیش کروں۔ حضرت تھانویؒ کا علم و کمال مسلمہ ہے۔ حضرت تھانوی کی ہر کتاب نہایت محتاط اور کمال تَدَیُّن سے بھرپور ہے انھیں کی کتابوں سے تو ہم دین حاصل کرتے ہیں پھر ہماری رائے کی کیا ضرورت ہے۔ حضرت تھانوی صرف عالم ہی نہیں بلکہ عارف باللہ بھی تھے جس طرح علوم ظاہری میں ان کا پایہ بہت بلند تھا اسی طرح علوم باطن میں بھی ان کا پایہ بہت بلند تھا اسی طرح تصوف و معرفت میں بھی ان کا پایہ بہت بلند تھا۔ حضرتؒ نے ہر چیز میں نہایت اعتدال اور انصاف کے ساتھ مسائل تصنیف فرمایا ہے بہر حال جس کی شخصیت ہر اعتبار سے مسلم ہو پھر اس کی کتابوں کے بارے میں میری

رائے معلوم کرنا یہ سوال خود غلط ہے۔ مقلد کی رائے کسی مجتہد کے بارے میں کیا معتبر ہو گی۔

حضرت شیخ الہندؒ کے مقولہ کا حاصل

حضرت حکیم الاسلام نے فرمایا کہ حضرت شیخ الہند کے مقولہ کا حاصل یہ ہے کہ ان بزرگوں کی کتابوں سے علمی راہیں زیادہ کھلتی ہیں ان میں اصولی بحث ہوتی ہے ان سے سینکڑوں شاخیں خود بخود نکل آتی ہیں ان میں سے بعض حضرات کلیات سے بحث کرتے ہیں کیونکہ جب کلیات سمجھ میں آجاتی ہیں تو جزئیات خود بخود سمجھ میں آجاتی ہیں۔ حضرت نانوتویؒ کے یہاں کلیات ہی سے معاملہ چلتا ہے جزئیات بھی وہاں جاکر کلیات بن جاتی ہیں جب کوئی شخص کلیات پر مطلع ہو جاتا ہے تو جزئیات پر ہو ہی جاتا ہے اس لیے حضرت نانوتویؒ جہاں بھی چلتے ہیں وہاں پر اصل ذات باری تعالیٰ کو سامنے رکھتے ہیں کیونکہ اصل اصول اور سرچشمۂ کمالات حق تعالیٰ شانہ کی ذات ہے اور وہ کُلّی الکُلّیات ہے۔ حضرت نانوتوی نے ہر جگہ آفتاب کی تمثیل اختیار کی ہے ان کے کلام میں جگہ بجگہ آفتاب کی مثال ملتی ہے اسی سے حضرت نے مسائل کو حل فرما کر اَقرب اِلَی الفَہم کیا ہے۔

اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کے کلام میں آئینے کی تمثیل زیادہ ملتی ہے کہ عکس یوں پڑتا ہے یعنی آئینے کے اندر جو عکس ہے وہ چھ گونہ نظری ہے آفتاب ہر وقت سامنے ہے اور وہ ایسا ہے جیسا واحد سیارہ اور اس کا فیضان سارے عالم پر پھیلا ہوا ہے جب آپ آئینے کو محاذات میں رکھیں گے اور اس چیز کو سامنے کریں گے تب جا کر انعکاس ہو گا۔

مگر سورج کے لیے یہ قید نہیں ہے بلکہ اس کا عکس جب آئے گا تو تہ خانے

تک بقدر استعداد اس کی روشنی پہونچے گی اور امام غزالیؒ زیادہ تر عقل کے آئینے سے مسائل کو سمجھاتے ہیں یعنی مسائل کو عقلی دلیل سے اقرب الی الفہم کرتے ہیں وہ نقلیات کی تقریر ہی ایسی کرتے ہیں جو معقول ہوتی ہے۔ یعنی نقلی دعویٰ یہ ہے اور اس پر عقلی دلیل یہ ہے۔

مسئلہ ربط حادث بالقدیم

اور حضرت نانوتویؒ بنیادی حقائق سے کلام فرماتے ہیں اور وہ آفتاب کی تمثیل ہی سے سمجھ میں آسکتا ہے بغیر اس کے سمجھنا مشکل ہوتا ہے مثال کے طور پر یہ بات یاد آئی کہ ایک مسئلہ ربط حادث بالقدیم کا ہے یعنی حوادث کو ذات بابرکات باری تعالیٰ سے کیا روابط ہیں اور مخلوقات میں وجود کے آنے کی نوعیت کیا ہے حضرت نانوتوی کی حکمت میں ایک اصول ہے اور وہ یہ ہے کہ جس قدر کمالات ہیں وہ سب وجود کے تابع اور اس کے حصے ہیں اور جس قدر شرور و نقائص اور عیوب ہیں وہ سب عدم کے حصے ہیں مثلاً علم یہ ایک مثبت اور وجودی چیز ہے اور جہالت عدم العلم کا نام ہے چونکہ یہاں پر عدم کی نسبت آگئی اس لیے جہالت عیب دار بن گئی اور علم کے اندر چونکہ وجود کی نسبت ہے اس لیے علم کے اندر کمال ہے اسی طرح قدرت کو کمال کہتے ہیں اور عدم القدرت جس کا لقب عجز ہے وہ عیب ہے کیونکہ اس کے اندر عدم کی نسبت آگئی اسی طرح اختیار کمال ہے اور عدم الاختیار جس کے معنی مجبوری کے ہیں وہ عیب ہے اس لیے کہ اس کے اندر عدم کی نسبت آگئی اسی طرح ان تمام صفات کو دیکھ لیجیے۔

جہاں پر بھی عدم کی نسبت آتی ہے وہ فوراً عیب دار بن جاتی ہے اور جہاں پر وجود کی نسبت آتی ہے وہ صفت کمال بن جاتی ہے لہذا جتنے کمالات ہیں وہ وجود پر موقوف ہیں اور اس کے حصے بھی ہیں اور جتنے عیوب ہیں وہ عدم کے

حصے ہیں۔ حضرت نانوتویؒ نے یہ اصول بیان فرمایا اب اس اصول پر یہ بات خود بخود متفرع ہوتی ہے کہ جہاں پر عدم کا شائبہ بھی ناممکن ہو اور صرف وجود ہی وجود ہو وہاں پر کمال محض ہوگا اور وہ ذاتِ حق ہے کیونکہ یہاں پر وجود عین ذات ہے اور عدم ہے ہی نہیں اور باہر کا عدم بھی یہاں پر نہیں پہنچ سکتا اس لیے حق تعالیٰ ہر صورت میں عدم سے بری ہے کیونکہ کمالاتِ مطلقہ کا سرچشمہ حق تعالیٰ کی ذات ہے اور جہاں پر عدم محض ہے وہاں نقائص اور عیوب ہی عیوب ہوں گے اور وہ بندے ہیں اسی لیے بندوں کے بارے میں قرآن شریف میں فرمایا گیا ہے هَلْ اَتٰی عَلَی الْاِنْسَانِ حِیْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ یَكُنْ شَیْئًا مَّذْكُوْرًا ۝ انسان عدم محض تھا اصل سے تو وہ معدوم تھا مگر بعد میں حق تعالیٰ نے اس کو وجود دیا۔ پہلے نہ ہم تھے اور نہ ہمارا کوئی چرچا تھا بلکہ وجود لگنے کے بعد ہی معلوم ہوا کہ ہم پہلے معدوم تھے اس سے پہلے عدم کا علم ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ اب ظاہر بات ہے کہ جب بندہ معدوم تھا تو جب وجود پڑے گا جبھی تو وہ موجود ہوگا اور عدم سے وجود کا ربط قائم ہوگا۔ یہاں سے ربط حادث بالقدیم کا مسئلہ چلتا ہے مگر ہم وجود آنے سے وجود مطلق نہیں بن سکتے اس لیے کہ اصل سے ہم عدمی ہیں اور جب ہم پر وجود طاری ہوگا تو ہمارا اصلی مزاج عدمی ہے وہ جا ہی نہیں سکتا لیکن جب اوپر سے کچھ کمالات ظاہر ہو گئے تو ہم درمیان رہیں گے یعنی ہم میں کچھ وجود کے حصے ہوں گے اور کچھ عدم کے حصے ہوں گے اس لیے ہمارا ہر کمال مخلوط ہو جائے گا عدم کے ساتھ۔ یا اگر علم ہے تو ساتھ ساتھ عدم العلم بھی رہے گا اگر عدم العلم نہ ہو تو ہم عالم الکل بن جائیں اور ایسا ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ ہمارے علم کا دائرہ محدود ہے اور چاروں طرف سے عدم العلم گھیرے ہوئے ہے یعنی معلومات کم ہیں اور

مجہولات زیادہ ہیں اسی طرح ہماری قدرت محدود ہے اور عدم القدرت غیر محدود ہے۔ یہی صورت ہمارے اختیار کی ہے جب وجود آیا تو اختیار بھی آیا ہم مجبور محض نہیں ہیں بلکہ مختار بھی ہیں مگر مختار مطلق نہیں اس لیے کہ عدم الاختیار نے چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے اس سے معلوم ہوا کہ چاروں طرف عدم الاختیار ہے صرف بیچ میں تھوڑا سا اختیار ہے۔ اسی طرح ہماری ذات اور صفات کو عدم نے گھیر رکھا ہے اسی طرح ہمارے افعال کو بھی عدم نے گھیر رکھا ہے مثلاً ہم آپ سے یوں کہیں کہ یہ چیز اٹھا لاؤ تو آپ اٹھا لائیں گے اسی طرح ہم آپ سے یوں کہیں کہ یہ بستر اٹھا لاؤ تو آپ اٹھا لائیں گے لیکن اگر آپ سے ہم یوں کہیں کہ یہ مکان اٹھا لاؤ تو آپ یہی کہیں گے کہ صاحب مکان اٹھانے کی قدرت ہمارے اندر نہیں ہے اس سے معلوم ہوا کہ ہماری قدرت محدود ہے اور عدم القدرت بہت زیادہ ہے اسی طرح آپ کو ہزاروں مسائل معلوم ہوں گے مگر اس کے بعد پھر بھی وہی عدم العلم ہوگا یعنی ہزاروں مسائل نہیں بھی معلوم ہوں گے اس سے پتہ چلا کہ نامعلوم چیزیں زیادہ ہیں اور معلوم چیزیں تھوڑی ہی ہیں اس کی بنا یہی ہے کہ ہمارے اندر وجود محدود ہے اور عدم جو اصل ہے وہ غیر محدود ہے تو عدمی صفات ہم پر غالب ہیں اور وجودی صفات محدود اور کمزور ہیں۔

آفتاب کی مثال سے مسئلے کی وضاحت

ایک موقع پر حضرت نانوتویؒ نے باہم ربط بیان فرما کر مثال دی ہے کہ دیکھو جب آفتاب نکلتا ہے تو جس جگہ سے گزرتا ہے دھوپ کی ویسی ہی شکل بن جاتی ہے اگر روشن دان گول ہے تو دھوپ بھی گول ہوگی اور اگر روشن دان چوکور ہے تو دھوپ بھی چوکور ہوگی اور اگر روشن دان مثلث ہے تو دھوپ بھی مثلث ہوگی اور اگر مستطیل ہے تو دھوپ بھی مستطیل

ہو گی یعنی جب آفتاب نکلتا ہے تو ہزاروں شکلیں بنتی چلی جاتی ہیں جہاں جہاں
جہاں کسی محدود مقام پر دھوپ کا گزر ہو گا وہیں پر شکل بن جائے گی۔ اب
یوں سمجھنا چاہیئے کہ آفتاب کی یہ سب مصنوعات ہیں اس نے چاروں طرف
اپنی مصنوعات پھیلادی ہیں

شکل کی حقیقت

حضرت نانوتویؒ فرماتے ہیں کہ اس پر غور کرو کہ شکل کی حقیقت کیا ہے تو مسئلہ کھل جائیگا فرماتے ہیں کہ شکل نام ہے نور اور ظلمت کے مجموعہ کا اس لیے کہ چاروں طرف سے ظلمت ہی ظلمت ہے جب درمیان میں نور آیا تو شکل بن گئی اس سے معلوم ہوا کہ نور اور ظلمت کے مجموعہ سے شکل بنتی ہے اگر ظلمت نہ ہو تو نور محض کی کوئی شکل نہیں اسی طرح اگر نور نہ ہو تو ظلمت محض کی کوئی شکل نہیں اس سے ثابت ہو گیا کہ شکل کی حقیقت نور اور ظلمت کا مجموعہ ہے

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس شکل میں نور کہاں سے آیا اور ظلمت کہاں سے آئی۔ ظاہر ہے کہ آفتاب نے شکل بنائی ہے مگر وہاں سے نور ہی نور آیا ظلمت تو آئی نہیں پھر شکل کیسے بن گئی۔ جب کہ وہاں پر ظلمت کا نام و نشان بھی نہیں ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ظلمت آفتاب کی ذات کے اندر ہے اور نور آفتاب کے اوپر سے آیا ہے تو آفتاب کا نور جو باہر سے آیا اور اس کی ذاتی ظلمت نے مل کر ایک شکل بنادی پھر اس شکل میں جو نورانی حصہ ہے وہ آفتاب کا فیض ہے۔ اور جو ظلمانی حصہ ہے وہ اس کا ذاتی حصہ ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جو آفتاب نے اس کو نور بخشا ہے کیا وہ نور آفتاب کے اندر سے کٹ کر آیا ہے یہ ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ اگر آفتاب سے نور ٹکڑے ٹکڑے ہو کر کٹ کر آیا کرتا تو آفتاب کے اندر اندھیرا پھیل جاتا اور سارا

نور بکھر جاتا ایسا نہیں ہوتا بلکہ وہ بدستور اپنے نور اور اپنی اصل حقیقت پر قائم ہے صرف اس نور کے عکوس اور جلال پڑتے ہیں جس سے دوسری چیزیں منور ہو جاتی ہیں۔ یہ دوسرا مسئلہ ثابت ہوا۔

اس کے بعد حضرت نانوتویؒ فرماتے ہیں کہ جتنی ممکنات ہیں وہ متشکل ہیں۔ اور شکل مجموعہ ہے وجود اور عدم کا۔ لہٰذا جتنا وجود ہے وہ اللہ تعالیٰ سے آیا ہے اور جتنا عدم ہے وہ انسان کی ذات میں موجود ہے۔ ان دونوں نے مل کر انسان کو ممکن بنا دیا اور یہ متشکل ہو گیا۔ یہاں پر بھی وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا حق تعالیٰ کی ذات سے جو وجود آیا ہے کیا اس کے حصے ٹکڑے ہو کر بکھر آئے ہیں معاذ اللہ۔ یہ ناممکن اور محال ہے بلکہ ذات حق کی تجزیہ ہی محال ہے کیونکہ وہ جوہر بسیط ہے بلکہ جوہر کا لفظ بھی ان کی شان میں استعمال کرنا بے ادبی ہے کیونکہ حق تعالیٰ کا وجود اپنی عظمت اور حقیقت پر قائم ہے اور وہ غیر منقسم ہے۔ بلکہ لَایَنْفَكُّ وَلَا یُمْكِنُ اَنْ یَّنْفَكَّ ہے یعنی یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ اس کا وجود اس کی ذات سے جدا ہو جائے بلکہ حق تعالیٰ کے وجود اور ان کے نور کی شعاعیں پڑ رہی ہیں جس سے ہم موجود ہیں۔ آفتاب نے ربط حادث بالقدیم کو واضح کر دیا اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب حادث بالقدیم کے ساتھ ملتا ہے تو متشکل بن جاتا ہے اس شکل میں وجود کا حصہ قدیم سے آتا ہے اور عدم کا حصہ خود اس حادث کے اندر موجود ہوتا ہے لہذا حوادث نہ مختار کل بن سکتے ہیں اور نہ مجبور مطلق رہ سکتے ہیں ان میں کچھ جبر بھی ہوگا اور کچھ اختیار بھی ہوگا کچھ علم ہوگا تو کچھ جہل بھی ہوگا۔ اسی طرح ان میں کچھ قدرت ہوگی تو کچھ عجز بھی ہوگا۔ ان دونوں سے ایک شے مرکب ہے۔ یہ مسئلہ استدلالی طور پر سمجھنا مشکل تھا۔ اس لیے حضرت

نانوتویؒ نے آفتاب کی تمثیل سے سمجھا دیا کہ آفتاب نے جو شکلیں بنا دی ہیں اس کی حقیقت پر غور کرو اسی طرح حق تعالیٰ شانہ نے انسان کو وجود بخشا مگر اس کے اندر عدم کا حصہ غالب ہے اور وجود کا حصہ مغلوب ہے۔ اس لیے یہ ممکن بن گیا تو ممکن عدم و وجود کا مرقع ہے۔

مجلس ۲۵ ۱۳ اپریل ۱۹۷۶ء

حدیث ابو رزینؓ پر اشکال اور اس کا جواب ناسخ و منسوخ پر محققانہ بیان۔

سوال :۔ مولانا محمد الیاس گونڈوی نے سوال کیا کہ حضرت حدیث ابو رزینؓ کے اس جملے یعنی کَانَ فِی عَمَاءٍ پر اشکال وارد ہوتا ہے اس سے باری تعالیٰ کی مظروفیت کا شبہ ہوتا ہے۔ حضرت حکیم الاسلامؒ نے فرمایا کہ حضرت نانوتویؒ نے خود اس کی تشریح فرمائی ہے کہ حدیث میں جو کَانَ فی عَمَاءٍ فرمایا گیا ہے یعنی اللہ تعالیٰ پتلے بادل میں تھے یہ متشابہات میں سے ہے اس لیے کہ اعضاء انسان کا اطلاق بہت سی جگہوں پر حق تعالیٰ پر کیا گیا ہے مثلاً ہاتھ پیر ناک چہرہ وغیرہ یہ سارے الفاظ حق تعالیٰ کے لیے بولے گئے ہیں مگر ہر جگہ ان الفاظ کے معنے اس ذات کی شان کے مطابق ہوں گے اگر انسان کے لیے ہاتھ پیر بولا جائے گا تو اس سے مراد ہیت کذائی ہوگی اور اگر جانور کے لیے ہاتھ و پیر بولا جائے گا تو وہاں پر مراد کُھر اور سُم ہوگی لیکن جب حق تعالیٰ کے لیے بولا جائے گا تو ان کی شان کے مناسب معنے ہوں گے نہ وہاں پر جسمانیت ہوگی اور نہ تحویلیت ہوگی اسی لیے بعض متکلمین نے اس سے قوت بادشاہ مراد لیا ہے عماء اس سے مراد وجود محیط ہے ان کا حاصل یہ نکلا کہ حق تعالیٰ اپنے وجود کے دائرے میں ہیں یعنی اپنے دائرے میں کام کر رہے ہیں لہٰذا اس سے ظرفیت لازم نہیں آتی اس لیے کہ وجود عین ذات ہے اگر ہم یوں کہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے وجود کے اندر اندر کام کر رہے ہیں اگر وجود محدود ہو تو وہ بھی محدود اور اگر وجود لامحدود ہے تو وہ بھی لامحدود ہوگا اور وجود چونکہ عین ذات ہے اس لیے

یہی کہا جائے گا کہ وہ اپنے وجود کے اندر اندر کام کر رہے ہیں۔ اس سے ظرفیت لازم نہیں آتی۔

ناسخ اور منسوخ کے سلسلے میں ایک محققانہ بیان

مولانا محمد الیاس صاحب نے سوال کیا کہ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے کم از کم پانچ آیتوں کے اندر دعویٰ کیا ہے کہ یہ منسوخ ہیں مگر مولانا عبدالصمد صاحب رحمانی نے قرآن محکم میں یہ ثابت کیا ہے کہ کوئی آیت منسوخ نہیں ہے حضرت اس کی وضاحت فرما دیں۔

حضرت حکیم الاسلامؒ نے فرمایا کہ مطلقاً نسخ تو ماننا پڑے گا کیونکہ قرآن کریم میں خود اس کی تصریح مَا نَنسَخْ مِنْ آيَةٍ میں موجود ہے لہٰذا نسخ کا انکار تو ممکن نہیں کیونکہ یہ نص قطعی کے خلاف ہے رہا کتنی آیتوں میں نسخ ہے اس کے بارے میں کچھ اصطلاحیں ہیں۔ بعض حضرات کی اصطلاح یہ ہے کہ اگر دو آیتوں میں بظاہر کوئی تعارض معلوم ہو بجائے اس کے کہ ان مواقع استعمال کو الگ الگ کر کے تعارض کو اٹھا دیا جائے اور کہہ دیا جائے کہ یہ منسوخ نہیں ہے تو وہاں پر نسخ کی وہ حقیقت نہیں ہوتی یعنی اِنْتِهَاءُ الْحُكْمِ اِلَى الْعَمَلِ کہ یہ حکم اس حد تک ختم کر دیا گیا ہے۔ اس لیے جب نسخ کی اصطلاح ہو گئی تو بہت سی آیات میں اس اصطلاح کے مطابق نسخ مانا گیا۔

اور ایک یہ ہے کہ واقعی حکم منسوخ ہو گیا ہے تو اس کے متعلق چند گنی چنی آیتیں نکلیں گی۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے صرف پانچ ہی آیتوں میں نسخ مانا ہے مگر بعض حضرات پانچ سے بھی کم مانتے ہیں تو اس طرح کا فرق ضرور ہے ورنہ نفس نسخ کا انکار ممکن نہیں۔ سائل نے کہا مولانا عبدالصمد صاحب نعمانی نے ماکو

مانسخ میں ما شرطیہ مانا ہے اور کہا ہے کہ نسخ کا ثبوت نہیں ہوسکتا۔

حضرت حکیم الاسلامؒ نے فرمایا کہ نسخ کے معنے فی الحقیقت تغلیط کے نہیں ہیں کہ پہلا حکم غلط تھا اس لیے اس کو چھوڑ دیا گیا بلکہ نسخ کے معنے یہ ہیں کہ ایک حکم کسی خاص وقت کے لیے تھا لیکن جب وہ وقت گزر گیا تو وہ حکم بھی ختم کر دیا گیا اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پہلا والا حکم غلط تھا اس کی مثال بالکل ایسی ہی ہے کہ کوئی طبیب کسی مریض کے لیے منضج تجویز کر کے اٹھارہ دن استعمال کرائے تاکہ مادہ پک جائے اس کے بعد اس نسخے کو چھوڑ کر مسہل کا نسخہ تجویز کرے اور نو دن مسہل دے تاکہ اس سے مادہ بالکل صاف ہو جائے پھر اس کو چھوڑ کر تبرید کا نسخہ استعمال کرائے اور کم سے کم نو دن تبرید کا نسخہ استعمال کرائے تاکہ معدہ معتدل بن جائے۔ اب اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ منضج کا اٹھارہ دن کا حکم غلط تھا یا مسہل اور تبرید کا حکم غلط تھا بلکہ احکام اپنی جگہ پر صحیح تھے مگر ہر ایک نسخہ کا حکم ایک خاص وقت کے لیے تھا اب وہ وقت ختم ہو گیا تو وہ حکم بھی ختم ہو گیا اگر اس قسم کا کوئی دوسرا مریض ہو تو طبیب وہی نسخے تجویز کرے گا تو حکم بدستور باقی ہے مگر تین نسخوں کو تین جگہ اور وقت پر استعمال کرایا گیا اسی طرح اگر حسی طور پر دیکھا جائے مثلاً آج ایک بچہ پیدا ہوا تو اس کا کرتہ ایک ہاتھ کا ہو گا جب بچہ تھوڑا سا بڑا ہو گیا تو اس کا کرتہ بھی بڑھا دیا گیا جب اور بڑا ہوا تو پھر اس کا کرتہ بڑا بنایا گیا تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پہلے کے کرتے غلط تھے بلکہ وہ وقت کے مناسب تھے اور صحیح تھے تو حسی امور میں بھی نسخ واقع ہوتا ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ نسخ کا مطلب حکم کی تغلیط نہیں ہوتا بلکہ حکم کی انتہا ہوتی ہے وہ احکام آج بھی موجود ہیں اگر ان کے مواقع آج بھی سامنے آجائیں تو بھی احکام کی وہی ترتیب چلے گی خواہ احکام حسی ہوں یا معنوی ہوں

انبیاء سابقین کی شرائع کے منسوخ ہونیکا مطلب

انبیاء سابقین

کے شرائع کے منسوخ کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ معاذ اللہ وہ شریعتیں غلط آئی تھیں بلکہ اس وقت کی قوموں کی مناسب طبع کے لحاظ سے وہی احکام مناسب تھے اگر ان کو یہ احکام دے دیئے جاتے جو آج کے ہیں تو اس کو وہ لوگ تحمل نہ کرسکتے تھے جیسے یہود و نصاری ہیں۔

مثلاً موسوی شریعت میں انتقام یعنی بدلہ لینا واجب تھا اور معاف کرنا جائز نہیں تھا جیسے قرآن شریف میں فرمایا گیا ہے وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَا أَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ وَالْعَيْنَ بِالْعَيْنِ وَالْأَنفَ بِالْأَنفِ وَالْأُذُنَ بِالْأُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْجُرُوحَ قِصَاصٌ

ترجمہ:۔ میں نے ان پر لکھا اس میں اس بات کو کہ جان جان کے بدلے میں اور آنکھ آنکھ کے بدلے میں اور ناک ناک کے بدلے میں اور کان کان کے بدلے میں اور دانت دانت کے بدلے میں اور زخم قصاص ہے۔

تو ان کے یہاں عفو در گزر جائز نہیں تھا بلکہ انتقام لینا واجب تھا اس لیے کہ قوم یہود مزاج کے لحاظ سے سخت تھی اگر ان کو نرم احکام دے دیئے جاتے تو ان کی تربیت ناممکن تھی نہ ان کے نفوس کی تحلیل ہوتی اور نہ ان کے اخلاق کی اصلاح ہوتی۔

اسی طرح شریعت موسوی میں یہ بھی حکم تھا کہ اگر بے احتیاطی سے کپڑے یا بدن پر نجاست لگ جائے تو جب تک کپڑا کاٹ نہ دیا جاتا اس وقت تک کپڑا پاک نہ ہوتا اس کپڑے کو نہ پانی ہی پاک کرسکتا تھا نہ مٹی ہی پاک کرسکتی تھی اور اگر نجاست بدن پر لگ جاتی تو چاقو سے کھرچنا واجب تھا پانی یا مٹی سے اس کا ازالہ نہیں ہوتا یہ حکم ان کی سخت مزاجی کی وجہ سے تھا وہ لاابالی

اور کج طبع قسم کے لوگ تھے بات مانتے ہی نہیں تھے اس واسطے جب تک ان کو سخت احکام نہ دیئے جاتے اس وقت تک ان کی اصلاح نہیں ہو سکتی تھی۔ قوم یہود کے اندر سختی بھی تھی اور ناز بھی تھا کہ ہم انبیا زادے ہیں ہم کو عمل کرنے کی ضرورت نہیں ہے ہم لوگ بخشے بخشائے ہوئے ہیں جیسا کہ قرآن نے ان کے اس عقیدے کو ظاہر کیا ہے یعنی وہ کہتے تھے نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ ہم اللہ کے لڑکے اور دوست ہیں ہم دوزخ میں کیسے جا سکتے ہیں تو ان کے اندر ناز و غرور بھی تھا اور مزاجوں میں سختی بھی تھی۔ اس واسطے ان کے پاس سخت شریعت بھیجی گئی۔

شریعت عیسوی کی نرمی کی وجہ

اس کے بالمقابل جب عیسیٰ علیہ السلام کا زمانہ آیا تو مزاجوں میں رد عمل ہوا اور یہ قاعدہ ہے کہ ہر سختی کے بعد نرمی عروج کرتی ہے اور رد عمل شروع ہوتا ہے اب پرانے احکامات اس وقت کے لیے مناسب نہیں ہوتے اس لیے نرمی اور تساہل برتا جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قوم نرم مزاج تھی اس لیے ان کو نرم احکام دیئے گئے۔ موسیٰ علیہ السلام کی قوم کے لیے یہ حکم تھا کہ نجاست کھرچنے ہی سے پاک ہو گی صرف پانی سے دھو لینا کافی نہیں تھا مگر عیسیٰ علیہ السلام کی قوم کے لیے یہ حکم دیا گیا کہ اگر سر سے پیر تک نجاست ہی نجاست لگی ہو تو اس کا دھونا ضروری نہیں ہے صرف دل پاک ہونا چاہیئے یعنی ظاہری پاکی ضروری نہیں صرف باطن پاک ہونا چاہیئے۔

اسی طرح انتقام کے بارے میں موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں انتقام لینے کا حکم واجب تھا معاف کرنا جائز نہیں تھا مگر عیسیٰ علیہ السلام کی قوم کے لیے

یہ حکم دیا گیا کہ معاف کرنا واجب ہے انتقام لینا جائز نہیں ہے بلکہ ساتھ ہی ساتھ یہ حکم بھی تھا کہ اگر تمہارے بائیں گال پر کوئی تھپڑ مارے تو دایاں بھی سامنے کر دو کہ بھائی اللہ تیرا بھلا کرے ایک تھپڑ اور مارتا چل چونکہ عیسیٰ علیہ السلام کی قوم کے مزاج اور نفسیات کا یہی تقاضا تھا اس لیے عفو کرنا واجب اور انتقام لینا جائز نہیں تھا۔

شریعتِ محمدیہ میں اعتدال اور میانہ روی کی حکمتیں

اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانہ آیا آپ کی شریعت میں سختی کا ردعمل نرمی اور نرمی کا ردعمل سختی سے دیا گیا یہ اصولی بات ہے کہ جب یہ دونوں ردِعمل ہو جاتے ہیں تو قدرتی طور پر اعتدال آتا ہے اس کی مثال ایسی ہی ہے کہ اگر آپ کی کتاب کا کاغذ مڑ جائے تو اس کو سیدھا نہیں کر سکتے۔ اس کے سیدھا کرنے کی ترکیب یہ ہے کہ اس کو دوسری جانب موڑ دو سیدھا ہو جائے گا تو یہودی شریعت میں تشدد تھا جب تک اس کا ردعمل متساہل کی صورت میں نہ ہوتا اس وقت تک اعتدال نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ ایک فطری اصول ہے اسی لیے آخر میں اعتدال رکھا گیا کیونکہ اس وقت نہ طبیعتیں تشدد پسند رہیں اور نہ تساہل پسند ہی ہیں بلکہ اعتدال پسند ہو گئی ہیں اس لیے شریعت اسلام میں معتدل احکام دیئے گئے مثلاً یہی انتقام کا مسئلہ ہے شریعت اسلام نے یہ نہیں کہا کہ انتقام واجب ہے یا عفو درگزر واجب ہے بلکہ فرمایا گیا جَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا یعنی برائی کا بدلہ برائی ہے تم کو اس کا حق ہے فَاِنِ اعْتَدٰى عَلَیْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَیْكُمْ اگر تم پر کوئی زیادتی کرے تو اتنی ہی زیادتی کرنے کا تم کو بھی حق ہے اس سے زیادہ کرنے کا حق نہیں ہے۔ اس کے بعد حق تعالیٰ

فرماتے ہیں فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُہٗ عَلَی اللّٰہِ لیکن اگر تم عفو درگزر کر دو تو بہت بڑا اجر ملے گا اور کریم النفسی ہو گی تو شریعت محمدیہ نے انتقام کا حق بھی دیا اور عفو درگزر کی فضیلت بھی بیان کر دی تو اسلام میں شریعت موسوی اور شریعت عیسوی دونوں جمع ہو گئیں۔ شریعت موسوی میں انتقام واجب تھا تو اسلام میں جائز رکھا گیا اور شریعت عیسوی میں عفو واجب تھا اسلام میں فضیلت بیان کر دی گئی تو اسلام میں دونوں شریعتیں جمع ہو گئیں اس واسطے کہ اسلام نہ محض یہود کا پیغام تھا اور نہ محض نصاریٰ کا پیغام تھا بلکہ سارے عالم کے لیے پیغام تھا اللہ تعالیٰ نے اس امت کے لیے ایسا رسول بھیجا جو سارے عالم کے لیے قیامت تک کے لیے رحمت ہیں۔

اسلام میں دونوں شریعتوں کو جمع کرنے کی حکمت

جب اسلام آیا تو اس میں سخت قومیں بھی تھیں اور نرم قومیں بھی تھیں اگر انتقام واجب ہوتا تو نرم خو قومیں کبھی اسلام قبول نہ کرتیں اور کہتیں کہ خونخوار مذہب میں کون داخل ہو ذرا سی بات پر اتنی سختی ہم تو اسی کو غنیمت سمجھتے ہیں کہ کوئی لاٹھی مار کر چلا جائے اور ہم دروازہ بند کر کے بیٹھ جائیں اس لیے اسلام نے انتقام کو واجب نہیں کیا اسی طرح اگر عفو درگزر واجب ہوتا تو تند خو قومیں کبھی اسلام قبول نہ کرتیں۔ اور کہتیں بزدلانہ مذہب میں کون داخل ہو۔ یہ کیا مذہب ہے کہ کوئی مار کر چلا جائے اور ہم خاموش بیٹھے رہیں ہم تو بدلہ لینے کے بعد بھی صبر نہیں کرتے چونکہ اسلام ان دونوں قوموں کے لیے بھی پیغام تھا اس لیے ان دونوں کا حق بھی رکھا۔ بدلہ لینے کی اجازت بھی دیدیا تاکہ تند خو قوموں کے لیے بھی سامان ہو جائے اور عفو درگزر کی فضیلت بھی بیان کر دی تاکہ نرم قوموں

کے لیے بھی سامان ہو جائے اور معاف کرنے کو اعلیٰ مقام بتایا۔ اسی طرح یہودی شریعت میں حکم یہ تھا کہ نجس کپڑے کو جب تک کاٹ نہ دیا جاتا اس وقت تک وہ کپڑا پاک نہیں ہو سکتا تھا اور عیسوی شریعت میں حکم یہ تھا کہ اگر سارے کپڑے پر نجاست لگی ہوئی ہو تو پھر بھی نماز پڑھ سکتے ہو یعنی نجاست دھونا کوئی ضروری نہیں تھا لیکن شریعت اسلام نے ان دونوں کے درمیان حکم صادر فرمایا یعنی اگر بدن پر نجاست لگ جائے تو کھرچنا ضروری نہیں بلکہ پانی سے دھو ڈالنا کافی ہے اور اگر پانی نہ ہو تو پانی کے قائم مقام تیمم کو کر دیا یعنی مٹی کو بمنزلِ طہور قرار دیدیا۔ اسی طرح اگر کپڑے میں نجاست لگ جائے تو اس کے متعلق حکم یہ ہے کہ اگر چوتھائی کپڑے سے کم پر نجاست لگی ہو تو نماز پڑھ سکتے ہو۔ مثلاً آستین ہے اگر اس کے چوتھائی حصے سے کم پر نجاست لگی ہو اور پانی نہ ملے تو نماز پڑھنے کی اجازت ہے اور نجاست سے مراد نجاستِ خفیفہ ہے اور اگر نجاستِ غلیظہ ہو تو ایک درہم کے مقدار معاف ہے اور اگر اس سے زیادہ نجاست لگ جائے اور دوسرا کپڑا نہ ہو اور نہ پانی ہو تو اجازت یہ ہے کہ ایسے اندھیرے میں جہاں اپنے آپ کو دیکھ نہ سکے جا کر کپڑے اتار کر نماز پڑھ لو۔

اسلامی اعتدال

یہ جامعیت اسلام میں اسی لیے دی گئی ہے تاکہ اعتدال آجائے چونکہ ردِعمل کا دور ختم ہو چکا تھا اس لیے اسلام میں اعتدال قائم کیا گیا۔ تمام احکام میں خواہ عقائد ہوں یا اخلاق و معاملات ہوں ہر ایک میں عدل رکھا گیا ہے یعنی دونوں جانبوں کی رعایت رکھی گئی ہے مثلاً اخلاق اور مقامات کے بارے میں خوف خداوندی ہے یعنی اللہ تعالیٰ سے ڈرنا یہ تو واجبات میں سے ہے فطرت بھی ہے اور حکم

بھی یہی ہے لیکن اس میں بھی اعتدال رکھا گیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا مانگی اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُکَ خَشْیَتَکَ مَا تَحُوْلُ بَیْنِیْ وَبَیْنَ مَعَاصِیْکَ اے اللہ میں آپ کا اتنا ڈر چاہتا ہوں جو مجھ میں اور معاصی میں حائل ہو جائے میں اتنا خوف نہیں چاہتا کہ لرزتا لرزتا حد یاس تک پہنچ جاؤں کہ میری کوئی نجات ہی نہیں ہوگی تو اللہ کا ڈر جو ایک مطلوب مقام ہے اس میں بھی اعتدال قائم کر دی گئی ہے اسی طرح رجا یعنی اللہ تعالیٰ سے امید باندھنا یہ بھی ایک مطلوب مقام ہے کیونکہ مایوسی کو غفلت قرار دیا گیا ہے اور اس کا ثمرہ جہنم بتایا گیا جیسے کہ قرآن مجید میں فرمایا گیا۔ اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَرَضُوْا بِالْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَاطْمَاَنُّوْا بِھَا وَالَّذِیْنَ ھُمْ عَنْ اٰیٰتِنَا غٰفِلُوْنَ اُولٰٓئِکَ مَاْوٰھُمُ النَّارُ بِمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ ۝ یعنی بیشک وہ لوگ جو ہماری ملاقات کی امید نہیں رکھتے اور دنیا کی زندگی پر راضی ہو کر اس پر مطمئن ہو گئے وہی لوگ ہیں جو ہماری آیتوں سے غافل ہیں وہ وہی لوگ ہیں جن کا ٹھکانہ جہنم ہے اپنے کارناموں کے بدلے تو اللہ تعالیٰ کی ذات سے ناامیدی کو غفلت قرار دیا اور غفلت کا ثمرہ جہنم بتایا گیا تو اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید کرنا مطلوب مقام ہے لیکن اتنی امید کرنا کہ آدمی ڈھینٹ بن جائے کہ آقا کریم ہے معاف ہی کر دے گا یہ بھی مطلوب نہیں اس لیے اس میں بھی شریعت نے اعتدال قائم کر دی تاکہ بے خوف ہو کر معاصی میں بتلا نہ ہو جائے۔ ایک طرف تو یوں فرمایا وَلَا تَایْئَسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰہِ یعنی اللہ تعالیٰ سے کبھی مایوس نہ ہو بلکہ امید باندھو۔ اِنَّہٗ لَا یَایْئَسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰہِ اِلَّا الْقَوْمُ الْکٰفِرُوْنَ ۝ یعنی مومن کا کام اللہ تعالیٰ سے مایوس ہونا نہیں ہے مایوس تو کفار ہوتے ہیں تو یہاں پر امید سکھلائی گئی

اور دوسری جگہ فرمایا گیا وَلَا یَأْمَنُ مَکْرَ اللّٰہِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخَاسِرُوْنَ ۝
ترجمہ: یعنی اللہ تعالیٰ کی خفیہ تدبیروں سے غافل ہو کر بیٹھ جائے اور امیدیں باندھتا رہے اس سے خسارہ میں پڑ جائے گا تو اس سے معلوم ہوا کہ خوف و رجا دونوں مطلوب ہیں اس کا نتیجہ یہ نکلا اَلْاِیْمَانُ بَیْنَ الْخَوْفِ وَالرَّجَآءِ یعنی خوف اور امید کے درمیان رہنے کا ایمان ہے نہ امید محض کا نام ایمان ہے اور نہ خوف محض کا نام ہے ہے اس لیے کہ امید میں پڑا ہوا ملازم کبھی کام نہیں کرتا وہ تو یہی سمجھے گا کہ کچھ بھی کرلو آقا تو کریم ہی ہے۔ بخشا ہی جاؤں گا۔ اور اگر ملازم مایوس ہے تو وہ بھی کام نہ کرے گا اور سوچے گا کہ ہر صورت میں جوتیاں ہی کھانی ہے پھر محنت کرنے کی کیا ضرورت ہے تو آس محض بھی تعطل پیدا کرتی ہے اور یاس محض بھی تعطل پیدا کرتی ہے۔ اگر آس اور یاس دونوں کے درمیان خوف اور امید لگا ہو تو ایمان کامل ہوگا امید تو یہ ہو کہ اگر کام کروں گا تو کل انعام ملے گا اور ڈر یہ ہو کہ اگر نہ کروں گا تو کل کو سزا ملے گی یہی دونوں بازو ہیں جس سے عمل کی گاڑی چلتی ہے اسی لیے اسلام نے تعلیم دی کہ اگر امید ہو تو اعتدال کے ساتھ اور خوف ہو تو اعتدال کے ساتھ اسی طرح مقامات قلوب کے بارے میں حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ اگر کسی سے محبت کرو تو اعتدال کے ساتھ اس لیے ممکن ہے کہ کل کو دشمنی پیدا ہو جائے اور بغض و عداوت کی زیادتی کی وجہ سے شرمندگی ہو اس لیے مقامات قلوب میں بھی اعتدال بتایا گیا ہے۔

اعتدال فی العمل۔

اسی طرح عمل میں بھی اعتدال بتلایا گیا ہے اور فرمایا گیا ہے لَا تُشَدِّدُوْا فَیُشَدِّدَ اللّٰہُ عَلَیْکُمْ یعنی اپنے اوپر اتنی سختی اور محنت و مشقت نہ ڈالو کہ اللہ تعالیٰ بھی تم کو محنت

میں گرفتار کردے جیسے عیسائیوں نے رہبانیت اختیار کرکے اپنے اوپر سختی اور تشدد کا معاملہ کیا انھوں نے رہبانیت میں آکر خود ہی اپنے اوپر طرح طرح کی شاق اعمال لازم کر لیے اور نباہ نہ کر سکے۔ اسی طرح احکام کے بارے میں فرمایا گیا ہے تشدد مت اختیار کرو بلکہ اعتدال اختیار کرو حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ مسجد نبوی کی چھت میں رسی ٹنگی ہوئی تھی آپ نے فرمایا کہ یہ رسی کیسی ہے تو صحابہؓ نے عرض کیا کہ ام سلمیٰؓ عبادت کرتی ہیں اور جب عبادت کرتی کرتی تھک جاتی ہیں تو اس رسی کا سہارا لیتی ہیں آپ نے فرمایا کہ اس کی کیا ضرورت ہے جب نیند آئے تو سو جایا کرو بعد میں عبادت کرلو اسی طرح انفاق فی سبیل اللہ یہ مطلوب ہے مگر اس میں بھی اعتدال بتایا گیا ہے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا لَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ ط نہ تو اپنے ہاتھوں کو اتنا سکوڑو کہ ایک پائی بھی ہاتھوں سے نہ نکلے یعنی بخیل مطلق بن جاؤ اور نہ ہاتھوں کو اتنا پھیلاؤ کہ سب کچھ دے ڈالو اور کل کو روتے پھرو اگر تم سب کچھ دے ڈالو گے تو کل کو تمہاری اولاد کیا کھائے گی یعنی درمیانی راہ اختیار کرو اسی طرح عبادت کے بارے میں قرآن شریف میں فرمایا گیا قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۝ ترجمہ:- یعنی نہ تو عبادت میں اتنا جہر کرو کہ گلے پھاڑنے لگو اور نہ اتنا سر کرو کہ خود بھی نہ سن سکو بلکہ درمیانی راہ اختیار کرو اسی طرح گفتگو کے بارے میں فرمایا گیا وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ط یعنی آواز کو نہ تو اتنی پست کرو کہ دوسرا سن نہ پائے اور نہ اتنی تیز کرو کہ کان کے پردے پھٹنے لگیں بلکہ درمیانی

راہ اختیار کرو اس سے معلوم ہوا کہ انفاق میں بولنے میں عبادت کرنے میں مقامات قلوب میں ہر جگہ اعتدال کا پہلو سکھلایا گیا ہے اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اسلام کی سب سے بڑی خصوصیت اعتدال اور عدل ہے۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ کا صحیح مفہوم سلسلہ بیان جاری رکھتے ہوئے حضرت نے فرمایا کہ ایک مرتبہ ہم نے ایک سیرت کے جلسے میں کہا تھا کہ عموماً سیرت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات بیان کرتے ہیں وہ سیرت نہیں بلکہ تاریخ ہے اور ہمارا موضوع تاریخ نہیں بلکہ سیرت ہے اس لیے ہم آج آپ کے حالات نہیں بیان کریں گے۔

سیرت کے معنی ذاتی خصائل کے ہیں پھر اس میں لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت اور آپ کے عفو درگزر کو بیان کرتے ہیں مگر یہ تو سارے انبیا علیہم السلام میں مشترک ہیں۔ سارے ہی انبیا علیہم السلام کریم النفس اور پاکیزہ اولوالعزم تھے اصل میں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر چیز میں خصوصیت ہے وہ عدل اور اعتدال ہے تو سیرت کے معنی عدل اور اختصاص فی الاخلاق وفی العقائد اور فی الاعمال وفی المقام وفی الاحوال کے ہیں۔ درحقیقت یہ سیرت ہے کہ ہر چیز میں دونوں پہلو جمع کر دیئے گئے ہیں تاکہ جامعیت پیدا ہو جائے اور یہی معنی ہے اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ کا تو اکمال دین کے یہ معنی نہیں ہیں کہ سارے احکام جمع کر دیئے گئے ہیں کیونکہ بقدر ضرورت تو ہر دین میں سارے احکام جمع کر دیئے گئے ہیں بلکہ اکمال کے معنی یہ ہیں کہ یہ دین اس قدر مکمل ہے کہ اگر گھٹاؤ تو نقص پیدا ہو اور بڑھاؤ تو نقص پیدا ہو نہ گھٹنے کے قابل نہ بڑھنے کے قابل

تو یہ ہے اعتدال۔ اکمال کے معنی عدم نقص کے ہیں اور عدم نقص کے معنی عدل کامل کے ہیں تو اسلام کے احکامات اس درجے کے ہیں کہ کمی اور زیادتی کی گنجائش نہیں اور یہ کمال عدل ہی میں ممکن ہے تو اسلام میں دونوں پہلو کی رعایت کی گئی ہے اس لیے سیرت مقدسہ کا بنیادی پہلو درحقیقت اعتدال اور اختصاص ہے۔ یہاں پر حضرت نے سیرت کا تذکرہ فرمایا بیان نہیں فرمایا تفصیلی بیان میرٹھ میں ہوا تھا۔

عبادت کے لیے یکسوئی ضروری ہے

قاری عبداللہ صاحب نے سوال کیا کہ حضرت یہ جو حدیث میں فرمایا گیا ہے حُسْنُ الظَّنِّ مِنْ حُسْنِ الْعِبَادَۃِ اس کا مطلب کیا ہے حضرت حکیم الاسلام نے فرمایا کہ عبادت کے لیے سب سے بڑی چیز یکسوئی ہے اگر یکسوئی نہیں ہے تو عبادت کی روح ختم ہوجاتی ہے صرف ڈھانچہ رہ جاتا ہے اسی لیے نماز میں اِدھر اُدھر نگاہ کرنے کی ممانعت ہے بلکہ ایک جگہ پر نگاہ رہے۔ حدیث شریف سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ نماز کے اندر اگر آنکھ کی پتلی پھیر کر کوئی چیز دیکھ لی تو نماز میں کوئی خلل نہیں پڑے گا البتہ گردن پھیرنے سے نماز مکروہ ہوجاتی ہے اور اگر بدن کا حصہ ادھر ادھر پھر گیا تو نماز باطل ہوجائے گی اس کی وجہ یہی ہے کہ بدن کا حصہ ادھر ادھر پھیرنے سے عبد اور معبود کے درمیان جو رابطہ ہوتا ہے وہ ختم ہوجاتا ہے اسی لیے عبادت کے لیے یکسوئی اور سکونِ قلب شرط ہے۔ اس کے متعلق فرمایا گیا وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ۞ اور نماز بیشک یقیناً بھاری ہے مگر سوائے خاشعین کے اور خشوع کے معنی سکون کے ہیں یعنی جو لوگ ساکن القلب

اور یکسوئی والے ہیں ان پر نماز بھاری نہیں ہے البتہ جن کے افکار میں تشکک ہے بیشک نماز ان پر بھاری ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جب قلب میں سوءِ ظن ہوگا تو اس کے لیے تشکک لازم ہے اور شک ہی کی وجہ سے آدمی کو لوگوں سے بدظنی ہوتی ہے اس لیے فرمایا گیا حسن ظن حسنِ عبادت ہے اور عبادت کا حسن مبنی ہے یکسوئی پر اور یکسوئی کا کمال حسنِ ظن پر حاصل ہوتا ہے۔ اسی لیے حسن ظن کے دلیل کی ضرورت نہیں ہے ظُنُّوا الْمُؤمِنِیْن میں فرمایا گیا یعنی ہر مسلمان کے ساتھ حسن ظن رکھو اور بدظنی کے لیے دلیل کی ضرورت پڑتی ہے جب تک آپ کے پاس دلیل نہ ہو اس وقت تک جائز نہیں ہے کہ آپ کسی کے ساتھ بدظنی قائم کریں۔ یورپ میں ہم نے اس کی عجیب مثال دیکھی ہے وہ لوگ ہر شخص کو ایماندار سمجھتے ہیں وہاں پر آرڈر یہ ہے کہ جب تک کوئی حجت نہ ہو یا گورنمنٹ کی طرف سے اشارہ نہ ہو اس وقت تک بلاوجہ تلاشی مت لو یہاں تو کسٹموں پر ہر چیز کی تلاشی لیتے ہیں اور چھان بین کرتے ہیں مگر وہاں پر یہ بات نہیں ہے صرف یہ پوچھ لیتے ہیں کہ کوئی بات قابلِ اعتراض تو نہیں اگر کہہ دو کہ نہیں تو کہتے ہیں جاؤ البتہ اگر کسی پر شبہہ ہو جائے یا گورنمنٹ کا اشارہ ہو تو پھر تلاشی کرتے ہیں یہ حسن ظن ہی کا معاملہ ہے لہٰذا ہر چیز کے اندر قلب کی یکسوئی بڑی نعمت ہے آدمی کا سینہ آئینہ کے مانند ہو اس میں کوئی کھوٹ نہ ہو تبھی عبادت کے اندر یکسوئی پیدا ہو سکتی ہے اسی لیے فرمایا گیا ہے کہ اگر آپس میں جھگڑا ہو جائے تو تین دن کے اندر مصافحہ کر لو اور ایک دوسرے کی طرف رجوع کر لے اگر کسی سے غلطی ہو جائے تو وہ اپنی غلطی تسلیم کر لے اگر لوگ ایسا کر لیا کریں تو بات ختم ہو جائے گی ورنہ

آپس میں تشدد بڑھتا ہی رہے گا اور یہ قلب کے لیے مضر ہے تو عبادت کا حاصل وہ وسیلہ ہے جو عبد اور معبود کے درمیان قائم رہتا ہے اور وہ یکسوئی ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔

شریعت کا کوئی حکم ایسا نہیں ہے جو عقل میں نہ آسکے

حضرت نانوتویؒ نے عجیب اصول بیان فرمایا ہے شریعت کا مسئلہ یہ ہے کہ خروج نجاست سے وضو ٹوٹ جاتا ہے ایک بار ایک پادری نے اعتراض کیا کہ خروج نجاست کے بعد تو طہارت حاصل ہو جاتی ہے اور آپ طہارت کا حکم کرتے ہیں اس کی وجہ کیا ہے حالانکہ خروج نجاست سے پہلے طہارت کا حکم کرنا چاہیئے جب طہارت کی بنا ختم ہو گئی تو اب وضو کرنے کا حکم کیسے کرتے ہیں۔

حضرت نانوتویؒ نے جواب دیا کہ خروج نجاست ناقضِ وضو نہیں ہے بلکہ ناقضِ وضو دوسری چیز ہے اور وہ امتلاء معدہ ہے یعنی معدہ کا بھر جانا یہ ناقضِ وضو ہے اور خروج نجاست اس کی علامت ہے اور یہ قاعدہ کی بات ہے کہ جب معدہ بھر جائے گا تو جو چیز معدہ کے اندر ہو گی وہ چھلک کر باہر آئے گی اور ظاہر ہے کہ جب معدہ نجاسات یا ریاح فاسدہ سے پُر ہو گیا تو قدرتی طور پر باہر آئے گی تو نجاست کا باہر آجانا یہ ناقضِ وضو نہیں ہے بلکہ ناقضِ وضو امتلاء معدہ ہے لہٰذا ایسی حالت میں آدمی دربار خداوندی میں جانے کے قابل نہیں ہوتا اور تردد رہتا ہے اور جب نجاست نکل گئی تو معلوم ہوا کہ اب معدہ خالی ہو گیا اور تردد بھی ختم ہو گیا اور اس کو یکسوئی حاصل ہو گئی اب وہ دربار خداوندی میں جانے کے

قابل ہو گیا اس لیے اب اس کو وضو کرنے کا حکم کیا جاتا ہے چونکہ معدہ کا بھر جانا ایک باطن چیز تھی اس لیے شریعت نے اس کے خروج کو علامت قرار دیدیا۔ حضرت نانوتویؒ کا دعویٰ ہے کہ شریعت کا کوئی حکم ایسا نہیں ہے جو عقل میں نہ آسکے یا عقل کے خلاف ہو اسی طرح قہقہا کے بارے میں فقہا حضرات کہتے ہیں کہ یہ امر تعبدی ہے یعنی اس میں کوئی حکمت عقلی نہیں ہے مگر حضرت نانوتویؒ نے فرمایا کہ یہ ممکن نہیں کہ کسی امر شرعی میں کوئی عقلی دلیل نہ ہو اور قہقہا کے بارے میں حضرت نے فرمایا کہ اس میں بھی حکمت عملی موجود ہے اور وہ یہ ہے کہ جب آدمی قہقہا لگاتا ہے تو اس کا قلب تعجب اور حیرت سے پُر ہو جاتا ہے اور جب یہ کیفیت پیدا ہوتی ہے تو غیر اللہ کی طرف اتنی توجہ ہو جاتی ہے کہ خدا کی طرف کوئی توجہ باقی نہیں رہتی اس واسطے قہقہا کو ناقض وضو کہا گیا ورنہ خود قہقہا ناقض وضو نہیں ہے بلکہ ناقض وضو وہ تعجب اور حیرت ہے جس کی وجہ سے بے التفاتی پیدا ہوتی ہے اس سے معلوم ہوا کہ قہقہا بھی محض امر تعبدی نہیں ہے بلکہ وہ امر معقول بھی ہے۔ حاصل یہ نکلا کہ خواہ عادت ہو یا عبادت ہو ہر ایک کے اندر شریعت یہی چاہتی ہے کہ یکسوئی اور سکون باقی رہے اس کے بغیر نہ عادی امور مکمل ہو سکتے ہیں اور نہ عباداتی امور مکمل ہو سکتے ہیں اسی لیے عادات میں بھی یکسوئی باقی رکھی گئی ہے اور عبادات میں بدرجہ اولیٰ باقی رکھا گیا ہے تاکہ نفس مطمئن ہو اور نفس کا مطمئن کرنا یہ خود امر شرعی ہے۔

نفس کے درجات

قرآن شریف میں نفس کے تین درجے بیان کئے گئے ہیں ایک نفس امارہ دوم نفس لوامہ سوم نفس مطمئنہ۔ نفس امارہ کا تو ابتدائی درجہ یہ ہے کہ نفس امارہ پہلے آدمی کو

شہوات اور شبہات کی طرف لے جاتا ہے اور وہ تشکک کا شکار ہو جاتا ہے کہیں پر وہ شہوات کا شکار ہو جاتا ہے اور کہیں پر شبہات میں مبتلا ہو جاتا ہے لیکن جب آدمی ذکر اور مجاہدہ شروع کر دیتا ہے تو درمیانی درجہ آتا ہے اس کو نفس لوامہ کہتے ہیں۔ لوم کے معنی تردد کے ہوتے ہیں یعنی آدمی کبھی نیکی کی طرف جاتا ہے اور کبھی بدی کی طرف جاتا ہے اور پھر نیکی کی طرف لوٹ آتا ہے جب آدمی کی یہ حالت ہو جاتی ہے تو اس کے بعد تیسرا درجہ آتا ہے اس کو نفس مطمئنہ کہتے ہیں یعنی آدمی اللہ کی ہر تقدیر پر راضی ہو کر مطمئن ہو جاتا ہے پھر اس کے قلب میں تشکک اور پراگندگی باقی نہیں رہتی۔ اس سے معلوم ہوا کہ شریعت کا مقصد یہ ہے کہ قلب میں یکسوئی رہے اسی لیے بزرگانِ دین مجاہدات اور ریاضات کراتے ہیں تاکہ شبہات باقی نہ رہیں

قاری عبداللہ صاحب نے سوال کیا کہ حضرت نانوتویؒ نے جو نواقض وضو کے لیے حکمت بیان فرمائی ہے وہ بظاہر حدیث کے خلاف ہے کیونکہ ظاہر حدیث سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ نقض وضو کی علامت خراج نجاست اور قہقہا ہے تو حضرت نانوتویؒ کی استنباط اور استخراج کی بنا کیا ہے۔

حضرت حکیم الاسلامؒ نے فرمایا کہ شریعت کا حکم تو ظاہر ہی پر لگتا ہے لیکن ظاہر کے لیے ایک باطن ہوتا ہے یہ خود شرعی قاعدہ ہے کیونکہ پہلے قلب کے اندر ایک چیز پیدا ہوتی ہے پھر اس کا ظہور فعل سے ہوتا ہے اسی لیے نیت شرط قرار دی گئی ہے کیونکہ نیت پہلا فعل ہے جو قلب سے ہوتا ہے اور اس کے بعد جو فعل ظاہر ہوتا ہے وہ اس کا مظہر ہوتا ہے ایک ہے مصدرِ عمل اور ایک ہے مظہرِ عمل مصدرِ عمل نیت ہے وہ مکلف ہے قلب کا اور مظہرِ عمل یہ اعضاء ظاہر سے سرزد ہوتا ہے تو ہر ظاہر کے لیے

ایک باطن ہوتا ہے اور باطن اسی مناسبت سے ہوتا ہے جیسا ظاہر ہوتا ہے اور ظاہر اسی مناسبت سے ہوتا ہے جیسا باطن ہوتا ہے اسی لیے فرمایا گیا وَذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَبَاطِنَهٗ ط یعنی ظاہری و باطنی ہر قسم کی برائیوں کو چھوڑ دو۔ ظاہری برائیاں وہ افعال کے ہیں اور باطنی برائیاں وہ اخلاق اور ملکات کے ہیں اسی لیے ہر مکلف کے لیے ایمان اور اسلام دو چیزیں رکھی گئی ہیں۔ ایمان تو قلبی فعل ہے جو امر مبطن ہے اور اسلام اس کا ظاہری فعل ہے جو افعال کے ذریعہ سرزد ہوتا ہے اسی لیے شریعت نے کسی امر میں قلب کو الگ نہیں رکھا بلکہ ہر ظاہر کے ساتھ باطن کو جوڑ دیا ہے اسی طرح یہاں پر خروج نجاست اور قہقہا یہ دونوں ظاہری فعل ہیں اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کا باطن کیا ہے تو شریعت ظاہر پر حکم لگا رہی ہے مگر باطن کی نفی نہیں کر رہی ہے۔ ظاہری احکام تو قواعد شرعیہ سے ثابت ہوتے ہیں اور باطن اہلِ معرفت پر منکشف ہوتا ہے اسی لیے حضرت نانوتویؒ نے خروج نجاست اور قہقہا کا باطن ظاہر فرمایا۔

اس پر پھر قاری عبداللہ نے سوال کیا کہ اس کا حاصل یہ نکلا کہ اعراض قلب و دماغ عَنِ الْحَقّ یہ ناقض وضو ہے تو سوال یہ ہے کہ اگر آدمی کسی دوسرے دنیاوی فکر میں متفرق ہو اور اتنا مستغرق ہو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی توجہ بالکل نہ ہو تو کیا یہ بھی ناقض ہے۔ حضرت حکیم الاسلامؒ نے فرمایا کہ اہلِ حقائق تو یہی حکم لگائیں گے کہ طہارت باطل ہو گئی مگر اہلِ ظاہر یہ حکم نہیں لگائیں گے کیونکہ شریعت نے جو ظاہری احکام ناقض وضو کے لیے متعین کیا ہے ان میں سے کوئی چیز یہاں پر نہیں پائی گئی یہاں پر تو ظاہر مع باطن مراد ہے مطلق باطن مراد نہیں ہے یعنی جہاں پر ظاہر ہے تو اس کا

باطن ضرور ہوگا لیکن جہاں پر ظاہر ہی نہیں ہے تو ہمارا کوئی حق نہیں کہ ہم اس پر حکم لگائیں البتہ اہل باطن حکم لگا سکتے ہیں۔

اس پر پھر قاری عبداللہ صاحب نے سوال کیا کہ حدیث میں جو حسن الظن مِن حسنِ العِبَادۃِ فرمایا گیا ہے اگر سکونُ القلب مِنْ حُسنِ العِبَادۃِ فرماتے تو کیا حرج تھا کیونکہ اس بیان سے یہی معلوم ہو رہا ہے کہ اصل مقصود سکون قلب ہے اور سکون قلب کی بنا صرف حسن ظن ہی نہیں بلکہ اور چیزیں ہیں جو بنیاد بن سکتی ہیں۔ حضرت حکیم الاسلام نے فرمایا کہ یہ تو دعویٰ بھی نہیں کیا گیا ہے کہ سکون قلب منحصر ہے حسن ظن پر بلکہ مطلب یہ ہے کہ جملہ اسباب حسن عبادت میں سے ایک حسن ظن بھی ہے مگر دوسروں کی نفی نہیں کی گئی یہ تو ایک مثال ہے جس طرح حسن ظن کو مامور بہ قرار دیا گیا ہے اسی طرح اور چیزوں کو بھی مامور بہ قرار دیا گیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے باہمی ربط

قاری عبداللہ صاحب نے سوال کیا کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وضو فرما رہے تھے اور حضرات صحابہ گرتے ہوئے پانی سے اپنے بدن کا مسح کر رہے تھے آپ نے پوچھا کہ ایسا کیوں کر رہے ہو تو صحابہ حضرات نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم ایسا آپ کی محبت کی وجہ سے کر رہے ہیں اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ من سرہٗ ان یحب اللہ ورسولہٗ ویصدق حدیثہٗ اذا احدث ولیأتِ اَمَانتہ اذا أُتُمِنَ ویحس جوار مَنْ جارہٗ۔

تو سوال یہ ہے کہ امانت اور صدق مقام اور پڑوسیوں کے ساتھ حسنِ سلوک اور رسول کی محبت کا تعلق اور باہمی ربط ان تین چیزوں کے

کے ساتھ کیا ہے۔ حضرت حکیم الاسلامؒ نے فرمایا کہ یہ تو ظاہر ہے کہ محبت خداوندی مستلزم ہے۔ محبتِ عباد اللہ کو جس کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہوگی وہ عزیز و اقربا سے بھی محبت کرے گا اور جس کو شہوات سے محبت ہوگی وہ اس سے دور ہوگا اور جس کو اللہ اور اس کے رسول سے زیادہ محبت ہوگی وہ صلہ رحمی بھی زیادہ کرے گا اور برابر حقوق بھی ادا کرے گا خواہ وہ پڑوسیوں کے حقوق ہوں یا اسلامی حقوق ہوں۔ حاصل یہ نکلا کہ خدا اور رسول کی محبت مستلزم ہے۔ ادائے حقوق اسلامیہ کو ان میں سے اہم ترین حقوق یہ ہیں کہ امانت میں خیانت نہ کرے پڑوسیوں کے ساتھ صلہ رحمی کرے اور ان کی ادائگی حقوق میں کوتاہی نہ کرے اس لیے کہ امانت کا تعلق ایمان سے ہے اگر امانت میں خلل پڑ گیا تو پھر ایمان میں بھی خلل پڑے گا اور اگر دیکھا جائے تو ایمان نام ہے اللہ اور اس کے رسول کی محبت کا اسی لیے حدیث شریف میں فرمایا گیا لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اکون اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْ وَّلَدِہٖ وَوَالِدِہٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ ۝ یعنی تم میں سے کوئی کامل مسلمان اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کی اولاد و ماں باپ اور سارے انسانوں سے زیادہ محبوب نہ بن جاؤں اس سے معلوم ہوا کہ ایمان کی حقیقت محبتِ رسول ہے اور محبت خداوندی کے بارے میں فرمایا گیا وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ ط .... اور ظاہر بات ہے کہ جس کو اللہ اور رسول سے کافی محبت ہوگی تو اس کا ایمان بھی مضبوط ہوگا۔

ایمان اور کفر کی زمین

ایمان کی زمین امانت ہے جیسے کفر کی زمین فتنہ ہے۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے لَا اِیْمَانَ

لِمَنْ لَّا اَمَانَۃَ لَہٗ ط یعنی جس شخص میں امانت نہیں ہے اس کے اندر ایمان بھی نہیں ہے تو ایمان کی زمین جس پر ایمان نکھرتا ہے وہ درحقیقت امانت ہے جیسے کفر کی زمین جس پر کفر نکھرتا ہے وہ فتنہ ہے۔ قرآن شریف کی یہ دو اصطلاحیں ہیں ایک امانت اور ایک فتنہ امانت ایک پھیلاؤ ہے جس میں سارے اعمالِ خیر آجاتے ہیں۔ اسی طرح فتنہ ایک پھیلاؤ ہے جس میں سارے اعمالِ شر آجاتے ہیں۔ اسی لیے اس وقت تک ایمان کامل نہیں ہو سکتا جب تک کہ قلب کے اندر امانت کا مضمون موجود نہ ہو اس سے معلوم ہوا کہ ادائے امانت درحقیقت بنیاد ہے ایمان کی اسی طرح صدق مقال ہے کیونکہ جب آپ ایمان کی تعریف کرتے ہیں تو یہی کہتے ہیں اَلْاِیْمَانُ ھُوَ اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ وَتَصْدِیْقٌ بِالْجَنَانِ وَعَمَلٌ بِالْاَرْکَانِ ط یعنی زبان سے اقرار کرنا اور دل سے اس کی تصدیق کرنا اور ارکان پر عمل کرنا ایمان میں پہلے صدق مقال ہے کیونکہ اگر کوئی آدمی جھوٹا بن جائے تو اس پر صدق مقال صادق نہ آئے گا اسی طرح اگر زبان سچی نہ ہو تو ایمان میں خلل پڑے گا تو ایمان کے اندر تین چیزیں ہیں ایک خبری ایک معاملاتی اور ایک عملی انھیں تین چیزوں سے ایمان پرکھا جاتا ہے یعنی زبان و عمل و معاملہ اگر نہ ہوں تو ایمان کو پہچاننا مشکل ہے۔

علم کسے کہتے ہیں اس کا صحیح مفہوم

تھوڑی دیر توقف کے بعد حضرت حکیم الاسلامؒ نے فرمایا کہ علم اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیا ہے۔ اختراعی نہیں ہے اس لیے علم کے اندر دو نسبتیں پیدا ہو گئیں ایک نسبتِ علمی اللہ تعالیٰ کی طرف سے

بندے تک اور ایک نسبت علمی بندے کی طرف سے اللہ تک یعنی علم اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتا ہے اور بندہ اس کو قبول کرتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ علم نام ہے نسبت کا اگر نسبت نہ ہو تو علم بھی نہ ہو گا بلکہ جہالت ہو جائے گی۔ لیکن وہ علم جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئے گا تو اس میں ایک نسبت ہو گی جو ذات حق کے ساتھ قائم ہو گی۔ فقیہہ کے اندر دو چیزیں ہوتی ہیں ایک منسوب اور ایک منسوب الیہ ان دونوں کے درمیان نسبت ہے حضرت نانوتویؒ فرماتے ہیں کہ علم تو درحقیقت اسی نسبت کا نام ہے اگر عبد اور معبود کے درمیان جو نسبت اور رابطہ ہے وہ معلوم ہو جائے تو انسان کے اندر بصیرت پیدا ہو جائے اسی لیے حضرت نانوتویؒ کا دعویٰ ہے کہ منسوب اور منسوب الیہ کا نام علم نہیں ہے بلکہ یہ تو علم کے اطراف ہیں اگر کتنا ہی بڑا عالم ہو جائے لیکن نسبت اور رابطہ سے واقف نہیں ہے تو وہ حافظ تو کہلائے گا مگر عالم نہیں کہلائے گا عالم تو وہ ہے جو جزیات سے کلیات کو مربوط دیکھے اور نسبت کا علم بھی رکھتا ہو۔

محدث اور فقیہہ میں فرق

محدث تو وہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سننے کی خبریں سنے اور اسے نقل کر دے خواہ وہ فقیہہ بھی ہو مگر محدث ہونے کی حیثیت سے اس سے زیادہ کا اس کا وظیفہ نہیں ہے۔ اور فقیہہ وہ ہے جو ہر حکم کو اس کی علت سے مربوط کرے۔ جس وقت کسی حکم کی علت منکشف ہو گی تو اجتہاد کے دروازے کھلیں گے پھر وہ اجتہاد کرے گا۔ ہم تو زیادہ سے زیادہ حکمت معلوم کر لیتے ہیں مگر حکمت کا دارومدار حکم پر نہیں ہے۔ ارباب بصیرت حکمت پر غور کرتے ہیں اور فقہا حضرات اس کی علت پر غور کرتے ہیں۔

ہر حکم کا منشا کوئی نہ کوئی صفت ربانی ہے اور اس کا یہ تقاضہ ہے کہ یہ حکم آئے مثلاً باپ ہونے کا تقاضہ یہ ہے کہ اس کی اولاد بھی ہو اور استاذ ہونے کا تقاضہ یہ ہے کہ اس کے شاگرد بھی ہوں۔ جس طرح بندے کی مختلف صفات سے مختلف حقوق عائد ہوتے ہیں۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کی صفات کمال سے احکام صادر ہوتے ہیں۔ ہر حکم کسی نہ کسی صفت خداوندی کا تقاضہ ہے اسی لیے مجتہد پہلے علت کو دیکھتا ہے پھر منشا کو دیکھتا ہے پھر اس پر حکم لگاتا ہے۔

مجلس ۲۶ ۲۰/ اگست ۱۹۷۶ء

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض خصوصیات اور مسلمانوں کے اعمال کے اثرات غیر اقوام پر۔

سوال :۔ مولانا محمد خالد بلیاوی نے سوال کیا کہ حضرت قرآن کریم کی اس آیت یعنی هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ ط - میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جن اوصاف کو بیان کیا گیا ہے ان کی وجہ اختیار کیا ہے آپ کے اوصاف اور بھی تو ہیں۔ حضرت حکیم الاسلامؒ نے فرمایا کہ آپ کی سب سے پہلی خصوصیت رسولاً منہم ہے۔

رسالت مجموعہ ہے سارے کمالات ظاہرہ اور باطنہ کا اس کے بعد کوئی مرتبہ باقی نہیں رہتا اول تو رسولاً فرمایا گیا اس کے بعد جو اوصاف بیان کئے گئے وہ رسالت کے فرائض ہیں وہ دراصل اوصاف نہیں ہیں آپ نے ان فرائض کو اعلیٰ ترین طور پر انجام دیا یہ حقیقت میں آپ کا اعجاز ہے اور اس اعجاز کا مبنیٰ اُمیت کو ظاہر کیا گیا مثال کے طور پر اگر ایک شخص پڑھا لکھا ہو تو اس کے متعلق کہہ سکتے ہیں کہ پڑھا لکھا ذہین آدمی تھا اس نے شریعت کی بہت سی اونچی نیچی باتیں بیان کردی ہیں یہ کوئی کمال نہیں ہے لیکن جب ذاتِ اقدس نے نہ لکھا نہ پڑھا پھر اس کی قوم کو دیکھا جائے وہ خود ان پڑھ وہاں پر پڑھنے لکھنے کا دستور ہی نہیں تھا۔

حتیٰ کہ ان کا لقب ہی جہلائے عرب تھا اور زمانہ کا نام زمانۂ جاہلیت تھا وہاں پر جہالت کے سارے اسباب مہیا تھے پھر جس علاقے میں آپ کی قوم آباد تھی اس کے بارے میں فرمایا گیا ہے وَادٍ غَيْرِ ذِي ذَرْعٍ تو یہ بھی نہیں تھا کہ تجارت اور زراعت کی فراوانی کی وجہ سے دنیا کے سارے حکما وہاں پر جمع ہوتے رہے ہوں اور ان کی صحبت میں بیٹھ کر علوم وکمال حاصل کر لیے ہوں بلکہ وہ خطہ ہی ایسا تھا کہ اس میں تمدن کا اگنا ہی مشکل تھا صدیوں سے قوم جاہل ہوتی چلی آرہی تھی اگر ان میں ایک دو پڑھا لکھا نکل بھی گیا تو قوم پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا اور نہ قوم کے اندر علم وتمدن کا جذبہ ہی پیدا ہو سکتا۔ ظاہر ہے کہ ایسی قوم میں ایک شخص پیدا ہو اور علوم ومعرفت کا دریا بہا دے علاوہ رسالت کے اور کیا ہو سکتا ہے۔

وہاں پر یہ بھی نہیں کہ باہر سے آکر ان میں علم والے ٹھہرتے رہے ہوں پھر ان میں ایک ایسی ذات ہو جس کے بارے میں فرمایا جائے مَا كُنْتَ تَدْرِىْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ ط نہ آپ کتاب سے واقف اور ایمان سے واقف پھر خطہ ایسا اور قوم ایسی اور ماحول ایسا اگر ان میں کوئی ایسا شخص پیدا ہو جس میں بظاہر علوم کے اسباب بھی نہ ہوں پھر وہ ایسا علوم بیان کرے کہ جس کے پاس بیٹھنے والوں کی یہ حالت ہو کہ وہ صرف علما ہی نہیں بلکہ علما اور عرفا کے استاذ بن جائیں اور ایسے علوم پھیلائیں کہ دنیا میں جس کی نظیر نہ ہو یہ بجز وحی خداوندی اور من جانب اللہ تربیت کے جس کا حاصل رسالت اور نبوت ہے کیا ہو سکتا ہے تو درحقیقت یہ دعویٰ ہے رسول ہونے کا اور اُمّی اس کی

دلیل ہے اس کے آگے وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَٰبَ وَالْحِكْمَةَ اِ
اس کے فرائض ہیں آپ نے اس قوم کو تعلیم دی آپ ان کے استاذ ہوئے
اور استاذ کا کمال اسی وقت سمجھا جاتا ہے کہ اپنے شاگردوں کو اپنے
جیسا بنا دے آپ کے ایک لاکھ چوبیس ہزار تلامذہ تیار ہوئے وہ
نبی تو نہ تھے لیکن نبیوں کی نسبت پر ضرور تھے۔ ہر صحابی کے اندر کسی
نہ کسی نبی کی صفت موجود تھی ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیا علیہم السلام
آئے اور اتنے ہی صحابہؓ تھے اسی لیے صحابہؓ کے اندر نبوت کا جذبہ
اور ذوق موجود تھا یہ ایک ہی ذاتِ اقدس کی تعلیم کا اثر تھا کہ ہزاروں
علما پیدا ہو گئے پھر آپ نے عمل کا وہ نمونہ دکھلایا جس کے سامنے اہلِ عرب
کی گردنیں جھک گئیں جن کو کوئی نہیں جھکا سکتا تھا یا تو وہ خون کے پیاسے
تھے یا تو ان پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا غلبہ اس درجہ
ہوا کہ آپ کے ایک قطرہ پسینہ پر اپنا خون بہانے کے لیے تیار ہو گئے
پھر ان کی کیفیت یہ ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں مال و
دولت اولاد وطن کو چھوڑ کر مفلس ہو کر آپ کے پاس پہنچے اور اسی
مفلسی کی حالت میں وہ مگن رہے جس کی وجہ سے علم کی دولت ان کے
ہاتھ آئی اور ایسی ذات سے آئی جس کے پاس بظاہر علم کے اسباب
موجود نہ تھے ایک ذات جو عالم البشر ہو اور اس کی تعلیم سے بڑے بڑے
علما پیدا ہو جائیں یہ اس کی دلیل ہے کہ آپ کی رسالت حق تھی اور
رسالت بھی اعلیٰ ترین رسالت جس کو ختم نبوت سے تعبیر کیا گیا ہے۔
حضرت عیسیٰؑ کا مقولہ ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے ظاہر
ہے کہ جس ذاتِ اقدس کے پیدا کردہ پھل ایسے ہوں کہ دنیا علم و حکمت

سے لبریز ہو جائے یہ سوائے نبوت اور تعلیم خداوندی کے اور کیا چیز ہو سکتی ہے صحابہؓ کے اندر جو یہ شان پیدا ہو گئی تھی کہ ہر وقت دین کی خاطر مرنے اور گھر لٹانے کے لیے تیار رہتے تھے اس کے علاوہ توبہ وزہد وقناعت وانابت الی اللہ اُن کے اندر کس نے پیدا کیا یہ وہی ذات اقدس نے پیدا کیا جو اُمی تھی اور ہزاروں اُمیوں کو پورے عالم کا استاذ بنا دیا یہ سوائے الہام خداوندی اور نبوت کے کیا ہو سکتا ہے۔ پھر یہ سوال پیدا ہو سکتا تھا کہ بیشک قوم جاہل تھی لیکن ماں باپ نے ان کی ایسی تربیت کی جس کی وجہ سے وہ عام لوگوں سے ممتاز ہو گئے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ والد ماجد مرحوم تو آپ کی پیدائش سے پہلے ہی اٹھا لیے گئے تھے اور والدہ ماجدہ کا انتقال بھی بچپن ہی میں ہو گیا تھا۔ تربیت کرنے والے ماں باپ ہی ہو سکتے تھے مگر وہ پہلے ہی اٹھا لیے گئے۔ تو جس کا نہ کوئی مربی ہو اور نہ تربیت کرنے والا ہو پھر بھی وہ علوم کا دریا بہائے یہ سوائے اعجاز کے اور کیا چیز ہو سکتی ہے تو رسولاً یہ دعویٰ ہے اور اُمیین یہ دلیل ہے بقیہ چار فرائض نبوت ہیں اس کے آگے جو آپ کے اوصاف ہیں وہ دوسری آیت میں بیان کیے گئے ہیں اگر آپ کی حیات طیبہ کو دیکھا جائے تو یہی معلوم ہو گا کہ نہ آپ نے کسی سے کبھی انتقام لیا اور نہ بد دعائیں کیں۔ طائف کے سفر کی واپسی پر ملائکہ نے عرض کیا کہ اگر آپ فرمائیں تو ہم ان پہاڑوں کو ملا دیں جس سے وہ لوگ کچل جائیں مگر آپ نے فرمایا اَنَا بُعِثْتُ رَحْمَۃً میں تو رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں میں اللہ تعالیٰ کی ذات سے یہی امید کرتا ہوں کہ اگر یہ لوگ مسلمان نہیں ہوئے تو ان کی اولاد میں سے ایسے لوگ پیدا فرمائے گا جو اللہ کی عبادت

کریں گے تو جس ذات کے اندر عفو درگزر اور یہ تحمل اور صبر و استقلال ہو اس کو نبی کے سوا اور کیا کہا جائے گا آپ نے علم کا وہ کارخانہ جاری کیا جس سے آپ کی امت علمی بن گئی آپ کی امت میں بڑے بڑے آفتاب و ماہتاب پیدا ہوئے جو علمی کمالات سے بھرپور تھے بڑے بڑے محدثین و فقہا اور محققین عجیب و غریب حکمت بیان کرنے والے علما پیدا ہوئے ادھر تصوف کے دفتر میں جاؤ تو بڑے بڑے مشائخ اور صاحبِ کرامات و مکشوفات اولیاءِ کاملین ملتے ہیں۔ یہ ایک ہی ذات کا فیض ہے۔

اسلام کی خصوصیت

بلاشبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام بڑے بڑے اولوالعزم پیغمبر تھے اور پیغمبر ہونا خود اس کی دلیل ہے کہ ان کے علوم جامع کمالات سے بھرپور تھے مگر کسی کی سیرت محفوظ نہیں ہے اور نہ کسی کی مِن جانبِ اللہ لائی ہوئی کتاب ہی محفوظ ہے اس کے اندر کافی تحریف اور تبدیلی پیدا ہوئی پھر ان کتابوں کے جب شباب کا دور تھا تو اس دور میں علما اور حکما کو پیدا ہونا چاہیے تھا مگر پیدا ہوئے تو اس امت میں پیدا ہوئے۔ یہ اسلام کی خصوصیت ہے ظاہر ہے کہ جس ذات اقدس کی امت نے دوسروں کو بولنا سکھلایا تو خود اس ذات اقدس کا کیا کہنا پھر مسلمانوں کے مواعظ اور ان کی لکھی ہوئی دینی کتابیں جب غیر اقوام تک پہونچی ہیں تو غیر شعوری طور پر اثر انداز ہوتی ہیں بقول حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ لدھیانوی جب ۱۹۴۷ء میں انقلاب آیا تو پنجاب مسلمانوں سے خالی ہو گیا تو وہاں کے ہندوؤں نے ایک بہت بڑا مشاعرہ کیا اور مولانا

حبیب الرحمن رح کو صدر بنا کر بلایا جب مولانا تشریف لائے تو لوگ گلے مل کر روئے اور بہت روئے اور پھر کہنے لگے کہ مولانا آپ گئے تو ہمارا دین و دھرم بھی لیتے گئے مولاناؒ نے فرمایا کہ بھائی ہم تمہارا دین و دھرم کیسے لے گئے انھوں نے کہا کہ آپ لوگ تھے تو یہاں کی مسجدیں آباد تھیں پانچ وقت اذان ہوتی تھی اذانیں سن کر ہمارے دلوں میں بھی جذبہ اٹھتا تھا کہ ہم بھی بھگوان کا نام لیں مگر اب نہ اذانیں ہیں اور نہ نماز و روزہ کا منظر ہے اس لیے ہم تو ٹھنڈے پڑ گئے ہمارا دین و دھرم ختم ہو گیا وہ تمہارے دم سے قائم تھا تو غیر اقوام بھی اس کا اعتراف کرتی ہیں کہ مسلمانوں کی عملی زندگی سے ہم کو فائدہ پہونچتا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اگر ان کے گھروں تک علم دین نہ بھی پہونچے تو اذانوں کے ذریعہ اللہ کا نام ان کے گھروں تک تو ضرور پہونچتا ہے ایک زمانے میں دارالعلوم کی مسجد کے موذن جان محمد مرحوم ترکی تھے جب وہ اذان کہتے تھے تو لوڈ اسپیکر نہ ہونے کے باوجود بلا تکلف ان کی اذان اسٹیشن سے سنی جاتی تھی ان کی آواز اتنی تیز تھی کہ کافی دور تک جاتی تھی جب ان کی اذان شروع ہوتی تھی تو بہت سے ہندو ادب سے بیٹھ جایا کرتے تھے کہ اب اللہ کا نام لیا جا رہا ہے حقیقت یہی ہے کہ اگر غیر اقوام تعلیم و تبلیغ کے جلسوں میں شریک نہ بھی ہوں مگر چونکہ اس قوم مسلم کی زبان پر اللہ کا نام ہے اس لیے غیر شعوری طور پر اس کے اثرات ان پر پڑتے ہیں۔ دنیا کی غیر اقوام نے اسلام کا اثر قبول کیا یہ ایک ہی ذات بابرکات کے اثرات ہیں اس لیے اگر یہ چیزیں آپ کی رسالت یا نبوت کی دلیل نہیں ہیں تو اور کیا چیز ہے۔ ایک ہیں برہانی دلیلیں وہ آپ بیان کرتے رہیں اور ایک

ہیں عیانی اور واقعاتی دلیلیں اس کا اثر عوام و خواص بھی قبول کرتے ہیں ایک صاحب نے سوال کیا کہ حضرت ہم کو غیر اقوام میں بھی تقریر کرنے کی نوبت آتی ہے ہم ان کے سامنے کیا چیز بیان کریں جس سے اسلام کی خصوصیت ان کے سامنے آجائے۔ حضرت حکیم الاسلام نے فرمایا کہ اسلام کی ہزاروں خصوصیات ہیں مگر کھلی ہوئی خصوصیت یہی ہے کہ یہ دین نقلی ہے محض عقلی اور اختراعی نہیں ہے محض عقل اور اختراع کا نام دین نہیں ہے کیونکہ اسلام آیا ہے نقل روایت سے اور نقل روایت میں اسناد کی ضرورت پڑتی ہے اگر سند غلط ہوگی تو نقل روایت صحیح نہ ہوگی چونکہ اسلام کی سند صحیح ہے اس لیے اسلام کی سند جتنی محفوظ ہے دنیا کے کسی مذہب کی سند اتنی محفوظ نہیں ہے مثلاً کتاب اللہ ہے اس کی سند تواتر طبقات سے پہنچی ہے۔ ہر دور میں لاکھوں کی تعداد میں حفاظ موجود رہے اور آج بھی موجود ہیں اسی لیے قرآن کا ایک ایک لفظ موجود ہے۔ اس کے علاوہ اس امت نے کلام رسول کی جو حفاظت کی ہے اتنی حفاظت کسی اور نبی کی امت نے کلام خداوندی کی بھی نہیں کی۔ حدیث شریف کے ایک ایک جملے کی سند رسول اللہ علیہ وسلم تک پہونچی ہوئی ہے اگر کسی سند میں کوئی شبہ ہوا تو محدثین نے اس کو رد کر دیا اس سے بڑی خصوصیت اسلام کی کیا ہو سکتی ہے۔

مجلس ۲۷؍ اکتوبر ۱۹۷۶ء

انعامات خداوندی پر شکر گزاری کا طریقہ اور صوفیائے کرام کے اصطلاحی الفاظ کی تصریح۔

سوال :۔ ہمارے اوپر اللہ تعالیٰ کے اتنے احسانات اور انعامات ہیں کہ اگر ہم ان کو شمار کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے اِدھر بندے پر ہر نعمت اور احسان کے بدلے شکر گزاری لازم ہے تو ہم اللہ تعالیٰ کا شکر کن الفاظ سے کریں جس کی وجہ سے ہمارا نام بھی شاکرین میں شامل ہو جائے۔

دوسری بات یہ ہے کہ عام طور پر علما اور عوام سبھی حضرات کا یہی طرز ہے کہ جب ان کو کوئی چیز دی جاتی ہے تو کہتے ہیں کہ آپ کا بہت بہت شکریہ تو کیا لفظ شکریہ سے شکر کا حق ادا ہو جاتا ہے۔

حضرت حکیم الاسلامؒ نے فرمایا کہ ظاہر بات ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ کی انعامات بے شمار ہیں اگر کوئی ان کی گنتی کرنا چاہے تو یہ ناممکن ہے اور خود قرآن کریم میں فرمایا گیا وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا اگر تم اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو گننا چاہو تو اس کا احصا کرنا ممکن نہیں اس کی وجہ بالکل کھلی ہوئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احسانات لامحدود ہیں اور انسان محدود ہے تو محدود چیز لامحدود کا شکر حقیقی کیسے کر سکتی ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے حکم فرمایا کہ ہمارا شکر ادا کرو۔ انبیا علیہم السلام اللہ کے کلام کو سمجھتے ہیں تو داؤد علیہ السلام نے فرمایا کہ اے اللہ میں آپ

کا شکر کیسے ادا کروں کیونکہ جب آپ کا شکر ادا کروں گا تو توفیق آپ ہی دیں گے جبھی تو شکر کروں گا اور یہ توفیق ایک نعمت ہوگی تو پھر آپ کا شکر ادا کروں گا یہ بھی آپ کی توفیق ہوگی پھر اس کا شکر ادا کروں گا تو ہر توفیق ایک نعمت ہوگی اور ہر نعمت پر شکر لازم ہے تو میں حیران ہوں کہ آپ کا شکر کیسے ادا کروں کیونکہ ہر شکر سے پہلے ایک شکر نکلتا ہے لہذا آپ کا شکر ادا کرنا بہت مشکل ہے تو حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اے داؤد جب تم یہ سمجھ گئے کہ ہمارا شکریہ ادا کرنے سے تم عاجز ہو تو یہی ہمارے شکریہ کی ادائگی ہے تو اقرار عجز بھی اللہ تعالیٰ کا شکر ہے آدمی یہی سوچے کہ اے اللہ آپ کے احسانات لامحدود ہیں اور ہمارا شکر محدود ہے تو ہم آپ کا شکر کیسے ادا کریں ہم عاجز ہیں یہ اپنی عجز کا اقرار ہے تو شکر کی ایک صورت یہ ہے اور دوسری صورت یہ ہے کہ آپ اجمالی طور پر کہیں کہ اللہ ہم آپ کے احسانات اور انعامات کے شکر گزار ہیں یا جیسے کہ حدیث شریف میں فرمایا گیا اَللّٰھُمَّ لَآ اُحْصِیْ ثَنَآءً عَلَیْکَ اَنْتَ کَمَا اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِکَ ط حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا ظاہر فرمائی کیونکہ حمد تو لامحدود ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے کمالات لامحدود ہیں اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حمد اختیار فرمایا کہ میری قدرت میں یہ نہیں ہے کہ آپ کی حمد کا احصا کرسکوں ہماری کیا حقیقت ہے آپ ایسے ہی ہیں جیسا کہ اپنا ثنا آپ نے خود فرمایا۔

خدا کی تو ثنا کامل یہی ہے ۔۔۔ کہ ہم سے کچھ ثنا ممکن نہیں ہے

شکریہ کی حقیقت اور اس کے الفاظ

اور آپ نے جو یہ سوال کیا کہ آج کل لوگ کسی چیز

کے ملنے پر کہتے ہیں کہ آپ کا بہت بہت شکریہ۔ یہ شکریہ نہیں ہے اس سے شکر ادا نہیں ہوتا۔ سوال یہ ہے کہ عام طور پر جو یہ کہا جاتا ہے کہ آپ کا بہت بہت شکریہ تو یہ خبر ہے یا انشاء اگر خبر ہے تو آپ نے شکر ادا ہی کب کیا کہ جس کی خبر دے رہے ہیں اور اگر انشا ہے تو یہ وعدہ ہے اس سے شکریہ پورا نہیں ہوا لہذا اس کو شکریہ کہنا ہی غلط ہے کیونکہ شکر کے الفاظ شریعت میں وارد ہیں وہ یہ ہیں مثلاً جَزَاكَ اللّٰهُ فِي الدَّارَيْنِ خَيْرًا مَنْ قَالَ جَزَاكَ اللّٰهُ فَقَدْ اَدَّ الشُّكْرَ........ جس نے جزاک اللہ کہا تو اس نے شکر ادا کر دیا اسی طرح یا یہ کہے کہ هَدَاكَ اللّٰهُ ۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہدایت دے۔ یا یہ کہے زَادَكُمُ اللّٰهُ خَيْرًا ۔ اللہ تعالیٰ تمہاری خیر کو زیادہ کرے۔ منشا یہ ہے کہ شکریہ کے لیے کوئی دعا دی جائے۔

حضرت تھانوی کی جب آنکھ کمزور ہو گئی تو اکثر خطوط خواجہ عزیز الحسن صاحب سے لکھایا کرتے تھے جب کوئی ان کے پاس دعا کے لیے لکھتا تو حضرت فرماتے کہ لکھدو میں آپ کے لیے دعا کر رہا ہوں اس پر میرے دل میں خلجان پیدا ہوا کہ حضرت جو یہ فرماتے ہیں کہ آپ کے لیے میں دعا کر رہا ہوں یہ واقعہ کے خلاف ہے۔ حضرت نے دعا ہی کب کی جس کی وجہ سے یہ فرماتے ہیں کہ میں دعا کر رہا ہوں اس کا مطلب یہ ہے کہ میں دعا کروں گا۔ تو حضرت کو ان کے مقاصد کب یاد رہیں گے کہ فلاں کا فلاں مقصد ہے اور ابھی تک حضرت نے دعا فرمایا نہیں پھر دعا کرتا ہوں اس کا مطلب کیا ہے یہ خلجان میرے دل میں رہا۔ پانچ چھ دن بعد حضرت نے فرمایا کہ یہ جو میں لکھاتا ہوں کہ لکھ دو آپ کے لیے میں دعا کر رہا ہوں ممکن ہے کسی کے دل

میں خلجان ہو اگر یہ خبر ہے تو ہم نے دعا ہی کب کیا کہ جس کی خبر دے رہا ہوں اور اگر یہ وعدہ ہے تو اتنی چیز یاد کب رہیں گی ممکن ہے کسی کے دل میں یہ خلجان ہو فرمایا کہ اس کا جواب یہ ہے کہ میں پہلے دعا کر لیتا ہوں پھر یہ لکھتا ہوں کہ لکھ دو آپ کے لیے میں دعا کرتا ہوں یہ جملہ خلاف واقعہ نہیں ہے بہر حال شکریہ کے جو جامع کلمات ہیں ان کو استعمال کرنا چاہیئے۔ اور دعا کرنا چاہیئے اور کہے کہ بھائی میں آپ کے لیے دعا کر رہا ہوں اللہ تعالیٰ آپ کے مقاصد حسنہ کو پورا فرمائے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہمارے لیے خصوصی دعا فرمائیں میں کہتا ہوں کہ وہ خصوصی دعا کیا ہے تو کہتے ہیں کہ نام لے کر دعا فرمائیں میں کہتا ہوں کہ اگر نام یاد نہ ہو تو پھر کیا ہو گا ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہاتھ ہی ہاتھ دعا کر دیں۔ آدمی فرمائش بھی کرے اور قید بھی لگائے۔ یہ فرمائش کیا ہوئی یہ تو آڈر ہو گیا۔ بس دعا کی درخواست کافی ہے۔

انعام خداوندی پر شکر گزاری کا طریقہ

اسی طرح اگر اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کا شکریہ ادا کرنا ہو تو یہ کلمات استعمال کرے مثلاً اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ۔ اَشْکُرُ اللّٰہَ ط حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے اَللّٰھُمَّ لَکَ الْحَمْدُ شُکْرًا وَّلَکَ النِّعْمَۃُ فَضْلًا۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ بِنِعْمَتِہٖ تَتِمُّ الصَّالِحَاتُ۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ اَوَّلًا وَّاٰخِرًا۔ جس طرح کا عمل ہو گا۔ اسی طرح سے اللہ تعالیٰ کا شکریہ ہو گا مثلاً اگر کھانا کھائے تو اس طرح کا شکریہ ادا کرے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَطْعَمَنِیْ وَسَقَانِیْ وَجَعَلَنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ اور اگر کپڑے پہنے تو شکریہ میں یہ دعا پڑھے اَلْحَمْدُ

لِلّٰہِ الَّذِیْ مَآ اَوَادِنِیْ بِہٖ عَوْرَتِیْ وَاَتَجَمَّلُ بِہٖ اور اگر استنجا سے واپس آئے تو یہ دعا پڑھے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَذْھَبَ عَنِّی الْاَذٰی وَعَافَانِیْ ۔ تو ہر نعمت کی دعا اور شکریہ الگ الگ ہے اگر یہ دعائیں یاد نہ ہوں تو اللہ تعالیٰ کی ہر ملنے والی نعمت پر یوں کہے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی کُلِّ حَالٍ یا اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ اَھْلِ النَّارِ یا یہ کہے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی اٰلَائِہٖ وَنِعْمَائِہٖ ۔ شریعت میں اس قسم کی جامع دعائیں بتلائی گئی ہیں لیکن محض لفظ شکریہ سے نہ خدا کا شکر ادا ہوتا ہے اور نہ ہی بندے کا ادا ہوتا ہے ۔ شریعت کا مقصود یہ ہے کہ شکر میں کوئی نہ کوئی دعا ہو لیکن جو لوگ یہ کہہ دیتے ہیں کہ ہم آپ کے بہت بہت مشکور ہیں یہ تو بالکل مہمل ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ ہی نعمت بھی دیں اور ہمارا شکریہ ادا کریں ۔

صوفیاء کرام کے بعض اصطلاحی الفاظ کی تشریح

قاری عبداللہ نے سوال کیا کہ حضرت لفظ لاہوت اور ناسوت کس زبان کے الفاظ ہیں اور ان کا مطلب کیا ہے ۔ حضرت حکیم الاسلامؒ نے فرمایا کہ یہ دراصل حضرات صوفیا کی اصطلاحیں ہیں ۔ انھوں نے کچھ اصطلاحات مقرر کر لی ہے اور اس میں مصلحت یہ ہے کہ جب احوال مستور ہوں تو الفاظ بھی ایسے ہی ہوں تاکہ عام لوگ اس کو نہ سمجھ سکیں ۔

مامدعی بگوید اسرار عشق مستی ‌ ‌ ‌ بگذار داد گیرد بر رنگ خودپرستی

جیسے عورت اپنے آپ کو نامحرم سے چھپاتی ہے اسی طرح صوفیائے کرام اسرار غامضہ اور حقائق کو چھپاتے ہیں چونکہ لوگ ان اسرار

کے سمجھنے کے اہل نہیں ہوتے نہ معلوم لوگ کیا سے کیا مطلب مراد لیتے ہیں اس لیے وہ حضرات قصداً ایسی اصطلاحات مقرر کر لیتے تاکہ لوگ نہ سمجھ سکیں اور سمجھیں تو یہ سمجھیں کہ یہ تو کوئی الگ بات ہے مثلاً جیسے واصل بخدا یعنی جو خدا تک پہونچکر خدا اسے مل گیا ہو اور کامل ہو گیا ہو اس کا نام صوفیا نے نامراد رکھا ہے حالانکہ جو واصل ہو چکا ہو تو اس سے زیادہ بامراد کون ہو سکتا ہے مگر اس کو نامراد کہتے ہیں مگر ان کا مقصد یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے کمالات لامحدود ہیں اس لیے انسان جس کمال تک پہونچے گا اس سے آگے بھی کمالات ہوں گے اور وہ لامحدود ہوں گے ہمیشہ ہمیش مجاہدات کرنے کے باوجود حدِ کمال تک انسان نہیں پہونچ سکتا تو بامراد ہو ہی نہیں سکتا بلکہ نامراد ہی رہے گا۔

اسی طرح واصل بخدا کو یہ حضرات کافر بھی کہتے ہیں لیکن یہاں پر کافر بمعنے منکر خدا نہیں بلکہ کافر بمعنے منکر غیر اللہ ہے یعنی غیر اللہ کا انکار کرنے والا۔

اسی طرح لاہوت ہے یہ غالباً ہُوَ سے لیا گیا ہے ہُوَ سے اشارہ ذات حق کی طرف ہے هُوَاللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ... یا اسیطرح صلوٰۃ کو یہ حضرات اپنی اصطلاح میں ہویت سے تعبیر کرتے ہیں یعنی نفسیت نفس کو ہویت سے تعبیر کرتے ہیں وہ بھی ہُوَ ہی سے لیا ہے لفظ ہُوَ اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اور لاہُوَ غیر اللہ کے لیے ہے۔ حق تعالیٰ کا وجود اصلی ہے باقی سارا وجود باطل ہے تو جب ہُوَ اللہ تعالیٰ کے لیے استعمال کیا گیا تو لاہُوَ غیر اللہ کے لیے استعمال کریں گے یعنی وہ ہے اور یہ نہیں ہے۔ اگر اس کو لاہوت بنالیں تو کوئی مذائقہ نہیں ہے اسی طرح لفظ ناسوت

ہے۔ مثلاً ناس اس کا اطلاق آدمیوں پر آتا ہے تو اس کو صوفیاء نے ناسوت کہدیا۔

اسی طرح لفظ جبروت ہے۔ حق تعالیٰ جابر ہیں مجبور نہیں ہیں سارے عالم پر ان کا جبر قائم ہے اس مقام کو صوفیا حضرات جبروت کہتے ہیں۔ کیونکہ اس مقام پر پہونچ کر سارے لوگ مجبور ہو جاتے ہیں اسی طرح لفظ ملکوت یہ ملک جس کی جمع ملائکہ ہے اس سے لیا گیا ہے اور ملکوت اس مقام کو کہتے ہیں جہاں پر ملائکہ کا ازدہام رہتا ہے۔ اس قسم کے الفاظ تو عربی کے ہیں مگر صوفیا حضرات نے ان میں تصرف کر کے ان کو اسماء افعال بنالیا اور ایک نئی چیز پیدا کر دی۔

مجلسِ ۲۸ ۸؍ اکتوبر ۱۹۷۷ء

دیدار خداوندی اور گنہگاروں کی مغفرت پر ایک خاص بیان

سوال ۱: اہل اللہ کے نزدیک سب سے بڑی نعمت دیدارِ خداوندی ہے مگر حق تعالیٰ اپنے کلام پاک میں اکثر جگہ اعمال صالحہ پر جو ثمرات مرتب فرماتے ہیں وہ جنت اور جنت کی نعمتیں ہوتی ہیں اپنے دیدار کا تذکرہ بہت کم فرماتے ہیں حالانکہ اصل نعمت یہی ہے اس کی وجہ کیا ہے؟

سوال: بعض حضرات بار بار گناہ کرتے ہیں اور توبہ بھی کرتے رہتے ہیں۔ ایسے حضرات کی توبہ کی حیثیت شریعت میں کیا ہے؟

حضرت حکیم الاسلامؒ نے فرمایا کہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے قرآن کریم پڑھا ہی نہیں۔ کفار کے بارے میں قرآن شریف میں فرمایا گیا کَلَّآ اِنَّھُمْ عَنْ رَّبِّھِمْ یَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ۝ ترجمہ۔ ہرگز نہیں، بے شک وہ لوگ اس دن اپنے رب سے چھپائے جائیں گے۔ جب کفر کی سزا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا دیدار ان کو نہ ہوگا تو ایمان کا ثمرہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا دیدار ہو۔

دوسری جگہ فرمایا گیا وُجُوْہٌ یَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَۃٌ اِلٰی رَبِّھَا نَاظِرَۃٌ ۔ اس دن بہت سے چہرے اپنے پروردگار کو دیکھیں گے تو قرآن شریف میں دیدار کی بنیاد قائم کر کے بشارت سنا دی گئی اور احادیث میں اس کی توضیح اور تشریح فرما دی گئی جیسا کہ حدیث شریف میں ہے ایک مرتبہ صحابہ کو اشکال ہوا کہ جب وہاں پر لاکھوں کا مجمع ہوگا تو حق تعالیٰ کا دیدار کیسے ہوگا

اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا تم لوگ شمس و قمر کو نہیں دیکھتے ایک کے دیکھنے میں دوسرا کوئی حارج ہوتا ہے۔ اسی طرح حق تعالیٰ کو دیکھو گے دوسرا کوئی حارج نہ ہوگا چاند و سورج تو محدود ہیں جب ان کے دیکھنے میں دوسرا حارج نہیں ہوتا تو حق تعالیٰ تو محیط الکل ہے ان کے دیکھنے میں دوسرا کیسے حارج ہوسکتا ہے۔

دیدارِ خداوندی کا میدان

حدیث شریف میں ہے کہ دربارِ خداوندی منعقد ہوگا وہ ساری جنتوں سے بالاتر ہوگا۔

آپ نے فرمایا کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے فرمایا کہ عرش اعظم کے نیچے ایک میدان ہے وہ بالکل سفید ہے۔ وہ میدان اتنا بڑا ہے کہ اگر کوئی آدمی برس ہا برس سفر کرتا رہے تو وہ ختم نہ ہوگا۔ اس میدان کے بیچ میں کرسی بچھائی جائے گی۔ حق تعالیٰ نے اس کرسی کے بارے میں خود ہی ارشاد فرمایا ہے۔ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ط وہ کرسی آسمان و زمین سے بھی بڑی ہے اس کے سامنے ساتوں آسمان ایسے ہیں جیسے ایک بہت بڑے میدان میں کوئی چھلہ پڑا ہوا ہو اس سے اس کرسی کی عظمت اور بڑائی معلوم ہوتی ہے۔ اس کرسی کے اردگرد انبیا علیہم السلام کے ممبر ہوں گے اور وہ نور کے ہوں گے اور ہر نبی کے پیچھے حسب مراتب ان کی امت کی کرسیاں ہوں گی پورا میدان کرسیوں سے بھر جائے گا۔ جب میدان بھر جائے گا اور سارے درباری جمع ہو جائیں گے تو اس کرسی پر تجلیات ربانی کا نزول شروع ہوگا وہ کرسی اس طرح چرچرائے گی معلوم ہوگا کہ اب ٹوٹ کر گر پڑے گی حق تعالیٰ سبحانہٗ تو جسم سے پاک ہیں اس

لیے کرسی پر لو جو بوجھ ہو گا وہ عظمتِ خداوندی کا بوجھ ہو گا۔ اس وقت لوگ یہ سمجھ جائیں گے کہ اب حق تعالیٰ شانہٗ ہم میں موجود ہیں اس وقت حق تعالیٰ ملائکہ سے فرمائیں گے کہ ان کو شراب طہور تقسیم کرو جیسا کہ حق تعالیٰ نے قرآن شریف میں فرمایا ہے کہ وَسَقٰهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا ط ان کو ان کا رب شراب طہور پلائے گا وہ شراب طہور دنیا کی شرابوں کی طرح نہیں ہو گی کہ جس سے عقل ماری جائے بلکہ اُس شراب طہور کے پینے سے معرفت بڑھے گی اور کمالات میں اضافہ ہو گا اور پینے والے اعلیٰ مقام پر پہونچ جائیں گے اس وقت حق تعالیٰ داؤد علیہ السلام کو فرمائیں گے کہ جس طرح تم دنیا میں میری حمد و ثنا میں مناجاتیں کرتے تھے وہ پڑھو لحن داؤدی مشہور ہے دنیا میں یہ آپ کا معجزہ تھا لوگوں پر بے خودی طاری ہو جاتی تھی جب خدا کے حکم سے سارے انبیا علیہم السلام کے مجمع میں خدا کے سامنے داؤد علیہم السلام تلاوت فرمائیں گے تو لوگوں کی عجیب کیفیت ہو گی اور اعلیٰ مقام کی روحانیت حاصل ہو جائے گی اور معرفت بڑھ جائے گی اس وقت حق تعالیٰ فرمائیں گے سَلُوْنِیْ جس کا جو جی چاہے وہ مجھ سے مانگ لے۔

زیارتِ خداوندی کے وقت بھی علما کی ضرورت

خدا کی طرف سے بار بار مطالبہ ہو گا سَلُوْنِیْ ۔ مجھ سے مانگو سب لوگ حیران ہوں گے کہ ہم مانگیں تو کیا مانگیں ہم کو کون سی نعمت نہیں ملی جنت میں وہ نعمتیں حاصل ہوں گی جو حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آسکتا جب کسی کے سمجھ میں نہیں آئے گا تو علما کی طرف رجوع کریں گے کہ ہم کیا مانگیں۔ وہاں پر بھی علماء کی ضرورت پڑے گی دنیا میں تو پیچھا چھڑا کر بھاگتے ہیں تو جس طرح دین کے بارے

میں دنیا میں علما کی ضرورت پڑتی ہے اسی طرح زیارتِ خُداوندی کے وقت بھی علما کی ضرورت پڑے گی اس وقت سارے علما حضرات مل کر یہی فرمائینگے کہ ہم کو ساری نعمتیں مل چکی ہیں صرف ایک نعمت نہیں ملی وہ مانگو اور وہ دیدار خداوندی ہے وہ سب سے بڑی نعمت ہے پھر سب لوگ ایک زبان ہوکر یہی سوال کریں گے کہ اے اللہ تعالیٰ ہم کو ساری نعمتیں مل چکی ہیں صرف ایک نعمت رہ گئی ہے وہ آپ کی دیدار ہے ہم کو اپنا دیدار کرا دیجئے۔ اصل یہ ہے دنیا میں جن لوگوں نے عبادتیں کی ہیں وہ اسی تمنا میں کہ عبد اور معبود آمنے سامنے ہوں۔ دنیا میں تو ہم اللہ تعالیٰ کو عقیدت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں عیاناً نہیں دیکھتے مگر وہاں پر عیاناً دیکھیں گے جس کی تمنا میں ساری عمریں گزاری ہیں وہ دیدار خداوندی ہے پھر ان کی درخواست منظور ہو جائے گی۔

حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ ہر چیز اپنی اپنی جگہ پر ٹھہری رہے اگر یہ نہ فرماتے تو ان کی ذات کی پاکیزگی ہر چیز کو جلا کر خاک کر دیتی۔ حق تعالیٰ کے انوار و برکات کو کون تحمل کر سکتا ہے اس لیے پہلے ہی فرما دیں گے کہ ہر چیز اپنی جگہ پر ٹھہری رہے اس کے بعد حجابات اٹھنے شروع ہو جائیں گے سارے حجابات اٹھ جائیں گے صرف عظمت و کبریائی کے حجابات رہ جائیں گے اور وہ لامحدود ہیں انسان ان کا احاطہ کبھی نہیں کر سکتا۔

س وقت سارے حضرات اپنے رب کو عیاناً دیکھیں گے اور اس طرح دیکھیں گے کہ نہ کوئی جہت ہے نہ آمنا سامنا ہے اور سب دیکھ رہے ہیں اس کے بعد دربار برخواست ہوگا اور حکم ہوگا کہ سب لوگ اپنی اپنی جنت میں چلے جائیں۔ سب لوگ اپنی اپنی سواریوں سے روانہ ہو جائیں گے وہ سواریاں اتنی تیز رفتار ہوں گی کہ پل بھر میں لاکھوں میل کا سفر طے کر لیں گی

جب وہ حضرات اپنی اپنی جنتوں میں پہونچ جائیں گے تو ان کی ازداج اور حوریں ان کو دیکھ کر کہیں گی کہ آج آپ کے اندر ایسا حسن وجمال ہے کہ ہم نے اس سے پہلے نہیں دیکھی تو وہ کہیں گے کہ آج ہم حق تعالیٰ کی زیارت کر کے آئے ہیں اس کے بعد یہ لوگ خود ان سے کہیں گے کہ آج تو تمہارا بھی حسن وجمال بہت بڑھا ہوا ہے اس کی وجہ کیا ہے وہ کہیں گی کہ ہم نے تو پہلے ہی سے اپنے پروردگار کی زیارت کرلی ہے تو قرآن شریف نے زیارت کی بنیاد قائم کردی اور حدیث شریف میں اس کی تشریح اور توضیح بیان کردی گئی۔ رہا یہ سوال کہ اکثر جگہ اعمال صالحہ پر دیدار کے بجائے جنت کو ثمرہ بتایا گیا ہے مثلاً اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوْا الصَّالِحَاتِ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ اس کی وجہ یہ ہے کہ دیدار خداوندی ساری نعمتوں سے بالاتر ہے اس لیے عام نعمتوں میں اس کو شامل نہیں فرمایا۔ اگر عام نعمتوں میں اس کو بھی شامل فرماتے تو اس کی توہین ہو جاتی اس لیے اعمال صالحہ کا ثمرہ جنت کو مستقل بیان فرما دیا گیا اور دیدار خداوندی کو اعمال کا ثمرہ مستقل نہیں بیان فرمایا۔ دیدار خداوندی اتنی بڑی نعمت ہے کہ جنت کی ساری نعمتیں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتیں ہیں یہ اتنی بڑی نعمت ہے کہ کفار کو دھمکی دی گئی کہ اگر تم کفر کرو گے تو ہم تم سے پردہ کریں گے اور دیدار نہیں کرائیں گے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار کی سب سے بڑی نعمت چھن جائے گی اگر یہ بڑی نعمت نہ ہوتی تو چھینی نہ جاتی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے حق تعالیٰ کا سوال

حضرت موسیٰ علیہ السلام سے حق تعالیٰ نے سوال کیا کہ اے موسیٰ میرے لیے بھی تم نے

کوئی کام کیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا صَلَّیْتُ وَصُمْتُ وَذَکَرْتُ.. ہم نے آپ کے لیے نماز پڑھی اور روزہ رکھا اور آپ کا ذکر کیا اس پر حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اے موسیٰ یہ سارے کام آپ نے یقیناً کیا ہے اس پر آپ کو ثواب ملے گا مگر یہ تو آپ نے اپنے لیے کیا ہے سوال یہ ہے کہ آپ نے ہمارے لیے کیا کیا؟ اس پر موسیٰ علیہ السلام حیران ہو گئے اور عرض کیا کہ اے اللہ میں کیا کروں تو حق تعالیٰ شانہ، نے فرمایا کہ ہمارے لیئے اصل کام حُبّ باللہ اور بغض باللہ ہے یعنی محبت خداوندی میں غرق ہو کر جو کام کیا جائے وہ کام ہے کسی نے جنت کی طمع میں کوئی کام کیا تو اپنی خواہشات کو پورا کیا گویا جنت کی نعمتیں بھی بہت بڑی ہیں مگر سب سے بڑی نعمت رضائے حق ہے اور حق تعالیٰ کی مرضی میں فانی ہو جانا ہے جیسا کہ حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے مَنْ اَحَبَّ لِلّٰہِ وَاَبْغَضَ لِلّٰہِ وَمَنَعَ لِلّٰہِ وَاَمَرَ لِلّٰہِ وَاَعْطٰی لِلّٰہِ فَقَدِ اسْتَکْمَلَ الْاِیْمَانَ...... یعنی جس نے محبت کیا اللہ کے لیے اور غصہ کیا اللہ کے لیے اور منع کیا اللہ کے لیے اور دیا اللہ کے لیے تو اس نے ایمان کو کامل کر لیا اس سے معلوم ہوا کہ جتنے ثمرات مرتب ہوں گے وہ اعمال ہی پر مرتب ہوں گے لیکن دیگر اعمال سے جو چیز بالاتر ہے وہ اللہ تعالیٰ کی محبت میں فانی ہو جانا ہے اور انھیں کے لیے ہر کام کرنا ہے اس لیے اس خاص عمل پر جو ثمرہ مرتب ہو گا وہ ساری نعمتوں سے بالاتر ہو گا۔

سوال ٢: بعض حضرات بار بار گناہ کرتے رہتے ہیں اور توبہ بھی کرتے رہتے ہیں ایسے حضرات کی توبہ کی حیثیت شریعت میں کیا ہے گناہ کرنے سے نور ایمان کا سلب ہو جانا اور قلب پر سیاہ دھبہ لگنا کیا ایسے ہی گنہگاروں کے لیے ہے؟

حضرت حکیم الاسلامؒ نے فرمایا کہ توبہ خود مستقل عبادت ہے توبہ کے اندر اللہ تعالیٰ نے بہت بڑی طاقت رکھی ہے اگر کوئی ستر برس سے کفر میں مبتلا رہے لیکن اس کے بعد توبہ کرلے تو ستر برس کا کیا ہوا کفر بالکل ختم ہو جائے گا اور وہ ایسا پاک صاف ہو جائے گا جیسا کہ کفر کیا ہی نہیں تھا۔ مومنین کے بارے میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں تُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَا الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ٥ ....اے مومنین سب کے سب مل کر اللہ تعالیٰ کی طرف توبہ کرو تاکہ کامیاب ہو جاؤ تو توبہ کو کامیابی کا دارومدار بتلایا گیا سارے معاصی توبہ کرنے سے معاف ہو جاتے ہیں مگر حقوق العباد توبہ سے معاف نہیں ہوں گے جب تک کہ صاحبِ حق خود معاف نہ کردے البتہ جن لوگوں کے اندر نیکی کا غلبہ ہے اور حقوق کی ادائگی کی کوشش بھی کر رہے ہیں مگر ادائگی سے پہلے انتقال ہو گیا ان کے بارے میں حق تعالیٰ چاہتے ہیں کہ فلاح ابدی پائے تو حقوق مانگنے والوں سے فرمائیں گے کہ اوپر دیکھو جب وہ لوگ اوپر دیکھیں گے تو بہت بڑا عظیم الشان محل نظر آئے گا جس کی وسعت کی انتہا نہ ہو گی تو خود ہی حق تعالیٰ فرمائیں کہ جو لوگ اپنے حقوق معاف فرمادیں گے ان کو یہ محل دیدیا جائے گا تو سب لوگ کہیں گے کہ ہم نے اپنے حقوق معاف کر دیا۔ یہ عدل خداوندی ہے کہ بندوں کے حقوق خود معاف نہیں فرمائیں گے صرف ان کی سفارش کر دیں گے اور ترکیب ایسی کریں گے کہ لوگ معاف کرنے پر مجبور ہو جائیں گے تو سچی توبہ سے حقوق العباد کے علاوہ سارے گناہیں معاف ہو جاتے ہیں۔

معصیت کا سیاہ دھبہ

جب آدمی گناہ کرتا ہے تو قلب پر سیاہ دھبہ لگ جاتا ہے یہ دھبہ ظلمت کا ہوتا ہے

سیاہی کا نہیں ہوتا اور وہ ظلمت کفر کی ہوتی ہے جیسے نیکی ایمان کا نور ہوتی ہے اس کی بنا یہ ہے کہ جتنے بھی اعمال صالحہ ہیں خواہ وہ کروڑوں ہوں سب ایمان کے تحت ہوتے ہیں جس کا لقب شریعت میں بِرّ ہے بِرّ کے تحت لاکھوں نیکیاں ہیں اس کے مقابلے میں کفر ہے جتنے گناہ ہیں سب اس کے ماتحت ہیں تو جتنی معاصی اور گناہ ہیں سب ظلمتیں ہیں اور کفر کے حصے ہیں۔ تو بِرّ ایک نور ہے اسی طرح گناہ ایک ظلمت ہے جب آدمی گناہ کرتا ہے تو ظلمت کا دھبہ قلب پر لگ جاتا ہے جس طرح گناہ بڑھتا رہے گا اسی طرح وہ سیاہ دھبہ بھی بڑھتا رہے گا اور اگر اس نے توبہ نہ کی تو وہ ظلماتی دھبہ بڑھتے بڑھتے قلب پر محیط ہو جائے گا اور اگر پھر توبہ نہ کی اور گناہ کرتا رہا تو آخر بات یہ ہے کہ توبہ کی توفیق سلب ہو جائے گی اس کو قرآن نے طبع اور رین اور زیغ و ختم سے تعبیر کیا ہے اور فرمایا۱ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ ۲ كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ ۳ فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ۴ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ یعنی ان کے کفر کی وجہ سے اللہ تعالیٰ مہر لگا دے گا۔

اگر گناہ کرنے کے بعد بندے نے توبہ کر لی تو گناہ معاف ہو جائے گا اور توفیق آ جائے گی لیکن گناہ کرنے سے نہیں مانتا اور نہ توبہ ہی کرتا ہے تو پھر توفیق سلب کر لی جاتی ہے اور قلب پر مہر لگا دی جاتی ہے تو ہر مومن اور منافق کیلئے بقدر گناہ دھبہ بڑھتا ہے ایک شخص گناہ میں مبتلا ہے تو جس قدر گناہ کرے گا وہ سیاہ دھبہ بڑھتا رہے گا اور نور ایمان خفیف ہوتا جائے گا اور گناہ کے نئے راستے کھلتے رہیں گے۔

صوفیا کی اصطلاح میں سلب ایمان کے درجات

صوفیاء کرام نے اس کے چھ درجات قائم کئے ہیں (۱) پہلا درجہ سلب مزید کا ہے یعنی جب بندہ گناہ کرتا ہے تو سب سے پہلا مرتبہ سلب مزید کا آتا ہے یعنی ایمان کی نورانیت اور کیفیت گھٹ جاتی ہے۔ (۲) دوسرا درجہ سلب قدیم کا یعنی اس کے بعد جب بندے نے پھر گناہ کی اور توبہ نہیں کیا تو دوسرا مرتبہ آتا ہے اس کو سلب قدیم کہتے ہیں ایمان کے اندر خلل آنا شروع ہو جاتا ہے۔

۳ تیسرا درجہ حجاب کا ہے یعنی اس کے بعد پھر گناہ کرتا رہا تو تیسرا درجہ حجاب کا آتا ہے اللہ اور بندے کے درمیان ایک حجاب حائل ہو جاتا ہے یہ تفاصل کا چوتھا درجہ ہے یعنی اس کے بعد پھر بھی بندہ گناہ کرتا رہا اور توبہ نہ کیا تو چوتھا درجہ تفاصل کا آتا ہے اللہ اور بندے کے درمیان فصل قائم ہو جاتا ہے اور گناہ کی کوئی پرواہ نہیں کرتا۔

۵ پانچواں درجہ تسلی کا آتا ہے یعنی اس کے بعد پھر بھی گناہ کرتا رہا تو تو پانچواں درجہ تسلی کا آتا ہے بندے کو قناعت ہو جاتی ہے اور سوچتا ہے کہ گناہ ہی کرتے رہو اس درجہ پر جب بندہ پہنچ جاتا ہے تو توبہ کی توفیق سلب ہو جاتی ہے۔

۶ چھٹا درجہ عداوت کا ہے یعنی اس کے بعد پھر بھی گناہ کرتا رہا تو چھٹا درجہ عداوت کا آتا ہے جب آدمی اس درجہ پر پہنچ جاتا ہے تو حق تعالیٰ سے عداوت پیدا ہو جاتی ہے جب اس کے سامنے کوئی کلمۂ حق آتا ہے تو اس سے نفرت کا اظہار کرتا ہے یہ بالکل آخر درجہ ہے جب آدمی اس درجہ

پر پہنچ جاتا ہے تو ایمان بالکل سلب کر لیا جاتا ہے اور توبہ کی توفیق نہیں ہوتی تو عداوت سے پہلے توبہ کا موقع رہتا ہے۔ عیاذاً باللہ اگر عداوت پیدا ہو گئی تو پھر طبع اور ختم وغیرہ کا مرتبہ آتا ہے اصل یہی ہے کہ توبہ کرنے کی توفیق ہو جائے تو کامیابی ہے۔

حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ مَآ اَصَرَّ مَنِ اسْتَغْفَرَ جس نے گناہ کرنے کے بعد اصرار نہیں کیا بلکہ توبہ کر لیا تو اس کو گناہ نہیں سمجھا جائے گا۔
بہرحال معصوم تو انبیاء علیہم السلام ہیں آدمی سے گناہ ہو جاتا ہے یہ بشر ہے اس لیے جب گناہ سرزد ہو جائے تو حکم یہ ہے کہ فوراً توبہ کرے بغیر توبہ کے نہ چھوڑے اور توبہ میں گنجائش دی گئی ہے اگر زبان سے بھی نہ کرے تو کم سے کم نادم ہی ہو جائے اور ندامت بھی ایک قسم کی توبہ ہے
ندامت بھی توبہ ہے کبائر گناہ کے لیے تو توبہ شرط ہے۔ رہا صغائر گناہ ان کے بارے میں فرمایا گیا اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ ... یعنی نیکیاں برائیوں کو خود ہی مٹا دیتی ہیں تو شریعت نے بڑی وسعت دی ہے کہ آدمی نیکیاں کرتا رہے ان سے چھوٹے چھوٹے گناہ خود ہی صاف ہو جائیں گے اور اگر کبھی گناہ ہو جاتے تو توبہ کر لے تو جس طرح گناہ کے درجات ہیں اسی طرح نیکیوں کے بھی درجات ہیں جس طرح گناہ کرنے سے آدمی درجہ بدرجہ گرتا ہے اسی طرح نیکی کرنے سے درجہ بدرجہ اوپر چڑھتا ہے۔

تقویٰ کے درجات

ایک صاحب نے سوال کیا کہ حضرت یہ جو هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ؕ فرمایا گیا ہے کیا ہدایت صرف متقیوں کے لیے خاص ہے؟

حضرت حکیم الاسلامؒ نے فرمایا کہ اس کے بھی درجات ہیں۔ تقویٰ کا

ابتدائی درجہ شرک سے بچ جانا ہے یہ ہرکس وناکس کے لیے لازم ہے۔ جب ایک شخص اس سے بچ گیا تو اس کے بعد کا تقویٰ یہ ہے کہ کبائر گناہ سے بچے جب متقی کبائر گناہ سے بچ گیا تو تیسرا درجہ یہ ہے کہ صغائر گناہ سے بھی بچے جب گناہ صغائر سے بچ گیا تو اس کے بعد کا تقویٰ یہ ہے کہ لایعنی اور فضولیات سے پرہیز کرے اور ان سے بچا رہے۔

دین اسلام آسان کیوں ہے

ایک صاحب نے سوال کیا کہ یہ جو فرمایا گیا ہے اَلدِّیْنُ یُسْرٌ یعنی دین آسان ہے حالانکہ دین آسان نہیں ہے دین کی بعض باتیں سمجھ میں نہیں آتی ہیں پھر اَلدِّیْنُ یُسْرٌ کا کیا مطلب ہے۔

حضرت حکیم الاسلام نے فرمایا کہ بعض کا لفظ ہی بتا رہا ہے کہ کون سا قانون ہے کہ اس کا کوئی مسئلہ مشکل نہ ہو بلکہ اس کے مجموعہ کو دیکھا جاتا ہے پھر بھی اگر کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو کم فہمی ہے۔ سائل نے پھر سوال کیا کہ دین اسلام کس اعتبار سے آسان ہے۔

حضرت نے فرمایا کہ دین اسلام میں آسانی کی پہلی بات تو یہ ہے کہ مختلف مذاہب اور ادیان میں جو انسان کے تحمل سے باہر بھاری بھاری قیدیں ہیں جن کو قرآن شریف میں سلاسل اغلال سے تعبیر کیا گیا ہے اسلام نے اس کو ہٹا دیا۔ مثلاً رہبانیت ہے اسلام نے اس کو ختم کر دیا بعض مذاہب میں یہ بھی تھا کہ نکاح مت کرو تبھی خدا تک رسائی ہوگی نکاح ہوتے ہوئے رسائی ممکن نہیں لیکن اسلام نے اسے سنت قرار دیا اور نکاح کی تاکید کر دی بعض مذاہب میں یہ تھا کہ مال و دولت رکھنا حرام ہے بس ضرورت پوری کر کے بقیہ غریبوں میں تقسیم کر دو اگر کوئی نہ ملے تو سمندر میں ڈال دو مگر

اسلام نے مال رکھنا جائز کر دیا اور رکھنے اور استعمال کرنے کی اجازت دیدی اسی طرح بعض مذاہب میں لڑائی اور جہاد کے بعد جو مالِ غنیمت ہاتھ آتا تھا ان کے لیے حرام تھا مگر اسلام نے مال غنیمت کو جائز کر دیا یہ آسانی مالیات کے اعتبار سے اسلام نے کر دی لیکن عبادات میں بھی آسانی کر دی مثلاً نماز ہے اس کو پانچ وقت میں رکھا گیا ہے اس میں آپ کو کیا اشکال ہے اس لیے کہ زمانے کے دو حصے ہیں ایک رات اور ایک دن تو دن کے اوّل حصّے میں ایک عبادت رکھدی یعنی نماز فجر تو اس کا حصہ زیادہ تر زوال تک ہوتا ہے بقیہ وقت میں آدمی فارغ رہتا ہے۔ یعنی نماز فجر کے بعد سے زوال تک کوئی نماز فرض نہیں ہے پھر زوال کے بعد دوسری نماز یعنی نماز ظہر فرض کر دی گئی اس کے بعد عصر تک چھوڑ دیا گیا تاکہ آدمی اپنا کام کر لے پھر عصر کی نماز فرض کر دی گئی اور دو گھنٹے کی مہلت دیدی گئی پھر مغرب کی نماز رکھی گئی مغرب پڑھنے کے بعد پھر مہلت دیدی گئی تاکہ آدمی اپنا کام کر لے اور کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر نماز عشاء پڑھے۔ آرام کرے تو رات کا پورا حصہ آرام کرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا اور دنیادی کام کو روکا نہیں گیا تو اس سے زیادہ آسانی کیا ہو سکتی ہے پھر نماز کے اندر بھی آسانی کر دی مثلاً نماز کا مقدمہ وضو ہے اس میں بھی آسانی کر دی گئی اگر وضو کرنا باعثِ نقصان ہو یا پانی ہی نہ ملے تو اس کا بدل تیمم رکھدیا گیا پھر نماز کے اندر آسانی یہ کر دی کہ اگر کھڑے ہو کر نماز نہ پڑھ سکو تو بیٹھ کر پڑھ لو اگر اتنی طاقت بھی نہیں ہے تو لیٹ کر پڑھ لو ورنہ پھر اشارے سے پڑھو تو یہ ساری آسانیاں ہی آسانیاں ہیں اس میں مشکل کیا ہے حج بیت اللہ یہ کچھ یہ کچھ مشکل عبادت تھی تو اس کو عمر بھر میں صرف ایک ہی مرتبہ

فرض کیا گیا پھر حج کے اندر بھی آسانی کردی گئی اور قید لگادی گئی کہ استطاعت ہو اہل و عیال کے نفقات سے فارغ ہو اگر حج کی شرائط نہ پائی جائیں، تو پھر حج فرض نہ ہوگا اسی طرح معاملات میں آسانی کردی اور اس کو دیانت پر مبنی کیا چالاکی پر نہیں کیا دیانت داری اور صفائی سے معاملہ کرنا یہ ضمیر کی چیز ہے وہ کون سا اشکال ہے کہ جس کی وجہ سے کہا جائے کہ دین مشکل ہے اگر دیگر ادیان کے مقابلے میں دیکھو تو اسلام کے اندر آسانی ہی آسانی نظر آئے گی اسی طرح جزوی مسائل میں مثلاً غلامی کا مسئلہ ہے دیگر مذاہب میں غلام کی ملکیت کے یہ معنے تھے کہ آقا جس طرح چاہے اس میں تصرف کرے خواہ اس کو قتل کردے یا سخت سزا دے آقا شکنجے بنوالیتا تھا اگر ناراض ہوتا تو اس سے کس دیتا تھا جس کی وجہ سے اِدھر کی پسلیاں اُدھر ہو جاتی تھیں اسی طرح آقا تالاب کھدوالیتا تھا اور اس میں سانپ ومینڈھک وغیرہ جانور چھوڑ دیتے جب آقا غلام سے ناراض ہوتا تو اس تالاب میں ڈھکیل دیتا غلام کو سانپ وغیرہ لپٹ جاتے وہ چلاتا اور آقا باہر کھڑا ہو کر قہقہا لگاتا۔ اسلام نے ان ساری سختیوں کو ختم کردی۔ اسی طرح عورت کے بارے میں دوسرے مذاہب والوں کا یہ رجحان تھا کہ یہ ایک نجس العین چیز ہے اور ساری گناہوں کی جڑ ہے اس لیے اس کے ساتھ انتہائی ناانصافی کرتے تھے وہ شوہر کی مملوکہ سمجھی جاتی تھی چاہے شوہر اپنی عورت کو قتل کردے یا بڑی سے بڑی سزا دیدے مگر اسلام نے ان چیزوں کو ختم کر کے عورتوں کے حقوق بھی قائم کردیا اگر حقیقی طور پر اسلام کے احکامات پر غور کیا جائے تو آسانی ہی آسانی نظر آئے گی تو آخر اسلام کی وہ کون سی بات ہے جو مشکل ہے اور آپ کے سمجھ میں نہیں آتی

تقدیر پر ایمان لانا فرض ہے اس کا سمجھنا فرض نہیں

سائل نے کہا کہ مثلاً تقدیر کا مسئلہ ہے یہ سمجھ میں نہیں آتا۔

حضرت نے فرمایا کہ ۔ اچھا یہ ہے ۔ دیکھو اطباء سورج کو ٹکٹکی لگا کر دیکھنے سے روکتے ہیں آخر سورج کو اس طرح دیکھنے کو کیوں منع کرتے ہیں کیا آپ کے اندر دیکھنے کی قوت نہیں بلکہ وہ اس لیے منع کرتے ہیں کہ اگر سورج کو ٹکٹکی لگا کر دیکھو گے تو آنکھ کی بینائی ختم ہو جائے گی کیونکہ تمہاری آنکھ میں آفتاب کو دیکھنے کی تحمل نہیں ہے ۔ اسی طرح بعض علوم اتنے دقیق ہوتے ہیں کہ ہر کس وناکس کی سمجھ میں نہیں آسکتے اس لیے ان میں پڑنے سے روکا جاتا ہے انھیں میں مسئلہ تقدیر ہے اگر اس میں پڑو گے تو ایمان کا خطرہ ہے بالاجمال تقدیر پر ایمان لانا فرض ہے مگر اس کی تفصیل معلوم کرنا شرعاً مطلوب نہیں ہے ۔

بالاجمال تقدیر کا مسئلہ عقلی ہے اسلام کے علاوہ کون سا مذہب ہے جو تقدیر پر بحث نہیں کرتا۔ تقدیر کے معنی ربط حادث بالقدیم کے ہیں یعنی مخلوق کو خالق کے ساتھ کیا ربط ہے دوسرے ادیان نے اس ربط کو بیان نہیں کیا یہ صرف اسلام کی خصوصیت ہے۔ اسلام نے اس ربط کو معقول کر کے دکھلایا مگر دوسروں نے دباؤ سے منوایا لہذا جب یہ مسئلہ مشکل ہے تو اس میں کیوں پڑتے ہو اس میں پڑنے سے اسلام نے ممانعت کر دی ہے لہذا یہ کہنا کہ تقدیر کا مسئلہ سمجھ اور عقل میں نہیں آتا ہم کہتے ہیں کہ تمہاری عقل ہی کتنی بڑی ہے جو یہ مسئلہ سمجھ سکے مثلاً ہزار آدمیوں میں نوسو پچاس تو نابینا ہیں اور پچاس بینا یعنی آنکھ والے ہیں اب اگر سارے نابینا کسی کے بارے میں اتفاق کرلیں کہ یہ چیز تو ہے ہی نہیں کیونکہ ہماری نظر میں نہیں آرہی ہے تو کیا ان کا

یہ کہنا صحیح ہوگا ہر گز نہیں بلکہ یہی کہا جائے گا کہ پہلے اپنی اپنی نظروں کا علاج کر لو خرابی تو اپنے اندر ہو اور اس کو ڈال دیں سائل پر یہ کون سی انصاف کی بات ہے۔

تقدیر کا مسئلہ عقلی ہے

سائل کو تو اس طرح سوال کرنا چاہیئے کہ اگر تقدیر کا مسئلہ عقلی ہے تو وہ کس درجے تک عقلی ہے کیونکہ عقلی مسئلہ تو ہم بھی سمجھ سکتے ہیں تو پھر سائل کو سمجھایا جائے گا کہ جب آپ خالق سے رابطہ قائم کریں گے تو اس رابطے کو سمجھنے کی کوشش کریں گے اس کے سمجھنے کی ایک صورت تو یہ ہے کہ جس کو فلاسفہ نے سمجھا ہے کہ حق تعالیٰ مخلوق کو پیدا کر کے فارغ ہو گئے اب آپ مختارِ کل ہیں اب ان کا کوئی واسطہ نہیں رہا اور نہ ان کے اندر یہ قدرت ہے کہ آپ کے افعال میں تصرف کر سکیں آپ خود ہی اپنے افعال کے خالق ہیں اگر آپ نے ایسا ہی سمجھا تو حق تعالیٰ کی ذات میں ایسا نقص مانا کہ جس سے توحید باقی نہیں رہتی اور اگر آپ نے یوں سمجھا کہ سب کچھ اللہ تعالیٰ ہی کے اختیار میں ہے بندے کو تو کسی قسم کا اختیار اللہ تعالیٰ نے دیا ہی نہیں تو اس سے عدل خداوندی میں تہمت لازم آئے گی اور ذات حق پر اعتراض ہوگا کہ جب بندہ مجبور ہے اور اس کو کوئی اختیار ہی نہیں ہے تو گناہ پر سزا دینا یہ بندے کو مجبور کرنا ہے گناہ بھی وہی کرائیں اور سزا بھی دیں یہ کون سا عدل ہے تو اس عدلِ خداوندی میں تہمت لازم آئے گی اور وہ اس سے بری ہے تو اسلام سے ہٹ کر جس مذہب والے کی لائن اختیار کر کے جو بھی شکل بناؤ گے اس میں مشکلات پیدا ہوں گی اس لیے یہ کہا جائے گا کہ ہر مذہب والوں کی لائن الگ الگ ہے البتہ اسلام نے اس کے بارے میں یہی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بندے کو پیدا فرمایا اور اس کو

اختیار دیا لیکن وہ قدرت اور اختیار خود اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اس لیے یہ اس کی مخلوق ہے مگر جتنا اختیار دیا اس میں اس کا حق ہے اس لیے بندے کو جتنا اختیار اور قدرت اللہ تعالیٰ نے دی ہے اسی کے متعلق سوال ہوگا اور حکمِ خداوندی کو اپنے اختیار کے مطابق پورا نہ کرنے پر سزا ملے گی رہا خالق اور مخلوق کے درمیان جو دقیق روابط ہیں وہاں تک کوئی نہیں پہونچ سکتا اس لیے اس کا تعلق حقائق الٰہیہ سے ہے اور حقائق الٰہیہ کی کنہہ اور حقیقت تک رسائی محال ہے بندے اس قابل ہی نہیں ہیں کہ حقائق الٰہیہ کی کنہہ تک پہونچیں اور جب یہ محال ہے تو پھر اس کے سمجھنے کی بندے کو تکلیف بھی نہیں دی گئی تو حقائق الٰہیہ کو اتنا ہی سمجھو جو تمہاری سمجھ میں آسکے اس لیے اسلام میں تقدیر میں آسانی کر دی اور فرمایا گیا لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ یعنی کسی نفس کو وہ تکلیف نہیں دی گئی ہے جو اس کی وسعت اور طاقت سے باہر ہو نہ عقل میں نہ فعل میں نہ عمل میں لہٰذا تقدیر کا مسئلہ اگر دقیق ہے تو اس کے معلوم کرنے کی تکلیف ہی کہاں دی گئی کہ جس سے آدمی پریشان ہو جائے۔ بس خدا کی یکتائی مانو اس میں کیا اشکال ہے جو سمجھ میں نہیں آتا اس کو چھوڑ دو۔

مجلس ۲۹

تلاوت قرآن و تعلیم اور تزکیہ نفس و اسوۂ حسنہ پر حکیمانہ بیان

سوال:۔ حضور والا نے ایک مجلس میں تلاوت قرآن و تعلیم اور تزکیہ نفس اور اسوۂ حسنہ کے متعلق ایک سوال کے جواب میں تفصیل سے بیان فرمایا تھا مگر وہ مجلس قلم بند نہ ہو سکی تھی اس لیے حضور والا اگر اس کی دوبارہ تفصیل فرمادیں تو بہتر ہے

حضرت حکیم الاسلامؒ نے فرمایا کہ جتنے حروف مقطعات ہیں وہ ان کلمات میں سے ہیں کہ ان کے معانی اور مطالب کا کسی کو پتہ نہیں ہے حق تعالےٰ نے مثال میں ایسے کلمات کو انتخاب فرمایا کہ جس کے معنی امت کو معلوم نہیں مگر ان کے پڑھنے پر اجر و ثواب کا وعدہ ہے۔ اس سے صاف طور پر واضح ہو گیا کہ اجر و ثواب کا مرتب ہونا صرف معنی فہمی پر نہیں ہے بلکہ نفس تلاوت اور تلفظ پر بھی اجر و ثواب ہے معنی فہمی جداگانہ عبادت ہے اس لیے اس کا اجر بھی الگ ہے جس طرح قرآن کے مدلول سے مسائل نکلتے ہیں اسی طرح نفس الفاظ قرآن سے بھی مسائل پیدا ہوتے ہیں اس لیے اصولین نے نص کی چار قسمیں کردی ہیں (۱) عبارت النّص (۲) دلالت النّص (۳) اشارت النّص (۴) اقتضاء النّص۔

صرف قرآن ہی کلام الٰہی ہے

یہ صرف قرآن کی خصوصیت ہے کہ اس کے ایک ایک لفظ سے سینکڑوں معانی و مطالب اور حقائق پیدا ہوتے رہتے ہیں اگر یہ خدا کا کلام

نہ ہوتا تو اس کے اندر یہ جامعیت پیدا نہ ہوتی اس لیے حقیقی معنی میں اگر کلام الٰہی ہے تو وہ قرآن ہے جس سے تکلم واقع ہوا بخلاف توراۃ کے حق تعالیٰ نے اس کی تلاوت کر کے نہیں سنائی بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو الواح دیدیا اس میں سارے احکام لکھے ہوئے تھے اس لیے تورات کو کتاب خداوندی تو کہہ سکتے ہیں لیکن کلام خداوندی تو نہیں کہہ سکتے۔ کلام کے لیے تکلم شرط ہے اگر تورات کو کلام خداوندی کہیں گے تو طبعاً کہیں گے حقیقتاً نہیں کہہ سکتے۔

اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام کے قلب مبارک پر مضمون اتار دیا انھوں نے اپنے الفاظ میں اپنی امت کو سنا دیا خواہ وہ الفاظ بھی سرچشمہ غیبی ہی سے آئے ہوں مگر وہ الفاظ ان ہی کے تھے اس لیے انجیل کو مضمون خداوندی یا کتاب خداوندی تو کہہ سکتے ہیں مگر کلام خداوندی نہیں کہہ سکتے اگر کلام خداوندی کہیں گے تو ضمناً کہیں گے حقیقتاً نہیں کہیں گے انجیل کی مثال ایسی ہی ہے جیسے ہمارے یہاں حدیث کی ہے۔ حدیث وحی ہے اس کا مضمون اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر القا ہوا ہے مگر الفاظ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں تو حدیث کی نوعیت وہی ہے جو انجیل کی نوعیت ہے مگر قرآن شریف کی نوعیت بالکل جداگانہ ہے۔ کیونکہ اس کے الفاظ اور معانی سب مُنَزَّلْ مِّنَ اللہ ہیں تو تلاوت کی اس لیے ضرورت ہے کہ یہ کلام خداوندی ہے اور تکلم کی سند اللہ تعالیٰ تک پہنچی ہوئی ہے اس لیے تلاوت پر اجر و ثواب ہے۔

تعلیم اور تعلّم کے لیے استاذ کی ضرورت

اب رہ گئی اس کی تعلیم تو ظاہر بات ہے کہ الفاظ کے مقصود تو معانی ہی ہوتے ہیں الفاظ تو صرف ذریعہ بنتے

ہیں معانی تک پہونچنے کا لہذا جب کسی کلام کے الفاظ تک مقصود ہوتے ہیں تو ان کی معانی بدرجہ اولیٰ مقصود ہوں گے کیونکہ لفظوں کا مقصد ہی معانی ہیں اس لیے معانی اور مطالب حق اور مرادات ربانی بیان کرنا ہی تعلیم ہے اور ان مرادات ربانی کو سمجھنے کے لیے استاذ کی ضرورت پڑتی ہے ایک تو ہے لغوی معنی سمجھ جانا یہ تو بغیر استاذ کے بھی ہو سکتا ہے۔ لغت کی کتابوں سے الفاظ کے معنی سمجھے جا سکتے ہیں لیکن اس کا مفہوم کیا ہے یہ ضروری نہیں ہے کہ لغتاً جو مفہوم آپ سمجھیں وہی مراد خداوندی بھی ہو۔ مراد خداوندی اور چیز ہے اور لغوی مدلول اور چیز ہے کتنے الفاظ ایسے ہیں کہ قرآن عظیم نے لغت سے لیا ہے مگر معانی اپنے ڈالے ہیں جیسے صلوٰۃ ہے اس کے لغوی معنی دعا کے ہیں لیکن قرآن نے لفظ صلوٰۃ لے کر اپنے معنے ڈال کر اس کو افعال خاصہ کے لیے استعمال کیا اور فرمایا کہ صلوٰۃ صرف دعا ہی کے لیے نہیں آتا بلکہ نماز کے لیے بھی آتا ہے اسی طرح حج ہے اس کے معنی قصد کرنے کے آتے ہیں لیکن یہ مرادی معنی نہیں ہے۔ اگر صرف قصد کا نام حج ہے تو ہر آدمی قصد کر لیتا اور گھر بیٹھے حاجی بن جاتا بلکہ حج کے نیچے قرآن نے اپنے معنی ڈالے کہ حج افعال خاصہ کا نام ہے یعنی یہ سارے افعال ادا کرو گے تو پھر حاجی کہلاؤ گے اسی کا نام منقول لفظی یا منقول اصطلاحی ہے یا منقول لغوی یعنی لفظ تو لغت کے ہیں مگر اصطلاح قرآن کی ہے تو اصطلاح قرآن اور مراد ربانی کا نام تعلیم ہے مطلقاً لغوی مدلول بیان کر دینا یہ ادب کا موضوع تو ہو سکتا ہے مگر قرآن کا موضوع نہیں ہو سکتا کیونکہ قرآن کا موضوع یہ ہے کہ مرادات الٰہیہ بیان کیا جائے کہ اس لفظ کی یہ مراد ہے اور اس جملے کے معنی یہ ہیں اور بیان کرنے والا بھی محض اختراع سے نہیں سمجھ سکتا کہ جو ذہن میں آئے اور مراد سمجھ لے

بلکہ مراد تو وہ ہے کہ بیان کرنے والا خود کہے کہ اس جملے یا لفظ سے ہماری یہ مراد ہے اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جس طرح الفاظ قرآن منقول ہوئے ہیں اسی طرح اس کے معانی بھی منقول ہوئے ہیں تو درحقیقت حدیث قرآن کی تفسیر اولین ہے یہ حدیث ہی نے بتایا کہ اس آیت کا یہ مطلب ہے اور اس آیت کی یہ مراد ہے اس لیے اگر کوئی شخص حدیث سے کٹ کر محض ادب دانی کے زور پر کوئی مدلول نکال لے تو وہ مدلول لغوی تو ہو سکتا ہے مگر مراد ربانی نہیں ہو سکتی کیونکہ مراد ربانی خود متکلم ہی بیان کرے گا اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کلام کی بہت سی خصوصیات ہیں جو کاغذ میں نہیں آسکتی ہیں بلکہ لب و لہجے اور آواز سے سمجھی جاتی ہیں اور یہ کاغذ میں نہیں آسکتے اس لیے مراد بھی متعین نہیں ہو سکتی ہے میں مثال کے طور پر کہا کرتا ہوں کہ ہماری اردو زبان کا ایک حصہ ہے یعنی مرکبات ہے، اس کے کئی معنے آتے ہیں اور ہر معنے لب و لہجہ و آواز سے متعین ہوتے ہیں اگر میں کہوں کہ کیا بات ہے تو آپ سمجھیں گے کہ میں سوال کر رہا ہوں (نوٹ) حضرت حکیم الاسلام مدظلہ العالی نے 'کیا بات ہے' اس جملے کو چند انداز سے ادا فرمایا مگر ہم اس انداز ادا کو کاغذ میں نہیں سمجھا سکتے حضرت نے فرمایا کہ اس جملے سے متکلم کے انداز ہی سے معنے سمجھے جا سکتے ہیں کیونکہ اس سے کبھی سوال مقصد ہوتا ہے اور کبھی تحقیر مقصد ہوتا ہے اور کبھی اس جملے سے کسی کی کوئی شان بیان کرنا مقصد ہوتا ہے اور کبھی اظہار تعجب کے لیے استعمال کیا جاتا ہے مگر ہر مقصد متکلم کے انداز بیان و تکلم سے متعین کیا جا سکتا ہے اور وہ انداز لب و لہجہ کاغذ میں نہیں آسکتا۔ اگر آپ اس جملے کو لکھ کر کسی دوست کے پاس بھیج دیں تو کوئی ضروری نہیں ہے کہ وہ وہی سمجھے جو آپ کی مراد ہے بلکہ اس پر اس وقت جو کیفیت غالب ہوگی وہی سمجھے گا اس لیے متکلم کی مراد کو آپ اسی وقت

سمجھ سکتے ہیں جب کہ وہ خود تکلم کر کے بتلائے اس کے بعد آپ سمجھیں گے کہ اس سے اس کی مراد کیا ہے بقول کسی شاعر

گر مصور صورت آں دل ستاں خواہد کشید
لیک حیرانم کہ نازش راچسان خواہد کشید

یعنی کسی محبوب کا حلیہ آپ تصویر میں تولا سکتے ہیں مگر اس کی ناز و انداز اور ادائیں یہ کاغذ میں نہیں لا سکتے وہ تو تکلم اور دیکھنے ہی سے تعلق رکھتی ہیں اور حقیقت میں وہی محبت کی منشا ہوتی ہیں تصویر اور کاغذ محبت کی منشا نہیں ہوتیں۔ بہر حال قرآن شریف کا ایک مدلول لغوی ہے وہ تو لغت سے سمجھا جا سکتا ہے لیکن مراد حقیقی یعنی مراد ربانی وہ لفظوں سے نہیں سمجھ سکتے اس کے سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ خود متکلم بتائے۔ اس سے واضح ہو گیا کہ جتنی مرادات الٰہیہ ہیں ان کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ اللہ محض اپنی اختراع سے بیان نہیں فرمایا بلکہ حق تعالیٰ نے آپ پر جدا گانہ الہام فرمایا کہ اس جملے سے ہماری مراد یہ ہے اور اس سے ہمارا مطلب ہے۔

حفاظت قرآن کی ذمہ داری

ابتداء وحی میں آپ کی عادت شریف یہ تھی کہ جب وحی نازل ہوتی تو آپ جلدی جلدی رٹنا شروع کر دیتے تا کہ بھول نہ جائیں اس لیے حق تعالیٰ نے آپ کو جلدی جلدی رٹنے سے روک دیا اور فرمایا لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ط آپ زبان کو حرکت دیکر جلدی نہ کریں آپ تو اسی لیے جلدی جلدی رٹتے ہیں کہ بھول نہ جاؤں لہذا آپ کو وعدہ دے رہا ہوں اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ط آپ کی زبان سے پڑھوا دینا اور آپ کے سینے میں جمع کر دینا یہ ہمارے ذمہ ہے فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ط ہم جب

اس کی قرات کریں تو آپ سنتے رہیں اس سے زیادہ رٹنے کی کوشش نہ کریں تو حق تعالیٰ نے جمع اور قرات دونوں کا وعدہ فرمایا۔ قرآن کے معنی پڑھنے کے ہیں یعنی مقرون اور پڑھنے کا تعلق زبان سے ہے دل سے نہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ الفاظ کے پڑھوا دینے کی ذمہ داری ہمارے اوپر ہے وہی آیت پڑھوا کر آپ کے دل میں محفوظ کر دیں گے یہاں تک تو لفظوں کے بارے میں محفوظ کرانے کا وعدہ فرمایا اس کے بعد لفظوں کے معانی اور اس کی مرادات کے متعلق دوسرا جملہ ارشاد فرمایا ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَهٗ ط یعنی ان الفاظ کو بیان کر دینا ہمارے ہی ذمہ ہے۔ ظاہر ہے بیان کا تعلق لفظوں سے نہیں ہوتا بلکہ مضامین سے ہوتا ہے مطلب یہ ہے کہ اس کے معانی اور مطالب بھی ہم آپ کے اوپر القا کر دیں گے یہی وجہ ہے کہ بعض مرتبہ جب کوئی آیت نازل ہوتی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی مراد معلوم نہ ہوتی اور آپ سے پوچھا جاتا تو آپ فرما دیتے کہ ہم کو ابھی تک اس کی مراد کا پتہ نہیں جب آپ کے قلبِ مبارک پر اس کی مراد القا کی جاتی تو آپ فرماتے اَفْتَیْتُ رَبِّیْ فَاَفْتَانِیْ۔۔۔ میں نے اپنے رب سے پوچھا انھوں نے بتلا دیا اس آیت کی مراد یہ ہے تو مراد ربانی بیان کرنے میں بھی آپ ناقل اور امین ہیں آپ خود موجد او مخترع نہیں ہیں جس طرح آپ کا اختراع لفظوں میں نہیں ہے اسی طرح معانی اور مرادات ربانی کے بیان کرنے میں بھی نہیں ہے۔ آپ دونوں چیزوں میں ناقل اور امین ہیں لہٰذا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لفظوں اور معانی میں امین ہیں تو میری اور آپ کی حیثیت اور مجال کیا ہے کہ اپنے ذہن سے خود معانی اور مراد متعین کر دیں اور کہیں کہ اس جملے سے حق تعالیٰ کی یہ مراد ہے اسی طرح ہم لغت کی زور سے الفاظ بھی متعین نہیں کر سکتے کیونکہ قرآن کے الفاظ بھی متعین

ہیں تو جب ہم لفظوں میں کمی اور بیشی نہیں کر سکتے تو معانی میں کیسے کر سکتے ہیں کیونکہ اصل مقصود تو معانی ہی ہوا کرتے ہیں اس لیے جہاں تلاوت ضروری ہے تو تعلیم بھی ضروری ہے۔

تعلیم کے بعد تزکیہ نفس ضروری ہے

تعلیم اور مرادات کی تفصیل اس وقت تک معلوم نہیں ہو سکتی جب تک کہ دل کا رُخ صحیح نہ ہو اگر دل کا رُخ صحیح نہ ہو اور اس میں کجی اور زیغ بھرا ہوا ہو تو آدمی اس زیغ اور کجی ہی کے مطابق آیات کا مطلب سمجھے گا۔ ظاہر ہے کہ جب کوئی آنکھ میں سبز چشمہ لگائے گا تو جو چیز اس کے سامنے ہوگی خواہ وہ کتنی ہی سفید کیوں نہ ہو مگر وہ سبز ہی نظر آئے گی اسی طرح اگر دل پر زیغ اور کجی کا چشمہ چڑھا ہوا ہے تو آدمی اپنے اس زیغ اور کجی ہی کے مطابق معنے سمجھے گا خواہ وہ کتنے ہی سیدھے کیوں نہ ہوں اس لیے اس کی ضرورت تھی کہ دل کی کجی کو دور کر کے صاف کر دیا جائے اور صحیح رُخ کر کے حق تعالیٰ کے ساتھ وابستہ کر دیا جائے اور اُدھر سے جو القا ہو اس کو صحیح سمجھے اور کجی میں مبتلا نہ ہو اس کا نام قرآن میں تزکیہ ہے تو تعلیم کے ساتھ تزکیہ کی بھی ضرورت ہے بغیر اس کے قرآن کا صحیح مفہوم نہیں سمجھ سکتا۔

اُسوۂ حسنہ کے بغیر عمل مشکل ہے

اب تلاوت ختم ہو گئی اور تعلیم یعنی بیان مراد بھی ہو گیا اور تزکیہ بھی ہو گیا یعنی قلب سیدھا بھی ہو گیا مگر پھر بھی ایک بات کی ضرورت رہ گئی اس لیے کوئی بھی کلام ہو جس کو حق تعالیٰ فرمائیں کہ اس پر عمل کرو تو یہ طبعی بات ہے کہ جب تک عمل کا نمونہ سامنے نہ ہو اس وقت تک عمل کی صورت آپ نہیں بنا سکتے اور جب عمل کا نمونہ آپ کے سامنے ہو گا تو آپ اس کی نقل اتاریں گے

اور اگر عمل کا نمونہ سامنے نہ ہو تو عمل کی صورت بنانے میں آزاد ہوں گے مثلاً نماز کا مطلب ہم سمجھ گئے اور بالکل صحیح سمجھے لیکن جب پڑھنے کے لیے کھڑے ہوں گے تو تعدیل ارکان اور خشوع و خضوع کی صورت کیا ہے پھر کس طرح کھڑے ہوں اور کس طرح ہاتھ باندھیں اور کس طرح رکوع و سجود و قیام کریں یہ ساری چیزیں نمونے سے تعلق رکھتی ہیں بغیر نمونے کے ان کی ادائگی مشکل ہے اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض میں ایک فرض یہ بھی داخل کیا گیا کہ تعلیم حکمت بھی کریں اور اس سے مراد تعلیم اسوۂ حسنہ ہے۔ حکمت کی دو قسمیں ہیں ایک حکمت عملی اور ایک حکمت نظری اور بلاغت کا یہ قاعدہ ہے کہ اگر لفظ کے دو معنے ہوں اور اس لفظ کا ایک معنی پہلے متعین ہو جائے تو قدرتی طور پر بعد کا دوسرا معنی متعین ہوگا تو حکمت نظری یہ تو تعلیم میں آگئی یعنی تعلیم مرادات و معانی۔ اور جب حکمت نظری نکل چکی اور پھر حکمت کا لفظ جب آیا تو اس سے مراد حکمت عملی ہی ہوگی اور وہی اسوۂ حسنہ ہے یعنی طریق سنت۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف یہی نہیں فرمایا کہ صَلُّوا نماز پڑھو بلکہ فرمایا صَلُّوا كَمَا رَأَيْتُمُونِي أُصَلِّي۔۔۔۔ نماز اسی طرح پڑھو جس طرح مجھے پڑھتے دیکھ رہے ہو یعنی نماز پڑھنے میں میرا نمونہ اختیار کرو اس سے معلوم ہوا کہ ہر عمل کے لیے نمونے کی ضرورت ہے اس کے بغیر آدمی سمجھ نہیں سکتا کہ کس طرح کام کریں مثلاً روٹی پکانے کا ایک فن ہے آپ روٹی پکانے کی ساری ترکیبیں خوب سمجھ لیں لیکن پکانے والے کو نہ دیکھیں اس وقت تک روٹی پکانی نہیں آسکتی اسی طرح خیاطی کا ایک فن ہے آپ عقلی طور پر تو یہ سمجھ جائیں گے کہ اس طرح سوئی چلائی جائے اور اس طرح کپڑا سلا جائے مگر کپڑا اس وقت تک نہیں سل سکتے جب تک کہ کسی استاذ کو دیکھ کر نہ سیکھ لیں

لہذا ہر حرفت وصنعت میں استاذ کی ضرورت پڑتی ہے کہ وہ عمل کا نمونہ سامنے بن کر آئے اور اس نمونے پر چلائے تو دین جیسی صنعت میں معلم کی ضرورت کیوں نہ ہوگی اگر آدمی دین میں آزاد ہوگا تو جیسی چاہے گا نمونہ اور صورت بنانے لگے گا اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ چوتھا فریضہ ہے کہ تعلیم حکمت یعنی تعلیم اُسوۂ حسنہ بھی کریں اور ان چیزوں پر عمل کر کے دکھائیں جن کے کرنے کا قرآن نے آپ کو حکم دیا ہے اسی لیے فرمایا گیا لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ط یعنی ہم نے نبی کے اندر تمام اسوۂ حسنہ اور نیک نمونے دکھلایا ہے قرآن کے بارے میں حق تعالیٰ نے تِبْيَانًا لِكُلِّ شَيْءٍ فرمایا یعنی ہر چیز کے دلائل اور احکام اس کے اندر موجود ہیں مگر چونکہ عمل کی صورت کاغذ میں نہیں آسکتی تھی اور اس کے لیے کسی ذات اور شخصیت کی ضرورت تھی اس لیے فرمایا لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ط یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک میں سارے نمونے ہم نے رکھ دیئے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ علم تو قرآن میں ہے مگر عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں ہے جو قرآن کہتا ہے وہی آپ عمل کر کے دکھاتے ہیں اور جو آپ عمل کرتے ہیں وہی بعینہٖ قرآن میں ہوتا ہے تو علم وعمل ایک دوسرے کے مطابق ہیں یہ ہم نے اس پر کہا کہ تلاوت کے بعد تعلیم کی ضرورت تھی تو اس کو بھی فرض قرار دیا گیا اور تعلیم کے بعد علوم کی استقامت کی ضرورت تھی تو اس کو بھی ضروری قرار دیا گیا استقامتِ قلب کے بعد نمونے کی ضرورت تھی تو اس کا بھی حکم دیا گیا اس لیے ان چار چیزوں سے مل کر آدمی کا علم و دین بنتا ہے اگر ان چیزوں کو منقطع کر دو تو نہ علم بنے گا نہ دین ہی بنے گا تو تلاوت کی ضرورت الگ ہے اور بیان مراد کی ضرورت الگ ہے۔ یہ چیزیں واجبات میں سے

ہیں، تلاوت و تعلیم و تزکیہ نفس و اسوۂ حسنہ کے متعلق جتنی حدیثوں کی تعلیم دی گئی ہے۔ جب اصل اور حقیقت سامنے آئے گی تو سب اپنے اپنے موقع پر جڑتی چلی جائیں گی۔

دین سیکھنے اور سکھلانے کی اہمیت اور طریقہ کار

جیسا کہ حدیث شریف میں فرمایا گیا کہ تَعَلَّمُوا الْفَرَائِضَ وَعَلِّمُوهَا فَإِنِّي مَقْبُوضٌ۔۔ یعنی علم سیکھو اور سکھلاؤ کیونکہ میں دنیا سے جانے والا ہوں فرائض سے بعض حضرات نے علم وراثت مراد لیا ہے یعنی علم فرائض اور بعض لوگوں نے فرائض سے عام مراد لیا ہے یعنی مطلقاً فرائض جو تم پر عائد ہوتے ہیں حدیث کا مطلب یہ ہے کہ میرے جانے کے بعد پھر تعلیم دینے والا کوئی نہیں رہے گا اس لیے تم علم دین سیکھو اور سکھاؤ تاکہ دین کی بقا رہے اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دین سیکھنے کے لیے شخصیت کی ضرورت ہے محض کتاب کافی نہیں ہے اگر کوئی صرف کتابوں کے مطالعہ ہی سے علم حاصل کرے تو وہ مستند عالم نہیں بن سکتا ہاں لغوی عالم تو بن جائے گا مگر مرادات کا علم نہیں ہو سکتا اور بالفرض مان لیجئے کہ صحیح مراد بھی سمجھ جائے مگر عمل کا نمونہ کاغذ میں نہیں آسکتا اس لیے پھر بھی شخصیت کی ضرورت پڑے گی اور فرض کر لیجئے کہ سوچ سوچ کر کچھ نمونہ بھی نکال لے مگر قلب کی استقامت اور اس کی بھی بغیر شخصیت کے نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ کاغذ کا کام نہیں ہے کہ دلوں کو مانجھ دے یہ شخصیت ہی کا کام ہے تو تلاوت سے لے کر تعلیم و تزکیہ نفس و اسوۂ حسنہ تک یہی شخصیت کی ضرورت پڑتی ہے اسکے لئے صرف کتاب اور کاغذ کافی نہیں ہے اس سے معلوم ہوا کہ جن لوگوں کے علم دین سیکھنے کا تعلق محض کتب بینی اور مطالعہ پر ہے

ان کا علم قابلِ اعتماد نہیں کیونکہ علوم کے سمجھنے میں خود ان کا نفس امام ہے چونکہ نفس ناتربیت یافتہ ہوتا ہے اس لیے جو چاہتے ہیں سمجھ لیتے ہیں آجکل یہی معاملہ ہو رہا ہے ہر شخص اردو کی کتابیں پڑھ کر قرآن شریف کا ترجمہ دیکھتا ہے نہ تو اسکو قرآن کے صحیح معنے کا پتہ نہ ہی اسکے مدلولا کا پتہ اور نہ ہی اس کے مفہوم کا پتہ اور نہ مرادات کا پتہ بس جو ذہن میں آتا ہے وہی بیان کر دیتا ہے چونکہ ذہن ناتربیت یافتہ ہوتا ہے اس لیے اس کے علم میں وہی چیزیں آتی ہیں جو قلب کی کجی میں ہوتی ہیں اکثر و بیشتر یہی نظر آرہا ہے۔

علم کے لیے سند کی ضرورت

اس لیے تعلیم کی ضرورت پڑتی ہے اور تعلیم کے لیے سند کا ہونا ضروری ہے اگر آپ کو کوئی بڑا عالم بتائے تو اس کی دلیل میں یہ نہیں بتائے گا کہ آپ نے وہ بخاری شریف پڑھی ہے جو مطبع مجتبائی کی چھپی ہوئی ہے اس کی تصحیح بھی بہترین ہے اور اس کا کاغذ بھی عمدہ ہے اور چھپائی بھی لاجواب ہے اس لیے آپ بڑے عالم ہیں اور فلاں شخص چھوٹا عالم ہے کیونکہ اس نے وہ بخاری شریف پڑھی ہے جو نول کشور کی چھپی ہوئی ہے نہ اس کا کاغذ اچھا اور نہ چھپائی اچھی اس لیے وہ چھوٹا عالم ہے بلکہ بڑے اور چھوٹے عالم ہونے کی معیار سند ہوتی ہے اس لیے پہلے سند معلوم کرتے ہیں کہ انھوں نے کن اساتذہ سے علم سیکھا ہے اور ان اساتذہ نے کن سے علم سیکھا ہے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک سند پہونچ جائے گی تو اب بڑے عالم ہونے کا فیصلہ کریں گے کہ وہ مستند عالم ہیں تو مستند عالم ہونے کی معیار کتاب نہیں بلکہ شخصیت ہے اسی لیے سند کی اہمیت دی جاتی ہے کہ نقل کا سلسلہ بندھا ہوا ہو اور اس کی وجہ یہی ہے جیسا کہ فرمایا گیا ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْکِتَابَ الَّذِیْنَ اصْطَفَیْنَا

مِنْ عِبَادِ نَا ۔ ترجمہ ۔ ۔ ۔ پھر وارث بنایا ہم نے اپنے بندوں میں سے ان لوگوں کو جن کو ہم نے انتخاب کر لیا علمی وراثت جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے چلی آرہی ہے اس کے مورث اعلیٰ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں وراثت میں آپ بمنزل والد کے ہیں اور ساری امت بمنزل اولاد کے ہے۔ اور یہ وراثت پا رہی ہے اور ظاہر ہے کہ وراثت تو اسی وقت ملتی ہے جبکہ نسب نامہ صحیح ہو اگر باپ سے نسب ہی نہ ملا ہو تو پھر وراثت کیسے مل سکتی ہے اسی طرح معنوی سلسلے میں نسب کی جگہ نسبت ہے۔ نسبت کا سلسلہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک سلسلہ ملا ہوا ہو تبھی نسبت صحیح ہو سکتی ہے تو استاد سے لے کر مورث اعلیٰ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک سلسلہ ملا ہوا ہو تبھی وراثت پہونچے گی اور اگر بیچ میں سلسلہ ختم ہو گیا تو پھر اختراع اور خود داری آجائے گی۔ اس لیے وراثت باقی نہ رہے گی اب جو علم آئے گا وہ علم ایجادی ہو گا اسنادی نہ ہو گا اس لیے معتبر علم کے لیے سند کا ہونا ضروری ہے اور سند کا مطلب یہ ہے کہ لفظا اور معنی دونوں کا سلسلہ سند حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہونچ جائے۔ میں تو کہتا ہوں کہ ذوق کی سند بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک ہونی چاہیئے عالم میں وہی علمی ذوق بھی ہو جو اوپر متواتر چلا آرہا ہے اور اگر ذوق کی وہ علمی تربیت نہیں ہے جو سلسلہ وار چلا آرہا ہے تو اپنے ذوق سے آدمی علم حاصل کرے گا تو صحیح مراد متعین نہیں کر سکتا اس لیے وہ حقیقی مراد نہ ہو گی بلکہ وہ خود داری ہو گی بہر حال حقیقی مراد سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اسناد اور نقل صحیح ہو۔

حدیث وفقہ کا انکار در حقیقت قرآن کے مطالبہ کا انکار ہے

جو آیتیں ذی معانی ہیں ان کا من معانی مطلب آدمی نکال سکتا ہے مگر

ان میں روک لگانے والی چیزیں حدیث وفقہ ہیں اس لیے اگر کسی کو من مانی مراد نکالنی ہو تو پہلے حدیث وفقہ کا انکار کر دے پھر آزادی ہو جائے گی اور میدان خالی ہو جائے گا پھر جو چاہے سمجھے اور سمجھائے اس لیے من مانی مطلب بیان کرنے کے لیے بعض لوگ حدیث ہی کا انکار کر دیتے ہیں اور بعض لوگ حدیث کا انکار تو نہیں کرتے مگر فقہ کا انکار کر دیتے ہیں تاکہ جو اسناد جزوی ہو وہ ختم ہو جائے اور جزئیات میں بالکل آزاد ہو جائیں۔ حدیث وفقہ کا انکار درحقیقت قرآن کے مطالبہ کا انکار ہے کیونکہ دین اصول اور فروع کے مجموعہ کا نام ہے اور قرآن کے مطالبہ تک پہونچنے کے یہی دو راستے ہیں اور یہی زینہ بھی ہیں۔ لہذا جب کوئی آدمی بغیر زینہ کے چھت پر جانا چاہے گا تو اُچھل کر گر پڑے گا اور اوپر نہیں جا سکے گا پھر نیچے آکر چوٹ کھائے گا۔ جب چھت پر پہونچنے کی ترتیب یہی ہے کہ آدمی زینہ بزینہ چڑھے تبھی چھت پر پہونچے گا تو تحصیل علم کے سلسلے میں بغیر زینہ اور راستہ کے مقصد تک کیسے پہونچ سکتا ہے اس لیے علم دین سیکھنے کے لیے ضروری ہے کہ حدیث بھی سامنے ہو اور فقہی جزئیات بھی سامنے ہوں اور تعلیم کے ذریعہ اصول و مطالب اور مقاصد حقہ بھی سامنے ہوں اسی طرح تعلیم کے ذریعہ اس کی سند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک سلسلہ وار پہونچی ہوئی ہو تب مستند عالم کہلانے کا مستحق ہو گا۔

ایک منکر حدیث کا محققانہ جواب

حضرت حکیم الاسلامؒ نے سلسلہ بیان جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ ایک صاحب مجھے تبلیغ کرنے کے لیے سامنے بیٹھے اور یہ دعویٰ کیا کہ میں منکر حدیث ہوں میں نے کہا کہ آپ بالکل غلط کہتے ہیں آپ منکر حدیث

نہیں ہیں۔ انھوں نے کہاکہ میں حلف کرتا ہوں کہ میں منکر حدیث ہوں میں نے کہاکہ میں بھی حلف کرتا ہوں کہ آپ منکرِ حدیث نہیں ہیں انھوں نے کہا کہ یہ کیسے میں نے کہاکہ آپ جو قرآن کو اپنا مبنیٰ بنا رہے ہیں یہ آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ یہ قرآن قرآن ہے انھوں نے کہاکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ یہ قرآن ہے میں نے کہاکہ یہی تو حدیث ہے جب آپ کو قرآن کا قرآن ہونا حدیث سے معلوم ہوا تو پھر آپ منکرِ حدیث کہاں رہے حدیث کے اقرار کے بغیر آدمی قرآن تک پہونچ ہی نہیں سکتا لہذا آپ لوگوں کو فریب دے رہے ہیں کہ میں منکر حدیث ہوں حقیقتاً آپ منکر حدیث نہیں ہیں آپ کی زبان تو انکار کررہی ہے مگر آپ کا دل اقرار کرتا ہے ورنہ قرآن کو قرآن کیسے سمجھتے اس پر انھوں نے کہاکہ وہ حدیثیں جو قرآن کی طرح متواتر ہیں ان کو تو ماننی ہی پڑیگی میں نے کہاکہ جب آپ نے جنس حدیث مان لیا تو اب زیادہ سے زیادہ نوعیت حدیث میں کلام ہوسکتا ہے تو ایک نوع تو تواتر کی ہے اور ایک شہرت کی ہے اور ایک غرابت کی ہے مگر جب آپ نے جس حدیث کو مان لیا پھر منکرِ حدیث نہیں رہے اب اقسام حدیث کے متعلق جو بات ہے تو علما حضرات نے خود ہی اس کی تقسیم کردی ہے اس لیے ساری حدیثیں حجت میں یکساں نہیں ہیں اور حدیث تواتر تو مورث یقین ہے اس لیے اس کا منکر کافر ہے اور شہرت مورث ظن غالب ہے اس لیے اس کا منکر فاسق ہوتا ہے اور غرابت سے جو حدیثیں پیدا ہوتی ہیں ان میں مطلق ظن ہوتا ہے ظن غالب بھی نہیں اس لیے اس کا حکم دوسرا ہے علماء نے خود ہی ان میں فرق کردیا ہے اور ہر ایک کے احکام الگ الگ بیان کئے ہیں لہذا جب آپ نے جنس حدیث کو مان لیا اور تواتر کی ایک نوع بھی مان لیا تو پھر دوسری

فرع کے ماننے میں آپ کو کیا اشکال ہے جب کہ ان کا حکم وہ نہیں ہے جو تواتر کا ہے وہ صاحب بالکل چپ ہو گئے کہ میں تو آپ کو نصیحت کرنے آیا تھا کہ آپ حدیثوں کے جنگل میں کیا پھنسے ہوئے ہیں مگر اب میں مذہب ہی نہیں بلکہ اپنے دعویٰ کا منکر ہو گیا ہوں اور اب میں ساری حدیثوں کو مانتا ہوں میں نے کہا کہ جزاء کم اللہ پھر وہ صحیح طور پر حدیثو کے مقر ہو گئے تجربہ یہی ہے کہ ان لوگوں کے مسلک کی بنیاد شبہات پر ہے حقائق پر نہیں ہے اس لیے جب شبہ زائل کر دو تو وہ مسلک بدل دیتے ہیں وہ مسلک ہی کیا ہے جس کی بنیاد شبہات پر ہو ان کو ذرا سا شبہ پیدا ہو تا ہے تو مسلک بدل دیتے ہیں مسلک تو وہ ہے کہ جس کی بنیاد حقائق پر ہو دنیا تو بدل جائے مگر حقائق نہیں بدل سکتے اور شبہ چونکہ جہل کا ایک قسم ہے اس لیے ان کے مسلک کی بنیاد جہالت پر ہے اس لیے اس کا کوئی اعتبار نہیں۔

مجلس ۳۰

برکات کی مختلف صورتیں اور مہمان نوازی کا مفصل بیان

سوال: بمبئی میں ماسٹر عزیز الحق صاحب عطر والے کے گھر حضور والا کی موجودگی میں ہم نے دیکھا کہ مہمانوں کے کھانے کے بعد کافی کھانا بچ گیا سوال یہ ہے کہ مہمانوں کے آنے سے عموماً جو کھانا بڑھ جاتا ہے یہ برکت مہمانوں کی وجہ سے ہوتی ہے یا میزبان کے خلوص کا بھی اثر ہوتا ہے؟

حضرت حکیم الاسلام نے فرمایا کہ مہمانوں کے آنے سے میزبان کے گھر میں برکت کا ہونا یہ خود ایک شرعی مسئلہ ہے شریعت نے اس کی اطلاع بھی دی ہے برکت کے کئی معنے آتے ہیں برکت کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ شئی کسی طور پر دوگنی چوگنی ہو جائے اور ایک برکت یہ بھی ہے جیسا کہ فرمایا گیا تَبَارَكَ الَّذِیْ بِیَدِهِ الْمُلْكُ ز وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرُ الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ط آیت شریف کا ترجمہ اس میں حق تعالیٰ نے اپنی شان بیان فرمائی کہ وہ برکت والی ذات ہے اس کے قبضے میں ملک ہے وہ ہر شئی پر قادر ہے اس نے موت اور حیاۃ کو پیدا فرمایا تاکہ وہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں سے عمل کے اعتبار سے کون زیادہ اچھا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جب اس کی ذات برکت والی ہے تو وہ برکت آگے والی چیزوں میں اثر کرے گی جن کا آگے ذکر ہے اور آگے عمل کا ذکر ہو تو اعمال میں برکت کا اثر

ہوگا تو اعمال صالحہ میں برکت کے معنے یہ ہیں کہ عدد بڑھ جائے یعنی مثلاً پہلے ایک شخص چار رکعت نماز نفل پڑھتا تھا مگر اس کو توفیق ہو گئی اب وہ آٹھ رکعت پڑھنے لگا یا بارہ رکعت پڑھنے لگا یا کثرت سے پڑھنے لگا تو یہاں پر عمل میں برکت ہوئی کہ عدد بڑھ گئی اس سے پہلے موت وحیات کا ذکر فرمایا اس سے بنی آدم کی افراد کے طرف اشارہ ہے اس میں برکت یہ ہے کہ اولاد بڑھ جائے یا رزق بڑھ جائے یا حالات بہتر سے بہتر ہو جائیں اور اس میں برکت ہو یا جیسے دوسرے مقام پر نوح علیہ السلام کے واقعہ میں فرمایا گیا حضرت نوح علیہ السلام کو خطاب کیا فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۝ يُّرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ۝ وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ ۝ ترجمہ۔۔ تم اپنے رب سے استغفار کرو کیونکہ وہ گناہوں کو معاف کرنے والا ہے اگر تم ایسا کرو گے تو وہ کثرت سے تمہارے اوپر بارش برسائے گا اور تمہاری اولاد اور اموال میں ترقی دے گا یہاں پر مدد کے معنی برکت کے ہیں یعنی وہ اموال واولاد میں برکت دے گا تو اولاد میں برکت کے معنی یہ ہیں کہ ان کی عدد بڑھ جائے گی یا اتنے ہی مال سے ضرورت پوری ہو جائے اگرچہ وہ برکت محسوس نہ ہو مگر ہوتی ضرور ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کے دسترخوان پر برکتوں کا اترنا

جیسے حدیث شریف میں آیا ہے کہ غزوہ خندق کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی خندق کھودنے میں صحابہؓ کے ساتھ تھے۔ صحابہ نے فاقے کی کچھ شکایت کی اور عرض کئے ہم پیٹ پر فاقے کی وجہ سے دو پتھر

باندھ رکھے ہیں اس پر آپ نے چادر مبارک اتار کر فرمایا کہ میں نے تین پتھر باندھ رکھے ہیں میں بھی فاقے سے ہوں جب حضرت انس کے علم میں یہ بات آئی تو انھوں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب آپ اس کام سے فارغ ہو جائیں تو ہمارے گھر تشریف لے چلیں میں کچھ کھانے کا انتظام کر لیتا ہوں آپ نے منظور فرمایا جب آپ کام سے فارغ ہو کر تشریف لیجانے لگے تو سارے صحابہؓ سے فرمایا کہ تم سب چلو آج تمہارے بھائی انس کے گھر دعوت ہے جب یہ حضرات بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضرت انسؓ کے گھر پہونچے تو یہ مجمع دیکھ کر حضرت انسؓ بہت گھبرائے اور پریشان ہوتے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی پریشانی کو دیکھ کر فرمایا کہ انسؓ کیا پکائے ہو۔ انھوں نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو کی دو روٹیاں پکا رکھی ہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دسترخوان بچھاؤ اور ان روٹیوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے اس پر ڈال دو۔ جب انسؓ تعمیل حکم کر چکے تو آپ نے فرمایا تین تین چار چار آدمی کھاتے جائیں اور اٹھتے جائیں لوگ کھاتے گئے اور اٹھتے گئے سارا مجمع کھانے سے نمٹ گیا مگر وہ ٹکڑے باقی رہے۔ ظاہر بات ہے کہ یہاں پر برکت عدد ہی کے اعتبار سے ہوئی کیونکہ وہ ٹکڑے بدستور باقی رہے پیٹ میں تو وہی ٹکڑے گئے جو بڑھ گئے تھے وہی برکت تھی تو وہ عدداً بڑھی اور کبھی برکت کے معنی یہ بھی آتے ہیں کہ شے تو اتنی ہی رہے مگر بہت سے لوگوں کو کافی ہو جائے تو یہاں پر عدداً تو کوئی چیز نہیں بڑھی البتہ کیفیتاً بڑھ گئی یعنی اتنی مقدار جو دو آدمی کے لیے ناکافی تھی مگر دس آدمی کے لیے کافی ہو گئی اور کبھی برکت کے یہ معنی آتے ہیں کہ کھانے کے مفاد ظاہر ہو جائیں یعنی اس کے کھانے سے صحت و قوت و فرحت

وغیرہ بڑھ جائے تو اس میں نہ عدد بڑھی نہ مقدار بڑھی مگر اضافی طور پر برکت
یہ ہوئی کہ کھانے کا مفاد ظاہر ہوگیا جیسے کہا کرتے ہیں کہ مال حرام میں برکت
نہیں ہوتی تو بے برکتی کے معنی یہ بھی ہیں کہ راس المال ہی ختم ہو جائے اور
نفع نہ ہو اور بے برکتی کے معنی کبھی یہ بھی آتے ہیں کہ اصل مال تو موجود ہے اور
آدمی پریشان حال ہے اور کہتا ہے کہ سب کچھ ہے مگر برکت ہی نہیں ہوتی
معلوم ہوتا ہے کہ کچھ ہے ہی نہیں مثلاً روپیہ آیا اور خرچ بھی ہوگیا تو روپیہ آنے
اور خرچ ہونے کا علم تو ہے مگر اس کا کوئی اثر ہی ظاہر نہیں ہوا اور بے برکتی
کے معنی یہ بھی ہوتے ہیں کہ سب کچھ موجود ہے اور کھاتے پیتے بھی ہیں مگر نہ
صحت ہے نہ فرحت ہے نہ شگفتگی ہے بقول شخصے کہ روٹی کو وہ کھا رہا ہے
اور روٹی اسے کھا رہی ہے تو یہاں پر بے برکتی کے معنی یہ ہیں کہ کھانے کے
آثار نمایاں نہیں ہوتے جو کھانے کا اصل مقصد تھا یعنی فرحت و صحت
وغیرہ تو چند معنے برکت کے بھی آتے ہیں اور چند معنے اس کے مقابلے میں
بے برکتی کے بھی آتے ہیں تو جب مہمان آتا ہے تو تینوں قسم کی برکات ہوتی
ہیں یعنی بعض مرتبہ مقدار بڑھ جاتی ہے یا عدد بڑھ جاتا ہے یا تھوڑا کھانا
جماعت کے لیے کافی ہو جاتا ہے جیسا کہ ہم نے حدیث شریف کی مثال دی

حضرت نانوتویؒ کی کرامت

میں نے حضرت نانوتویؒ کا واقعہ سنا ہے کہ شیخ عبدالرزاق
مرحوم جو حضرت کے ہم زلف تھے انھوں نے ایک مرتبہ حضرت کی دعوت
کی تو جو راستے میں ملتا اس سے فرماتے کہ چلو بھائی کے یہاں دعوت ہے اتفاق
سے تقریباً بیس پچیس آدمی جمع ہو گئے وہ بیچارے بہت پریشان ہوئے کبھی
گھر میں آتے باہر آتے پھر گھر میں جاتے اور باہر آتے حضرت نانوتوی سمجھ گئے

کہ یہ پریشان ہیں تو فرمایا کہ کیا پکائے ہو انھوں نے کہا کہ حضرت پلاؤ پکا رکھا ہوں فرمایا کہ پردہ کراؤ میں گھر میں آنا چاہتا ہوں پھر حضرت گھر میں تشریف لے گئے اور پوچھا کہ وہ پلاؤ کہاں ہے انھوں نے کہا کہ اس ڈیکچی میں ہے حضرتؒ نے اس میں اپنا ہاتھ ڈال کر ایک لقمہ تناول فرمایا پھر اپنی لنگی سے ڈھانپ دیا اور فرمایا کہ کھولنا مت بس نکالتے ہی رہو بھیجتے رہو چنانچہ انھوں نے یہی کیا۔ نکالتے رہے اور بھیجتے رہے یہاں تک کہ پورا مجمع کھانے سے نمٹ گیا مگر پلاؤ بدستور باقی رہا پھر شیخ عبدالرزاق مرحوم نے محلے والوں کو بھی بھیجا اور تقسیم فرمایا جب حضرت نانوتویؒ واپس آنے لگے تو فرمایا میں نے اپنی لنگی ہدیہ تھوڑے ہی کی ہے میری لنگی واپس لاؤ جب لنگی ہٹائی گئی تو ڈیکچی خالی ہو گئی تو یہاں پر جو برکت آئی وہ مقدار کے اعتبار سے آئی تو جس طرح مہمانوں کے آنے سے برکت ہوتی ہے اسی طرح جو حضرات وارثانِ نبوت ہیں ان کے ہاتھوں سے بھی برکت ہوتی ہے اور لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں اور یہ جو فرمایا گیا کہ بسم اللہ کہہ کر حسن نیت سے کھاؤ تو ایک کا کھانا دو کے لیے کافی ہو جائے گا یہ عمومی طور پر فرمایا گیا ہے خواہ مہمان ہو یا غیر مہمان ہو پیٹ بھر جائے گا خواہ وہ مقدار میں تھوڑی ہی کیوں نہ ہو کھانا کھانے کا مقصد حاصل ہو جائے گا حدیث شریف میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ جب کسی کے گھر مہمان آتا ہے تو اپنی قسمت ساتھ لے کر آتا ہے یعنی وہ میزبان کے گھر سے کچھ نہیں کھاتا بلکہ من جانب اللہ اس کا جو حصہ مقدر ہوتا ہے وہی کھاتا ہے اور چلا جاتا ہے تو آتا ہے اپنا لے کر اور جاتا ہے تو میزبان کے سارے گناہ لے جاتا ہے یعنی میزبان کے سارے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ اس سے زیادہ برکت کی چیز کیا ہو سکتی ہے مہمان بھی کھانے سے نمٹ گیا اور میزبان گناہوں سے پاک و صاف ہو گیا۔

یہ مہمان نوازی کی برکت ہے یہ عمل گناہوں کا کفارہ ہو گیا تو برکت کے کئی معنی آتے ہیں کہیں کیفی طور پر نمایاں ہوتی ہے اور کہیں کمی طور پر نمایاں ہوتی ہے اور کہیں پر ترتب آثار کے طور پر نمایاں ہوتی ہے یعنی اس کے آثار مرتب ہو جاتے ہیں جب عام کھانوں کی برکت کا یہ حال ہے کہ اگر حسن نیت کے ساتھ بسم اللہ کہہ کر کھانا کھائے تو برکت ظاہر ہوتی ہے تو میزبان تو ایک احسان کر رہا ہے اور حسن نیت اس کے ساتھ ہے تو اس میں برکت کیسے نہ ہوگی۔ یقیناً برکت بھی ہوگی اور اس کے آثار بھی مرتب ہوں گے اس کے علاوہ قرآن میں ایک اصول بتایا گیا ہے جو برکت کا ایک فرد ہے وَمَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهُ ؕ جو کچھ تم اللہ کے لیے خرچ کرو گے جو اس کی جگہ خالی ہوگی تو دوسری چیز اس کی جگہ پر آجائے گی وہ جگہ خالی نہ رہے گی یہ بھی برکت کا ایک اثر ہے کہ جتنا خرچ ہوا تھا یا تو بعینہ ایسی ہی چیز سے یا اس سے بہتر چیز سے وہ جگہ پُر ہو گئی یہ حسن نیت اور اخلاص ہی پر ہوتا ہے اور اگر کوئی شخص رسمی طور پر یا نام و نمود کے لیے کھلائے تو اس پر برکت کا کوئی وعدہ نہیں ہے برکت کا وعدہ اسی وقت کے لیے ہے کہ آدمی فریضۂ شرعی سمجھ کر حسن نیت سے کھلائے تب برکت کے آثار مرتب ہوں گے اور اگر نیت صاف نہیں اور وہ مخلص نہیں ہے اور محض بدنامی کی ڈر سے مجبوراً کھلا رہا ہے اس میں حسن اخلاق اور لوجہ اللہ شامل نہیں ہے تو اس پر برکت کے آثار مرتب نہیں ہوں گے کیونکہ یہ دنیاوی چیز ہو گئی اخروی نہیں رہی۔

مہمان نوازی میں بے تکلفی اور سادگی

مہمان نوازی میں سادگی اور بے تکلفی بھی پیش نظر رکھی گئی ہے۔ یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ تکلف کرے اور سارا بار اپنے ہی اوپر

لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جب زیادہ مہمان آجاتے تو آپ صحابہ میں تقسیم فرمادیتے اور ہر صحابی اپنی حیثیت کے مطابق مہمانوں کو لیتے اور اپنے گھر لے جاتے اور ان کی مہمان نوازی فرماتے ظاہر ہے کہ جس نے نبوی احکام کی تعمیل کی ہو یہ ممکن نہیں کہ برکت سے محروم رہے مگر بے تکلفی کا برتاؤ انھیں لوگوں کے ساتھ کیا جاسکتا ہے جس پر پورا اعتماد ہو کہ وہ خوش ہو گا جیسا کہ بعض روایات میں ہے کہ ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی ہمارے یہاں دعوت ہے آپ نے منظور فرمایا وہ صحابی گھر گئے پھر بازار میں جاکر بکری تلاش کی مگر بکری نہیں ملی اس کے بعد اپنے دوست کے گھر گئے کہ ان سے مانگ لوں مگر معلوم ہوا کہ ان کی بکریاں چرنے گئی ہیں۔ جب وہاں پر بھی بکری نہ ملی تو اپنے ایک بہت قریبی دوست کے گھر گئے ان کے یہاں بکری بندھی ہوئی تھی مگر وہ خود موجود نہیں تھے اس لیے ان کی بکری اس اعتماد پر لے آئے کہ وہ سن کر برا نہیں مانیں گے بلکہ خوش ہوں گے اور لاکر ذبح کئے اور اس کا گوشت پکائے ان کو یہ بھی یقین تھا کہ جب ہمارے دوست کو معلوم ہو گا کہ ان کے یہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت تھی اس لیے بکری لے گئے ہیں تو وہ خوش ہوں گے کہ اچھا ہوا میری بکری اچھے مصرف میں صرف ہو گئی چنانچہ ایسا ہی ہوا جب ان کو معلوم ہوا بہت خوش ہوئے مگر اس کا نتیجہ یہ مرتب ہوا کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلا لقمہ زبان مبارک پر رکھا تو فرمایا یہ تو مالِ غصب معلوم ہوتا ہے دوسرے لوگ کھائیں مگر میں نہیں کھاؤں گا۔ پھر وہ صحابی نے پورا واقعہ بیان فرمایا کہ اس طرح بکری لاکر ہم نے ذبح کیا مگر قاعدہ کے رو سے وہ مال مغصوبہ ہی تھا اس لیے آپ نے تناول نہیں فرمایا البتہ دوسرے حضرات کو آپ نے اجازت

دیدی اگرچہ بعد میں مالک راضی ہی ہوجائے مگر چونکہ معاملہ غضب کا تھا اس لیے آپؐ نے خود تناول نہیں فرمایا اگرچہ اس کا طریقہ جائز کا تھا تو برکت کے آثار اس پر بھی مرتب ہوں گے کیونکہ اس میں نیک نیتی شامل تھی مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مقام کے اعتبار سے معاملہ فرمایا کہ جس میں غضب کا نام بھی آجائے وہ نبی کے لیے زیبا نہیں ہے بہر حال میزبان کے لیے برکت ضرور ہوگی کیوں کہ مہمان نوازی بھی انفاق فی سبیل اللہ ہے لہذا میزبان اللہ کے راستے میں یہ خرچ کرتا ہے صدقہ خیرات تو الگ ہیں یہ تو ہدیہ ہے اور حسن نیت بھی شامل ہے لہذا ممکن نہیں کہ برکت کے آثار مرتب نہ ہوں

مہمان نوازی سارے انبیاؑ کی سنت ہے

سائل نے سوال کیا کہ کیا مہمان نوازی

ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ یہ تو سارے ہی انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے مگر مہمان نوازی ابراہیم علیہ السلام کا وصف خاص تھا ان کا یہ طبعی جذبہ تھا کہ کوئی مہمان آئے اور اس کو کھانا کھلائیں جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس ملائکہ علیہم السلام انسانی شکل میں آئے اور ان کے مہمان ہوئے تو ابراہیم السلام نے فوراً ان کے کھانے کا انتظام فرمایا جب کھانا ان کے سامنے رکھا تو وہ کھاتے ہی نہیں تھے اس لیے ابراہیم علیہ السلام کے دل میں تشویش پیدا ہوئی کہ آخر یہ مہمان کھاتے کیوں نہیں اس پر انھوں نے فرمایا کہ ہم ملائکہ ہیں اور قوم لوط کی بستیاں الٹنے کے لیے عذاب لے کر آئے ہیں پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو انھوں نے بشارت دی کہ تمہارے لڑکا پیدا ہوگا اس کا مفصل واقعہ قرآن میں موجود ہے بہر حال فرشتے تو کھاتے پیتے نہیں کیونکہ ان کی غذا ذکر اللہ ہے مگر ابراہیم

علیہ السلام اپنے طور پر ان کے کھانے کا بندوبست فرمایا تو ابراہیم علیہ السلام کا یہ وصف غالب تھا ورنہ سارے انبیاء علیہم السلام سارے کمالات کے جامع ہوتے ہیں مگر ہر ایک پر کوئی نہ کوئی وصف غالب ہوتا ہے جیسے حضرت داؤد علیہ السلام پر شکر کا وصف غالب تھا اور حضرت ایوب علیہ السلام پر صبر کا وصف غالب تھا اور حضرت یعقوب علیہ السلام پر حزن وغم کا وصف غالب تھا پھر یہی شان اہل اللہ کی ہوتی ہے کہ جامع ہونے کے باوجود طبعی طور پر کوئی وصف ان پر غالب ہوتا تھا حضرت نانوتویؒ پر مہمان نوازی کا وصف غالب تھا حضرت یہ چاہتے تھے کہ سارا گھر لاکر مہمان کے پاس رکھ دیں۔ ایک مرتبہ حضرت گنگوہیؒ حضرت کے یہاں تشریف لائے ان کے ساتھ ایک مجمع تھا اور سردی کا زمانہ تھا یہاں پر گھی کھچڑی کا عام رواج تھا تو حضرت نانوتویؒ نے ہر ایک کے آگے دیسی گھی کا پیالہ بھر بھر کر رکھا یہ دیکھ کر حضرت گنگوہی نے فرمایا کہ اس اسراف کی کیا ضرورت ہے ایک پیالہ چند آدمی کے لیے کافی ہے ان پیالوں کو گھر میں واپس بھیجو گھر والوں کو تنگی ہوگی مگر یہ حضرت نانوتوی کے قلب کی فراخی اور وسعت تھی کہ مہمان کے لیے سب کچھ حاضر کر دیتے۔

امام شافعیؒ کی مہمان نوازی کی شان

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ پر مہمان نوازی کا وصف غالب تھا وہ چاہتے تھے کہ سارا گھر مہمان کے حوالے کر دیں حضرت شافعیؒ مہمانوں کے لیے مختلف النوع واقسام کے کھانے پکواتے بعض لوگوں نے عرض کیا کہ حضرت یہ تو تکلف ہے فرمایا کہ تکلف وہ ہوتا ہے جو خلاف طبع ہو لیکن جب آدمی طبعی جذبہ سے کرے تو وہ تکلف نہیں ہوتا حضرت

کا طبعی جذبہ تھا کہ مہمان کی جتنی خدمت ہو سکے کی جائے چنانچہ حضرت امام حنبل ایک مرتبہ ان کے مہمان ہوئے تو امام شافعیؒ ان کے لیے مختلف انواع واقسام کے کھانے پکوائے یہاں تک کہ مختلف کھانوں سے دستر خوان بھر گیا امام ابن حنبلؒ نے اس طرح کھایا کہ جیسے سات وقت کا بھوکا کھاتا ہے۔ امام صاحبؒ کا یہ کثرت طعام دیکھ کر امام شافعیؒ کے بچوں نے اعتراض کیا کہ یہ وقت کے امام ہیں یہ کیسے امام ہیں جو پیٹ بھر کے کھانا کھاتے ہیں متقیوں کی شان یہ تھوڑی ہے امام شافعی سے جواب نہ بن پڑا اور فرمایا کہ محسوس تو مجھے بھی ہوا مگر میں میزبان ہوں اس لیے میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ آپ نے اتنا زیادہ کھانا کیوں کھایا میرے اوپر تہمت آتی ہے اس لیے میں خاموش ہو گیا پھر جب رات کا وقت ہوا تو بچوں نے امام ابن حنبل کے لیے بستر وغیرہ کیا اور ایک لوٹا پانی رکھ دیا تاکہ رات کو نماز تہجد کے لیے دشواری نہ ہو صبح کو یہ حضرات جب نماز فجر کے لیے چلے گئے تو بچوں نے آکر بستر لپیٹا اور دیکھا کہ پانی اسی طرح بھرا ہوا رکھا ہے تو بچوں کے دل میں بڑا اشکال ہوا کہ یہ کیسے امام ہیں کہ پیٹ بھر کھاتے ہیں اور رات کو نماز تہجد کے لیے اٹھتے بھی نہیں پھر بچوں نے امام شافعی کا دامن پکڑا اور اشکال کیا کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ نماز تہجد بھی نہیں پڑھتے ہم نے وضو کے لیے پانی رکھدیا تھا مگر صبح کو اسی طرح بھرا ہوا لوٹا ملا پھر امام شافعیؒ سے بھی نہ رہا گیا چونکہ امام حنبلؒ امام شافعی کے شاگرد تھے اس لیے آپ نے استاد کی حیثیت سے فرمایا کہ اے ابن حنبل تمہارے اندر یہ تغیر کب سے پیدا ہوا میں نے دیکھا کہ تم نے پیٹ بھر کے کھانا کھایا اور نماز تہجد کے لیے پانی بھی استعمال نہیں کیا اس پر امام ابن حنبل مسکرائے اور عرض کیا کہ حضرت وہ بات نہیں ہے جو آپ سمجھے ہوتے ہیں

بلکہ معاملہ کچھ اور ہے امام شافعیؒ نے پوچھا وہ معاملہ کیا ہے تو امام حنبلؒ نے بیان فرمایا کہ مختلف قسم کے کھانے ہمارے سامنے رکھے گئے تو ہم نے دیکھا کہ ان کھانوں پر انوار و برکات کی بارش ہو رہی ہے آج تک ہم نے اتنی حلال کمائی کا کھانا دنیا میں نہیں دیکھا تھا وہ کھانے انوار و برکات سے گھرے ہوئے تھے اس لیے میں نے سوچا کہ جتنا کھا سکوں کھالوں پھر اتنی پاکیزہ کمائی کہا میسر ہو گی اس لیے خوب پیٹ بھر کر کھایا زیادہ کھانے کی وجہ تو یہ تھی پھر اس کھانے کی برکت کے دو آثار ظاہر ہوئے ایک عمل میں ایک علم میں عمل میں تو یہ برکت ہوئی کہ نماز عشا ہی کے وضو سے ہم نے تہجد کی نماز پڑھی اور پھر اسی وضو سے فجر کی نماز بھی پڑھی اس لیے وضو کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی اور علم میں برکت یہ ہوئی کہ بستر پر لیٹے لیٹے ہم نے ایک آیت سے سو مسائل نکالے اللہ تعالیٰ نے میرے قلب پر الہام فرمایا اور معرفت بڑھ گئی امام شافعیؒ یہ سن کر بشاش ہو گئے اور بچوں سے اصل واقعہ بیان فرمایا پھر ان کے اشکالات بھی دور ہو گئے تو یہاں پر برکات کے آثار مہمان پر بھی ظاہر ہوتے اور میزبان پر بھی مہمان پر تو یہ آثار ظاہر ہوئے کہ علم و عمل میں معرفت بڑھ گئی اور میزبان پر بھی برکت ظاہر ہوئی کہ اپنی مہمان نوازی کے اثرات آنکھوں سے دیکھ لیے۔

حکیم الاسلامؒ کا سفر افغانستان

جب بخارا پر روسیوں کا قبضہ ہو گیا تو وہاں کے امیر ہجرت کر کے افغانستان آگئے ان کے ساتھ دوسرے حضرات بھی ہجرت کر کے آگئے اس لیے افغانستان کو ایک مستقل کالونی بنانی پڑی اور ان کے وظیفے مقرر کر دئیے خود امیر بخارا کا وظیفہ بارہ ہزار روپیہ مقرر

ہوگیا امیر بخارا وہاں پر مہمان کے طور پر پڑے رہے جب میں افغانستان گیا تو سید بشر اللہ بخاری وہ ہمارے دوستوں میں سے تھے وہ دیوبند آچکے تھے انھوں نے ہماری دعوت کی جب ہم کھانا کھاکر فارغ ہوگئے تو کہا کیا اب اجازت ہے یہ لفظ کہنا ہی تھا کہ جتنے گھر والے تھے وہ گھر چھوڑ کر باہر نکل گئے یہ دیکھ کر میں حیران ہوگیا آخر میں نے کوئی بُری بات تو نہیں کہی کہ سب کے سب گھر چھوڑ کر باہر نکل گئے میں نے تو صرف اجازت ہی مانگی تھی تو غازی صاحب کے والد مولانا محمد میاں صاحب وہ بھی ہمارے ساتھ تھے میں نے ان سے کہا کہ میں نے تو کوئی بری بات نہیں کہی تھی صرف اجازت ہی تو مانگی تھی مگر گھر والے گھر چھوڑ کر باہر نکل گئے آخر بات کیا ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ اس کے معنی ہی اجازت کے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ گھر تو تمہارا ہے ہم اجازت دینے والے کون ہیں یعنی گھر تو مہمان کا ہے میزبان کا نہیں پھر جب ہم باہر آئے تو جتنے میزبان تھے قطار باندھے ہوتے کھڑے تھے اور ہر ایک کے ہاتھ میں کوئی نہ کوئی ہدیہ ضرور تھا وہاں کا یہی دستور تھا کہ مہمان کو بغیر ہدیہ دیئے ہوئے رخصت نہیں کرتے تھے صرف کھانا ہی کھلا دینا کافی نہیں تھا اس وقت بخارا والوں کی شان مہمان نوازی یہی تھی کہ وہ چاہتے تھے کہ سارا گھر بھی مہمان کے حوالے کردیں سید بشر اللہ نے کہا کہ امیر بخارا کی عظمت ہمارے دلوں میں ہے کیونکہ وہ بخاری ہیں اور بروقت مہاجر ہیں اس لیے آپ ان سے ضرور ملاقات کریں میں نے کہا کہ ان سے ملاقات کرنے کا وقت لے لو تاکہ ہم اس وقت آکر ملاقات کرلیں سید بشر اللہ صاحب جب ملاقات کا وقت معلوم کرنے کے لیے گئے تو انھوں نے اجازت نہیں دی اور عذر بیان فرمایا کہ ہمارے بخارا کا دستور

ہے کہ مہمان کو بغیر ہدیہ دیئے ہوئے رخصت نہیں کرتے یا تو میں ہدیہ اپنی شان کے مطابق دیتا یا ان کی شان کے مطابق دیتا مگر مجبوری یہ ہے کہ ہجرت کر کے میں یہاں پڑا ہوا ہوں اور غربت کی حالت میں ہوں اگر وہ آئے اور میں ہدیہ پیش نہ کر سکا تو بڑی شرمندگی ہوگی اس خجلت سے بچنے کی صورت یہی ہے کہ ملاقات ہی نہ کریں تو ان حضرات کی مہمان نوازی اس درجے کی تھی کہ وہ چاہتے تھے کہ سارا گھر مہمان کے حوالے کر دیں۔

مہمان کے شرعی حقوق

مہمان نوازی کا یہ ذوق اسلام نے پیدا کیا ہے اور مہمان نوازی کا طریقہ سکھلایا مگر اس کے اندر خلوص ہو محض نام و نمود نہ ہو البتہ یہ اجازت ہے کہ مہمان کے لیے تکلف نہ کرے بلکہ جو کھائے وہی کھلا دے اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے عائشہ مہمان کے سامنے زیادہ تکلف مت کرو بلکہ جو کھاؤ وہی سامنے رکھ دو یعنی ایسا تکلف کہ جس کی وجہ سے بوجھ بڑھ جائے ضرورت نہیں ہے مقصد مہمان کی خاطر مدارات ہے اور مدارات کے معنے زردہ پلاؤ کے نہیں ہیں بلکہ محبت اور اخلاص کے ساتھ جو گھر میں موجود ہو وہی مہمان کے حوالے کر دو وہی موثر اور باعث برکت ہوگا تو اسلام نے مہمان نوازی کی تعلیم دی اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہا کہ مہمان کو اپنے سے زیادہ سمجھو اور یہ بھی فرمایا کہ اگر مہمان تین دن تک ٹھہرے تو اس کو ٹھہرنے کا حق ہے آپ کو یہ حق نہیں کہ کہدیں چلے جاؤ البتہ تین دن کے بعد یہ کہنے کا حق ہے اب آپ جا سکتے ہیں مطلب یہ ہے کہ اب میرے اندر گنجائش نہیں ہے اگر یہ بھی نہ کہیں تو بہتر ہے ابتدائے اسلام میں مہمان کو یہ حق تھا کہ اگر میزبان کھلانے پلانے میں کمی کرے تو اس کی جو چیز چاہے

اٹھا کر لے کر چلا جائے اس میں میزبان کی اجازت شرط نہیں تھی مگر مہمان نوازی لوگوں کے قلوب میں راسخ ہوگئی اور لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچان گئے تو یہ حکم منسوخ ہوگیا۔

دو حدیثوں میں تعارض کا سوال و جواب

ایک صاحب نے سوال کیا کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بعض صحابہ کو بغیر دعوت کے اپنے ساتھ لے جاتے تھے جیسا کہ قصہ حضرت انسؓ میں گزر چکا اور حدیث میں یہ بھی ہے کہ جو شخص کسی کی دعوت میں بغیر اجازت طفیلی بن کر جاتا ہے تو وہ چور بن کر گیا اور ڈاکو بن کر آیا تو ایک حدیث عملی سے تو معلوم ہوا کہ کسی طفیلی کو دعوت میں لے جا سکتے ہیں اور دوسری حدیث قولی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نہ کوئی طفیلی بن کر جا سکتا ہے اور نہ کوئی طفیلی کو لے جا سکتا ہے میزبان کی اجازت شرط ہے تو دونوں حدیثوں میں بظاہر تعارض ہے حضرت حکیم الاسلام رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ حکم ہر جگہ کے لیے نہیں ہے اور نہ ہر شخص کے لیے ہے بلکہ اس میں تفصیل ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر کسی دوست سے بے تکلفی ہو اور ظن غالب ہو کہ کسی اجنبی کو ساتھ لے جانے سے ہمارا دوست ناخوش نہیں ہوگا بلکہ خوش ہوگا تو ایسے دوست کے یہاں کسی اجنبی کو لے جانا جائز ہے یا ایسے لوگوں کے پاس کسی اجنبی کو لے جانا جائز ہے جن کے بارے میں یہاں تک اجازت ہے کہ ان کے گھر جا کر فرمائش کرو کہ ہم کچھ کھانا چاہتے ہیں اور اس سے تعلق میں اضافہ بھی ہو جیسے کہ قرآن شریف میں مخصوص عزیزداریاں مقرر کی گئی ہیں حق تعالیٰ نے فرمایا۔ لَيْسَ عَلَى الْأَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْأَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيضِ

حَرَجٌ وَّلَا عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَنْ تَاْكُلُوْا مِنْ بُيُوْتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اٰبَآئِكُمْ
اَوْ بُيُوْتِ اُمَّهٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اِخْوَانِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخَوٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ
اَوْ بُيُوْتِ اَعْمَامِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ عَمّٰتِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ اَخْوَالِكُمْ اَوْ بُيُوْتِ خٰلٰتِكُمْ
اَوْ مَا مَلَكْتُمْ مَّفَاتِحَهٗٓ اَوْ صَدِيْقِكُمْ ط لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَاْكُلُوْا جَمِيْعًا اَوْ اَشْتَاتًا

یعنی تمہارے لیے کوئی حرج نہیں کہ تم اپنے گھر یا اپنے باپ کے گھر یا اپنی ماں کے گھر یا اپنے بھائیوں کے گھر یا بہنوں کے گھر یا اپنی پھوپھیوں کے گھر یا خالہ کے گھر یا اس کے گھر جس کے تم مالک ہو یا اپنے دوستوں کے گھر جاؤ اور جا کر فرمائش کرو کہ ہم کھانا کھائیں گے ظاہر ہے کہ جب ایسے عزیز واقربا جن کے اوپر اعتماد ہو اور ان کا گھر اپنا ہی گھر ہو اور وہ خود جانے اور فرمائش کرنے یا کسی کے لے جانے سے خوش ہوتے ہوں تو وہاں پر میزبان کی اجازت کے بغیر بھی کسی اجنبی کو طفیلی بنا کر لے جانا جائز ہے البتہ اگر کسی شخص نے آپ کی دعوت کر دی جس سے نہ کوئی دوستانہ تعلق ہے اور نہ کوئی خاص بے تکلفی ہے بلکہ اتفاقی طور پر اس نے دعوت کر دی۔ ظاہر ہے ایسے شخص کو طبعی طور پر دوسروں کو دیکھ کر گرانی معلوم ہوگی لہٰذا ایسے شخص کے گھر طفیلی بن کر جانا اور لے جانا جائز نہ ہوگا لہٰذا دونوں حدیثوں میں کوئی تعارض نہ رہا۔

افغانستان والوں کی مہمان نوازی

افغانستان میں مہمان نوازی کا ذوق بہت زیادہ ہے چالیس سال پہلے کی بات ہے کہ وہاں کا یہ عام دستور تھا کہ ایک بیک دس بیس آدمی کسی کے گھر آجاتے تو فوراً ان کے لیے کھانا تیار کراتے اور ان کا اکرام کرتے پھر کل کو دوسرے کے گھر دس بیس

آدمی پہونچ جاتے تو میزبان خوش ہوتا اور آمدید کہتا اور کھانا تیار کراتا اور سارا انتظام کرتا پھر تیسرے دن تیسرے کے گھر دس بیس آدمی چلے گئے تو وہاں پر دعوت کی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی کیونکہ وہاں کا بھی عام دستور تھا کہ ہر گھر میں دس بیس آدمی کے کھانے کا انتظام رہتا اگر باہر کا کوئی آدمی بستر ساتھ لے جاتا تو وہ بڑا مانتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ کوئی سرائے ہے کہ بستر ساتھ لے کر آتے ہو آپ ہمارے مہمان ہیں کیا ہم کو یہ بھی توفیق نہیں کہ بستر پیش کریں ایسے ان کے یہاں دس بیس آدمی کے لیے ہر وقت گدے اور تکیے اور لحاف وغیرہ کا انتظام رہتا تھا۔ ان کے یہاں مہمان نوازی اتنی اہم تھی کہ دعوت کی بھی ضرورت نہیں پڑتی تھی بہرحال یہ تو ایک عام دستور کی بات ہے لیکن جہاں اہل اللہ کا یہ عمل دیکھا گیا کہ وہ اپنے ساتھ دس بیس آدمی لے کر گئے اس میں یہ قید اور شرط ہے کہ اس شخص سے اتنی بے تکلفی ہو کہ جس طرح اپنے گھر میں حق ہوتا ہے اسی طرح اس پر بھی ہو اور وہ اس عمل سے خوش ہو اور اس کا قرینہ اس آیت میں تلایا گیا ہے کہ کون کون لوگ ہیں کہ جن کے پاس جا کر بلا تکلف کھانے کی درخواست کر سکتے ہو رہا غلام یا باندی کے گھر جانا ظاہر ہے کہ اگر آقا خود باندی یا غلام کے گھر جائے تو ان کے لیے خوشی اور فخر کی بات ہو گی کہ ہمارا آقا خود ہمارے گھر آئے ہیں۔

مجلس ۳۱

قیامت کی سخت گھڑیاں اور شاہ ولایت کی تحقیق اور زیارت قبور کے سلسلے میں اہم بیانات

سوال: آپ نے ایک مجلس میں بیان فرمایا تھا کہ قیامت کے ایک دن میں چار وقت ایسے بھی آئیں گے کہ کوئی کسی کا پرسان حال نہ ہوگا چونکہ وہ مجلس قلم بند نہیں ہو سکی تھی اس لیے حضور والا اگر دوبارہ بیان فرما دیں تو بہتر ہوگا۔

حضرت حکیم الاسلامؒ نے فرمایا کہ صحابہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا قیامت کے دن کوئی ایسا بھی وقت آئے گا کہ کوئی کسی کا پرسان حال نہ ہوگا آپ نے فرمایا کہ ہاں چار وقت ایسے آئیں گے کہ کوئی کسی کا پرسانِ حال نہ ہوگا ایک تو وہ وقت ہوگا کہ حضرت آدم علیہ السلام سے حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ جنت اور دوزخ کے لیے اپنی اولاد میں سے آپ افراد دیں حضرت آدم علیہ السلام عرض کریں گے کہ کتنے افراد دوں اور کس طرح دوں تو حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ ایک ہزار میں نوسو ننانوے ۹۹۹ لے دوزخ کے لیے اور ایک جنت کے لیے۔ جب محشر میں یہ خبر پہونچے گی تو سب کے دل دہل جائیں گے اور لوگوں کو ایسی کیفیت ہوگی کہ اس وقت کوئی کسی کا پرسان حال نہ ہوگا ایک عجیب قسم کا لوگوں میں آہ و بُکا ہوگا۔ دوسرا وقت وہ ہوگا کہ جہنم آواز دے گا اس کی آواز میں چنگھاڑ

ہو گی اور وہ محشر میں گونجے گی اس کی دہل اتنی خطرناک ہو گی کہ لوگوں کے دل اچھل کر گلے تک آجائیں گے اس وقت سب پریشاں حال ہوں گے اور کوئی کسی کا پرسان حال نہ ہو گا اور تیسرا وقت وہ ہو گا کہ جہنم کے بارے میں حق تعالیٰ ارشاد فرمائیں گے کہ اس کو نیچے سے اوپر لاؤ کیونکہ جہنم تحت الثریٰ میں ہے اور جنت اوپر ہے تو فرشتے حکم خداوندی کے مطابق جنت کو اوپر سے نیچے لائیں گے اور جہنم کو نیچے سے اوپر لائیں گے یعنی میدان محشر میں دونوں کو آمنے سامنے کریں گے حدیث میں ہے کہ جہنم کی ستر ہزار باگیں ہوں گی اور ہر ایک باگ پر ستر ہزار فرشتے لپٹے ہوئے ہوں گے اور مضبوطی سے اس کو تھامے ہوں گے مگر جہنم کے اندر ایک عجیب قسم کا جوش اور غیض ہو گا بڑی مشکل سے فرشتے روک سکیں گے تَكَادُ تَمَيَّزُ مِنَ الْغَيْظِ ط... اس وقت ایسا معلوم ہو گا کہ جہنم غیض سے پھٹ رہا ہے مگر ملائکہ اس کو روکے ہوئے ہوں گے مگر ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ وہ ملائکہ کے ہاتھ سے چھوٹ جائے گا جب یہ خبر محشر میں پہونچے گی کہ جہنم ملائکہ کے ہاتھ سے چھوٹ گیا ہے وہ اس کو روکنے سے عاجز ہو گئے ہیں اور وہ آرہا ہے تو اس وقت انتہائی آہ وبکا وکرب کا عالم ہو گا اس وقت بھی کوئی کسی کا پرسان حال نہ ہو گا اور چوتھا وقت وہ ہے کہ جہنم میدان محشر میں پہونچ کر آواز دے گا کہ مجھے انتقام لینا ہے اس شخص سے جو دنیا میں متکبر اور معاند تھا اور کسی کو اپنا ہم پلہ نہیں سمجھتا تھا اور مجھے بدلہ لینا ہے ایسے شخص سے جو دنیا میں شیخی کرتا تھا اور دھوکہ باز تھا اور فخر کرنے والا تھا اس وقت جہنم کے اندر ایسی چنگھاڑ ہو گی کہ لوگ گھٹنوں کے بل گر پڑیں گے اس وقت لوگ پریشان حال ہوں گے کوئی

کسی کا پُرسان حال نہ ہوگا ایک ہی دن میں یہ چار حادثے پیش آئیں گے۔
لوگوں کی گھبراہٹ کا عجیب عالم ہوگا حضرت مسیح علیہ السلام کی حالت یہ ہوگی کہ گھبراہٹ اور لرزاہٹ میں کہیں گے کہ میں مریم کے بارے میں کچھ نہیں کہنا چاہتا وہ کہیں جائے نفسی نفسی یعنی میرا نفس میرا نفس یہی سب کی صدا ہوگی صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیں گے یَا رَبِّ اُمَّتِیْ اُمَّتِیْ اے اللہ میری امت پر رحم فرما۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ سبھی حضرات اپنے آپ کو بچانے کی فکر کریں گے یہ واقعہ حساب وکتاب سے پہلے ہوگا۔
اللہ تعالیٰ حضرت آدم علیہ السلام سے فرمائیں گے کہ اپنی اولاد میں ان لوگوں کو چنو جن سے حساب وکتاب ہوگا حدیث شریف میں ہے کہ کفار سے حساب وکتاب نہیں ہوگا کیونکہ حساب وکتاب ان لوگوں سے ہوگا جن کے اندر اعمال صالحہ اور غیر صالحہ دونوں ہوں گے ظاہر ہے کہ کفر کی حالت میں اعمال صالحہ معتبر نہیں اس لیے کفار کی نجات نہیں ہوگی حساب تو اعمال ہی کے سلسلے میں ہوگا اور اس کا تعلق ایمان سے ہے کفر سے نہیں ہے اس لیے ان سے حساب وکتاب نہ ہوگا بلکہ سب کے سب دوزخ میں ڈال دیئے جائیں گے حدیث شریف میں ہے کہ جہنم سے ایک گردن نکلے گی اور وہ لوگوں کو اس طرح چُگنا شروع کرے گی جیسے چیل چڑیا مرغی کے بچوں کو چوگا کرتی ہے تو حساب وکتاب مومن سے ہوگا کیونکہ اس کے اندر اعمال صالحہ اور غیر صالحہ دونوں موجود ہیں حق تعالیٰ نے جو یہ فرمایا ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا
یعنی ہم نے وارث بنایا کتاب کا ان لوگوں کو جن کو ہم نے منتخب کیا ہے ان سے مراد امت محمدیہ ہے تو گیا قیامت کے دن امت محمدیہ میں تین

قسم کے لوگ ہوں گے جن کے بارے میں فرمایا گیا ہے
یعنی ان میں بعض لوگ وہ ہوں گے جن پر معاصی کا غلبہ ہو گا وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ ط اوران میں بعض لوگ وہ ہوں گے جن کا معاملہ برابر سرابر ہو گا۔ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ بِإِذْنِ اللهِ ط ...اوران میں بعض وہ ہوں گے کہ جن کے پاس حسنات ہی حسنات ہوں گے ان لوگوں کے بارے میں ابن عباس نے اس طرح تفسیر فرمائی ہے فَظَالِمُنَا فَمَغْفُورٌ لَهُ ط یعنی ان سے جو لوگ ظالم ہیں یعنی ان کی بُرائیاں ان کی نیکیوں پر غالب ہیں توان کی مغفرت کی جائے گی خواہ وہ مغفرت فضل خداوندی سے ہو یا شفاعت سے ہو یا کچھ سزا دے کر ہو بہر صورت ان کی مغفرت کی جائے گی اور جو لوگ مقتصد ہوں گے يُحَاسَبُ حِسَابًا يَسِيرًا ط یعنی ان سے حساب لیا جائے گا مگر ان کا حساب بہت آسان ہو گا یعنی ان کی پیشی تو ہو جائے گی مگر بہت چھان بین نہیں کی جائے گی آسان حساب لے کر ان کو چھوڑ دیا جائے گا وَأَمَّا السَّابِقُونَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ بِغَيْرِ حِسَابٍ ط وہ لوگ جو سابق بالخیرات ہوں گے یعنی ان کی نیکیاں بڑھی ہوں گی وہ حضرات بغیر حساب و کتاب کے جنت میں داخل کئے جائیں گے یہ تین قسم کے لوگ ہوں گے مگر یہ حساب و کتاب کا معاملہ اس حادثہ عظیم کے بعد شروع ہو گا جنت کا داخلہ بیک وقت نہیں ہو گا بلکہ تدریجاً ہو گا بہت سے حضرات بغیر حساب و کتاب کے جنت میں داخل کر دیئے جائیں گے اور وہ اس قدر مگن اور مطمئن ہوں گے کہ آپس میں مشورے کریں گے کہ چلو حساب و کتاب کا میدان دیکھیں وہاں کیا ہو رہا ہے۔

دعوت خصوصی اور اسلام میں پردہ کی وجہ

سائل نے سوال کیا کہ حق تعالیٰ اہل جنت کی دعوت کریں گے مگر اس دعوت میں صرف مرد ہی جائیں گے اس دعوت خاص میں مردوں کی تخصیص کی وجہ کیا ہے جب کہ جنت میں مرد وعورت کے اختلاط سے کسی قسم کی معصیت کا خطرہ بالکل نہ ہوگا حضرت حکیم الاسلامؒ نے فرمایا کہ غالباً آپ یہ سمجھے ہوتے ہیں کہ مرد وعورت کا اختلاط صرف معصیت کی وجہ سے ناپسند کیا گیا ہے حالانکہ عورت ہی فی نفسہٖ اس کی مقتضی ہے کہ وہ مردوں سے الگ تھلگ رہے چاہے کوئی بھی معصیت کا خطرہ نہ ہو جیسے ازواج مطہرات اور ازواج صحابہؓ بحمد اللہ یہ سب کی سب اولیاء کاملین میں سے تھیں وہاں پر تو کسی معصیت کا خطرہ ہی نہیں تھا مگر اس کے باوجود پردے کی آیت نازل ہوئی اور خصوصیت کے ساتھ ازواج مطہرات کے لیے پردے کی تاکید کی گئی مگر یہ تاکید اس بنا پر نہیں کی گئی کہ ان پر اعتماد نہیں تھا کہ وہ کہیں مبتلا نہ ہو جائیں بلکہ اس لیے کی گئی کہ عورت کی حرمت ہی فی نفسہٖ تقاضہ کرتی ہے کہ وہ اپنے مقام پر رہے عورت چاہے اتقیا یا اولیاء کے مجمع میں جاتے مگر پھر بھی منہ چھپا کر جائے گی یہ اس لیے نہیں ہے کہ اس میں خطرہ ہے بلکہ عورت کی طبیعت کا فطری تقاضہ یہی ہے کہ وہ مردوں سے الگ تھلگ رہے۔

علی گڑھ یونیورسٹی میں میری تقریر تھی جب میں اسٹیج پر پہونچا تو بہت سی عورتیں ہمارے سامنے بلا پردہ کے بیٹھی ہوئی تھیں میں پیچھے ہٹنے لگا انھوں نے کہا کہ آئیے میں نے کہا کہ پہلے پردہ ڈالو پھر آؤں گا خیر پردہ لٹکا دیا گیا تو میں گیا جب میں تقریر کرنے کے لیے بیٹھا تو عورتوں نے کہا کہ اگر ہم

درمیان تقریر سوال کریں تو کیا جواب دیا جائے گا میں نے کہا کہ درمیان تقریر اجازت نہیں ہے البتہ جو سوالات ذہن میں آئیں ان کو لکھ لو تقریر کے بعد جواب دیا جائے گا چنانچہ تقریر کے بعد پچاس ساٹھ سوالات آئے ان میں ایک سوال یہ بھی تھا کہ عورتوں کو بلاوجہ گھروں کا مقید کیا گیا ہے اور ان کے لیے حکم یہ ہے کہ ہر وقت منہ چھپائے رکھیں اس سے ایک نقصان تو یہ ہے کہ اَلْاِنْسَانُ حَرِیْصٌ فِیْمَا مُنِعَ .... یعنی انسان جس چیز سے روکا جاتا ہے وہ اس کا حریص ہو جاتا ہے اور دوسرا نقصان یہ ہے کہ اس پردے کی وجہ سے عورتیں گھروں میں گھونٹتی ہیں باہر کی ہواؤں سے بھی محروم ہوگئیں اور ان کی صحت بھی خراب ہوگئی اور تیسری خرابی یہ ہے کہ اس پردے کی وجہ سے وہ عورتیں تعلیم سے بھی محروم ہوگئیں گھروں میں رہ کر مکمل تعلیم نہیں ہو سکتی لہذا ان کو کھلے بندوں چھوڑ دینا چاہیئے تاکہ ان کی حرص ختم ہو اور تازہ ہواؤں سے فائدہ اٹھائیں اور آزادی سے تعلیم حاصل کریں۔

میں نے ان سے کہا کہ پہلے الزامی جواب سن لو پھر تحقیقی جواب دوں گا الزامی جواب یہ ہے کہ دنیا میں دو ہی چیزیں عام طور پر چھپانے کی رکھی گئی ہیں ایک دولت دوسری عورت اگر دولت کے چھپانے سے چوروں کی حرص بڑھتی ہے تو میں کہتا ہوں کہ آپ لوگ دولت کو بینکوں سے نکال کر سڑکوں پر ڈال دیں تاکہ چوروں کی حرص ختم ہو جاتے اور ان کے دلوں میں خوب سیری ہو جاتے اس طرح کرنے سے اگر آپ کی دولت محفوظ رہی تو میں فتویٰ دوں گا کہ عورتیں بھی کھلے بندوں میں آجائیں اور اگر دولت رات ہی رات صاف ہوگئی تو میں عورتوں کو وہی حکم دوں گا جو دولت کی چھپانے

کے بارے میں دیتا ہوں میں نے کہا کہ چوروں کا خطرہ تو الگ ہے مگر دولت فی نفسہ ایسی چیز نہیں ہے جو منظر عام پر لائی جاتے اور سڑکوں پر پھیلا دی جاتے اور یہ جتلایا جاتے کہ میں لکھ پتی یا کروڑ پتی ہوں بلکہ وہ چھپانے کی چیز ہے اسی لیے اس کو چھپایا جاتا ہے اسی طرح عورت ہے اس کی حرمت کا تقاضہ یہی ہے کہ وہ مردوں سے الگ ہو کر پردے میں رہے جنت تو دار المتقین ہے وہاں پر معصیت کا کوئی خطرہ نہیں ہے مگر پھر بھی مرد و عورت کا اختلاط نہیں ہوگا اسی لیے دعوت خصوصی میں صرف مرد ہی حضرات بلاتے جائیں گے تو یہ خصوصیت خطرہ معصیت کی وجہ سے نہیں ہوگی بلکہ عورت کی حرمت کا تقاضہ یہی ہے کہ اس کو مردوں سے الگ رکھا جاتے مگر شریعت نے ان کی دل شکنی نہیں کی اور کلیتہً ان کو الگ نہیں رکھا بلکہ صرف غیر محرم سے الگ رکھا ہے اسی طرح جنت میں بھی ان کی دل شکنی نہیں ہوگی کیونکہ اس دعوت خصوصی میں جو سب سے اہم دولت ملنے والی ہوگی وہ دیدار خداوندی ہوگی حدیث شریف میں آتا ہے کہ حق تعالیٰ کی زیارت سے لوگوں کے چہرے منور ہو جائیں گے اور حسن و جمال میں ہزاروں گنا اضافہ ہوگا جب مرد حضرات دیدار کر کے اپنی اپنی جنتوں میں واپس آئیں گے تو ان کی عورتیں کہیں گی کہ آج تو تمہارا حسن و جمال تو ہزاروں گنا بڑھا ہوا ہے اس کی وجہ کیا ہے وہ کہیں گے کہ آج ہم حق تعالیٰ کی زیارت کر کے آتے ہیں مگر ہم دیکھ رہے ہیں کہ تمہارا حسن و جمال بھی پہلے سے ہزاروں گنا بڑھا ہوا ہے اس کی وجہ کیا ہے تو وہ کہیں گی کہ حق تعالیٰ یہاں پر خود آکر زیارت کرا کے گئے ہیں تو حق تعالیٰ مردوں کو بلا کر زیارت کرائیں گے اور عورتوں کے پاس خود آکر ان کو زیارت کرائیں گے یعنی تجلیات الٰہی

وہاں پر پہونچے گی تو عورتوں کے دل میں جو وسوسہ پیدا ہوتا کہ حق تعالی نے تو مردوں کو بلا کر زیارت کرادی مگر ہم زیارت سے محروم رہیں تو حق تعالی اس وسوسے کو دور کرنے کے لیے جنت میں خود آکر عورتوں کو زیارت کرائیں گے لہذا جب دونوں کا مقصد حل ہوگا تو کوئی اشکال نہیں مگر عدم اختلاط کی بنا معصیت کا خطرہ نہیں ہے بلکہ ان کی فطرت کو باقی رکھنے کے لیے حق تعالی نے ان کو مردوں سے الگ رکھا ہے چونکہ عورت کی فطرت میں حیا ہے اس لیے وہ مردوں سے طبعی طور پر منھ چھپاتی ہیں اور یہ واقعہ ہے کہ اگر عورت میں خود فحش نہ ہو تو مردوں کی مجال نہیں کہ ان پر ہاتھ ڈالدیں جب کوئی مرد کسی عورت کے اندر لوچ دیکھتا ہے تب ہی اس کی طرف مائل ہوتا ہے۔

بہرحال جنت میں پردے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی کیونکہ جس طرح مردوں کے مجامع ہوں گے اسی طرح عورتوں کے مجامع بھی مردوں سے الگ ہوں گے اختلاط کی شکل نہ ہوگی۔

عورتوں کے سوال کا تحقیقی جواب

حضرت نے فرمایا کہ ان کے سوال کا تحقیقی جواب ہم نے یہ دیا کہ تم لوگ یہ کہتی ہو کہ عورتوں کو گھونٹ دیا گیا وہ تعلیم سے محروم ہوگئیں اور تازہ ہواؤں سے بھی محروم ہوگئیں اور ان کی صحت خراب ہوگئی اور تم نے جو یہ کہا کہ اَلْاِنْسَانُ حَرِیْصٌ فِیْمَا مُنِعَ . . یہ اس وقت ہے جب کہ کلیۃً عورتوں کو مردوں سے ملنے کو روک دیا جائے حالانکہ کلی طور پر نہیں روکا گیا ہے بلکہ اسلام نے یہ حکم دیا کہ نکاح کے ذریعہ سامنے آؤ اور ملو بغیر نکاح کے نہ ملو تو اسلام نے ایک راستہ یعنی بذریعہ نکاح ملنے

کا راستہ کھول دیا اور ایک راستہ بغیر نکاح کے بند کر دیا گیا پھر ادھر محرمات ابدیہ سے بھی پردہ کا حکم نہیں دیا گیا البتہ محلات سے پردہ کروایا تو ایک نوع کے ملنے اور ان کے سامنے آنے کی اجازت دیدی گئی اور ایک نوع کے ملنے اور سامنے آنے سے روک دیا لہذا جب اس کا بدل سامنے رکھ دیا تو اب حرص کا کوئی سوال ہی نہیں اگر کلی طور پر مردوں سے ملنے اور سامنے آنے سے روکا جاتا تو حرص ترقی کر سکتی تھی مگر اسلام نے حرص کا دروازہ ہی بند کر دیا جتنے مرد ہیں تقریباً اتنی ہی عورتیں بھی ہیں اور مان لیجئے کہ عورتیں زائد بھی ہوں تو چار عورتوں سے نکاح کرنے کی اجازت دیدی گئی لہذا اس کی ضرورت ہی نہیں رہے گی کہ وہ مردوں سے کلی طور پر الگ تھلگ رہیں رہا یہ سوال کہ پردے میں رہنے سے صحت خراب ہو جاتی ہے تو گھر یہ پنجرا ہے رات کو تو اسی میں ہم بھی رہتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ آدھی زندگی اس پنجڑے میں گزرتی ہے اور آدھی زندگی باہر گزرتی ہے مرد آٹھ بجے کام پر جاتا ہے اور چار بجے واپس آجاتا ہے تو آدھی زندگی میں بھی کٹوتی ہو گئی تو مردوں کے عمر کا زیادہ حصہ گھر ہی کے پنجڑے میں گزرتا ہے اور تھوڑا حصہ باہر گزرتا ہے تو گھر میں رہنے سے اگر صحت خراب ہو جایا کرتی تو پھر مردوں کی بھی صحت خراب ہونی چاہئے لہذا یہ سوال ہی غلط ہے کہ پردے میں رہنے سے صحت خراب ہو جاتی ہے پھر میں نے ان سے خود سوال کیا کہ تمہارے نزدیک عورتوں کی صحت کب سے خراب ہو گئی ہے انھوں نے کہا کہ پچاس ساٹھ سال سے عورتیں بہت کمزور ہو گئی ہیں میں نے کہا پچاس ساٹھ سال پہلے پردے کی شدت تھی اب تو خفت ہو گئی ہے تو معلوم ہوا کہ پردہ ہی ذریعہ تھا ان کی صحت کا اصول تو یہ ہونا چاہیے

کہ اس زمانے میں عورتوں کی صحت خراب ہونی چاہیئے تھی اس زمانے میں پردہ کی شدت تھی اوراس زمانے کی عورتوں کی صحت اچھی ہونی چاہیئے کیونکہ اب پردے کی خفت ہوگئی ہے مگراب تو الٹا ہی نتیجہ نکل رہا ہے اور معلوم ہورہا ہے کہ پردہ ہی ذریعہ ہے صحت کا اور بے پردگی ذریعہ ہے صحت کی خرابی کا میں نے کہا کہ بیمار رہنے کی وجہ پردہ نہیں ہے بلکہ تمدن کی خرابی ہے غذائیں بھی خراب اور دوائیں بھی خراب اور ماحول بھی خراب اور ہر وقت چیزوں کو کھانا یہی صحت کی خرابی کی بنا ہے ورنہ منہ چھپانے سے اگر صحت خراب ہوا کرتی تو سردی کے زمانے میں ہر مرد بیمار ہوا کرتا کیونکہ لحاف کے اندر سب ہی منہ چھپائے رہتے ہیں مگر منہ چھپانے سے بیمار نہیں ہوتے تو معلوم ہوا کہ منہ چھپانا صحت کی خرابی کی وجہ نہیں ہے۔ رہا تیسرا سوال کہ تعلیم میں کمی ہوگی۔ اور تعلیم کی کمی کا سبب پردہ ہے تو میں نے کہا کہ پرانے زمانے کی عورتیں جو پردہ نشین تھیں اگر ان کے حالات زندگی کا مطالعہ کرو تو ان میں تعلیم بھی زیادہ معلوم ہوگی کیونکہ صحابیہؓ اور تابعین اور تبع تابعین کی عورتوں میں محدثات بھی تھیں اور فقیہات بھی تھیں متکلم اور صوفیہ بھی تھیں ان کے متعلق بڑی بڑی کتابیں بھی لکھی گئیں ہیں آج کل کی عورتوں میں وہ چیزیں نہیں ہیں جو ان میں تھیں تو کیا وہ عورتیں بے پردگی میں یہ تعلیم و تربیت پاتی تھیں ہرگز نہیں بلکہ وہ پردہ ہی میں رہ کر یہ تعلیم و تربیت پائی تھیں رہی خاص تعلیم جو بغیر اسکول جائے ہوئے حاصل نہیں ہوتی میں کہتا ہوں کہ اس خاص تعلیم کی ضرورت ہی کیا ہے عورتوں کا یہ کام ہی نہیں ہے کہ وہ دفتروں میں جا کر کلرک بنیں یا ریلوے میں جا کر ٹکٹ ماسٹر یا گارڈ بنیں یا فوجوں میں جا کر چیف کمانڈر بنیں یہ عورتوں کے

فرائض نہیں ہیں لہذا اس کی تعلیم دینا بھی غیر ضروری ہے لہذا غیر ضروری چیز کی وجہ سے ضروری چیز کو ختم کر دینا یہ کون سی عقل مندی ہے

عورتوں کے لیے گھریلو تعلیم کا حکم

اور جو ضروری تعلیم ہے یعنی گھریلو تعلیم مثلاً مسائل کی تعلیم اور قرآن شریف کی تعلیم اس کے لیے بے پردگی ضروری نہیں ہے بلکہ یہ تو گھروں میں رہ کر بھی حاصل ہو جاتی ہے اسی واسطے ازواج مطہرات کے بارے میں قرآن شریف میں فرمایا گیا وَاذْکُرْنَ مَا یُتْلٰی فِیْ بُیُوْتِکُنَّ ۔ ترجمہ: یعنی یاد کرو تم ان حکمتوں کو جو گھروں میں تم کو نبوت کی تعلیم دی جاتی ہے اس سے معلوم ہوا کہ جو تعلیم مقصود ہے وہ گھروں میں رہ کر بھی حاصل ہو سکتی ہے اور جو تعلیم گھروں سے نکل کر باہر حاصل ہو وہ ضروری نہیں ہے تو غیر ضروری کی وجہ سے ضروری کیسے ترک کریں گے مطلب یہ ہے کہ پردہ کا ہونا اور مردوں سے اختلاط نہ ہونا اس کی بنا معصیت نہیں ہے بلکہ عورت کی حرمت کا یہی تقاضہ ہے کہ وہ مردوں سے الگ رہے بعض چیزیں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ آپ مردوں کو بھی وہاں جانے سے روکتے ہیں مثلاً وہاں کا ماحول اچھا نہیں سوسائٹی خراب ہے اس لیے وہاں پر مت جاؤ اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ اس اختلاط کو معصیت ہی کی وجہ سے روکا جاتا ہے بلکہ ہر دائرے کا ایک طبعی تقاضہ ہوتا ہے اس کی وجہ سے روکتے ہیں کہ تمہارے موضوع کا وہ کام نہیں ہے بلکہ جو کام تمہارے موضوع کا ہے اس میں لگو اسی طرح عورت کا بھی ایک تقاضہ ہے کہ وہ مردوں سے الگ رہے حق تعالیٰ سبحانہٗ نے زندگی کے دو حصے کر دیا ہے ایک گھریلو زندگی اور ایک باہر کی زندگی تو باہر کی زندگی کا ذمہ دار مردوں کو بنایا ہے

اور گھریلو زندگی کا عورتوں کو ذمہ دار قرار دیا ہے تو مرد کا یہ کام نہیں ہے کہ گھر میں بیٹھ کر کھانا پکائے اور بچوں کو دودھ پلائے اور ان کی پرورش کرے یہ تو عورتوں کا کام ہے اور مرد کا کام یہ ہے کہ باہر جائے اور کمائے اور ذریعہ معاش پیدا کرے اور عورتوں و بچوں کے نان و نفقہ کا انتظام کرے اگر عورتوں کو باہر کی زندگی میں لگاؤ تو گھریلو زندگی کا کیا حال ہوگا اسی طرح اگر مردوں کو گھریلو زندگی میں پھانس دو تو باہر کی زندگی کا کیا حال ہوگا اگر ایسا کر دیا گیا تو جو فطری نظام بنا ہوا ہے وہ درہم برہم ہو جائے گا اس لیے مرد و عورت ہر ایک اپنے دائرے میں رہ کر کام کریں تبھی فطری نظام درست ہو سکتا ہے۔

جنّت کی بہاریں

سائل نے سوال کیا کہ کیا جنت میں ایک دوسرے سے آپس میں ملاقاتیں بھی ہوں گی حضرت نے فرمایا کہ جنت میں مجالس بھی ہوں گی اور محفلیں بھی ہوں گی اور احادیث میں ہے کہ حق تعالیٰ نے جنت میں بڑے بڑے بازار بنایا ہے اور ان میں دوکانیں بھی ہیں ان دوکانوں پر ملائکہ علیہم السلام بیٹھے ہوں گے جنت میں بہترین خوشنما باغات بھی بنائے گئے ہیں اوپر والے نیچے آئیں گے اور نیچے والے اوپر جائینگے اور لوگوں میں ملاقاتیں ہوں گی اگر ایک شخص اونچے درجہ کا ہے اور ایک نیچے درجہ کا ہے تو ان میں ہمیشہ بُعد رہنا بھی انسان کی طبیعت پر شاق ہوتا ہے اس لیے جنت میں ان کو مواقع دیئے جائیں گے کہ ایک دوسرے سے ملتے رہیں اوپر والے وہاں کے تحفے نیچے والوں کے لیے لائیں گے اور نیچے والے یہاں کے تحفے اوپر والوں کے لیے لے جائیں گے اور میل ملاپ بار بار ہوگا اور اگر کوئی جگری عزیز ہے اور اس کے ساتھ ہی رہنا چاہتا ہے مگر وہ اوپر ہے اور یہ نیچے ہے مگر اس کے دل میں یہ احساس ہے کہ وہ ہمارے قریب ہی

آجائے تو حق تعالیٰ اس کو ترقی دے کر اوپر پہونچا دیں گے تاکہ آپس میں بُعد نہ رہے جیسا کہ حق تعالیٰ سبحانہٗ نے فرمایا وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّیَّتُهُمْ بِاِیْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ ترجمہ:۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد نے ان کی اتباع کی ایمان لانے میں ہم اُن کے ساتھ ان کی اولاد کو ملا دیا۔

پھر عزیز و اقربا ایک ہی جگہ ہو جائیں گے یہ تو جنت کی بات ہے میں تو کہتا ہوں کہ عالم برزخ میں بھی اس کی رعایت رکھی گئی ہے جب مرنے والا وہاں پہونچتا ہے تو اس کے قریبی رشتہ داروں کو اطلاع دی جاتی ہے وہ اس کے استقبال کے لیے آتے ہیں اور دنیا کے حالات معلوم کرتے ہیں تو برزخ میں بھی میل ملاپ رکھا گیا ہے جنت میں ہر فطری جذبہ کا سامان رکھا گیا ہے اسی لیے جنت کے بازاروں میں بہت سے اعلیٰ قسم کے سامان ہوں گے ان میں خوبصورت خوبصورت عورتوں کی تصویریں بھی ہوں گی وہ صورتیں انتہائی حسن و جمال کی پیکر ہوں گی ان تصویروں کو جنت کے لوگ خریدیں گے ان کی قیمت کیا ہوگی تو کسی کی قیمت الحمدللہ اور کسی کی قیمت سبحان اللہ اور کسی کی قیمت اللہ اکبر ہوگی وغیرہ وغیرہ جب ان تصویروں کو خرید کر لوگ اپنی جنتوں میں لائیں گے تو اس قسم کی عورت گھر میں پہلے ہی سے موجود ہوگی اس کو دیکھ کر جنتی لوگ خوش ہوں گے ان کے علاوہ جنت میں وہ چیزیں ملیں گی جن کے بارے میں فرمایا گیا مَالَا عَیْنٌ رَأَتْ وَمَالَا اُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰی قَلْبِ بَشَرٍ یعنی جنت میں وہ چیزیں ملیں گی کہ نہ کسی آنکھ نے دیکھی ہوگی اور نہ کسی کان نے سنا ہوگا اور نہ کسی انسان کے قلب پر اس کا خطرہ ہی گزرا ہوگا بہرحال

بہر حال وہ عالم اس عالم سے بالاتر ہے ہمارا دل تو اسی دنیا کے آب وگل کے متعلق سوچ سکتا ہے مگر چونکہ وہ عالم فہم سے بالاتر ہے اس لیے وہاں کی باتیں سوچ ہی نہیں سکتا۔

شاہ ولایت کی تحقیق

یہ شاہ ولایت جن کا مزار دار جدید کے عقب میں ہے یہ تو ہمارے اکابرین میں سے ہیں مگر ان کی کوئی سوانح حیات نہیں ملتی اگر حضور والا کو ان کے متعلق کچھ معلومات ہوں تو ارشاد فرمادیں۔

حضرت حکیم الاسلامؒ نے فرمایا کہ جتنے اہل اللہ ہیں سبھی ہمارے اکابرین میں سے ہیں مگر یہ شاہ ولایت کون تھے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ عہدہ ہے کوئی نام نہیں ہے کیونکہ شاہ ولایت بہت سی جگہوں پر ہیں اور ان کے بہت سے مزارات بھی ہیں اس لیے اس کی وجہ یہی سمجھ میں آتی ہے کہ اہل اللہ کا یہ اصول تھا کہ جب سال یا دو سال میں کسی شیخ کے پاس جمع ہوتے تھے تو وہ تبلیغ اسلام کے لیے بانٹے جاتے تھے کہ تم فلاں جگہ پر جاکر تبلیغ کرو اور تم فلاں جگہ پر جاکر تبلیغ کرو۔ جیسے حضرت سلطان جی رحمۃ اللہ علیہ کے نوسو خلفا دکن میں پہونچے حضرت سلطان جیؒ نے ان کو ایک ایک علاقہ اصلاح کے لیے سپرد کیا تھا تو اس علاقے میں جو جاتا اس کا لقب شاہ ولایت ہوجاتا یعنی ولایت کے بادشاہ تو یہ بظاہر عہدہ ہے کوئی نام نہیں ہے سائل نے سوال کیا کہ یہاں کے شاہ ولایت کے بارے میں کیا ہمارے بزرگوں کے کچھ ارشادات ہیں حضرت نے فرمایا کہ ویسے تو ان کی تاریخ کا کچھ پتہ نہیں ہے مگر میں نے مفتی محمد شفیع صاحب کے والد مولانا محمد یٰسین صاحب مرحوم سے سنا وہ فارسی کے ہمارے استاد تھے انھوں نے

مولانا محمد یعقوبؒ سے پوچھا کہ حضرت اس وقت موجودین میں سے سب سے زیادہ بافیض کون ہے اور مرحومین میں سب سے زیادہ بافیض کون ہے تو حضرت مولانا محمد یعقوبؒ نے فرمایا کہ موجودین میں حضرت میاں جی منے شاہ ہیں اور بھی بعض بزرگوں کے نام لیے اور مرحومین کے متعلق فرمایا کہ میرے بھائی یعنی مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ وہ عمر بھر اپنے آپ کو چھپاتے رہے مگر اب ہاتھ پھیلاتے ہوئے ہیں جس کا جی چاہے آئے اور دولت لیجاتے دوسرے شاہ ولایت ہیںؒ وہاں پر انوار و برکات بارش کی طرح برس رہے ہیں بہر حال مقبولان الٰہی میں سے جو بھی ہو وہ ہمارے اکابرین میں سے ہے جیسے حضرات صحابہؓ سارے کے سارے ہمارے مقتدیٰ ہیں حالانکہ تلمذ کی نسبت سب سے نہیں ہے تلمذ کی نسبت تو صرف چند ہی صحابہؓ سے ہے یعنی جہاں تک سلسلہ حدیث پہونچا ہوا ہے وہ تھوڑے ہی ہیں مگر سارے صحابہؓ ہی کو نجوم ہدایت کہا گیا اس لیے وہ سارے ہی ہمارے اکابرین ہیں عمومی طور پر فیضان سب کا پہونچتا ہے ایک قسم کے ہمارے اکابر وہ ہیں جو سلسلے میں آئے ہوئے ہیں وہ رسمی طور پر بھی اکابر ہیں اور فنی طور پر بھی اکابر ہیں مگر ایک قسم کے وہ بھی ہمارے اکابرین ہیں کہ نہ تلمذ کا ظاہر سلسلہ ان سے ہے اور نہ ارادت اور عقیدت کا سلسلہ ہے مگر ان کا فیض پہونچ رہا ہے ان کی برکات سے ہم لوگ مستفیض ہو رہے ہیں اس لیے وہ بھی ہمارے اکابر ہی ہیں۔

مرنے کے بعد قبروں سے فیضان کی صورتیں

ایک صاحب نے سوال کیا کہ مرنے کے بعد قبروں سے فیضان کی کیا صورت ہوتی ہے ہم لوگ تو قبروں

پر جانے اور ان سے فیض طلب کرنے سے روکتے ہیں حضرت نے فرمایا کہ روکنے کی وجہ یہ ہے کہ لوگ مزاروں پر جاکر شرک کرتے ہیں تو ہم اس شرک سے روکتے ہیں قبروں پر جانے سے نہیں روکتے کیونکہ ان کا یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ یہ بزرگ جو چاہتے ہیں کر دیتے ہیں یہ مختار ہیں اپنے تصرفات باطنی سے کسی کو نفع پہونچا دیں یا نقصان کر دیں یا جسے چاہیں ہدایت دیدیں یا گمراہ کر دیں اسی لیے لوگ جاکر قبروں پر ان سے مانگتے ہیں عموماً لوگ مانگنے ہی کے لیے جاتے ہیں کوئی اولاد مانگ رہا ہے تو کوئی اپنی حاجت مانگ رہا ہے اور یہ سب شرک ہیں اس لیے ہم منع کرتے ہیں ورنہ مطلقاً قبور سے فیضان کا پہونچنا ہم اس کے منکر نہیں ہیں اور نہ مطلقاً قبروں پر جانے سے منع بھی کرتے ہیں حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ پہلے میں قبروں پر جانے سے روکتا تھا مگر اب حکم کرتا ہوں کہ جاؤ فَاِنَّھَا تُذَکِّرُ الْاٰخِرَۃَ .... یعنی وہ آخرت کو یاد دلاتی ہے ظاہر ہے کہ آخرت کے یاد دلانے کا اثر پڑنا یہ مٹی کا اثر نہیں ہے بلکہ ان کے فیضان ہی کا اثر ہے تو مطلق فیضان سے کوئی انکار نہیں ہوسکتا اس لیے ہم نہ تو فیضان کے منکر ہیں اور نہ وہاں پر جانے سے روکتے ہی ہیں البتہ وہاں پر جاکر منتیں مانگنا اور سجدہ کرنا اور ان کو حاجت روا اور مشکل کشا سمجھنا یہ خالص شرکیہ چیزیں ہیں اس لیے علما حضرات ان چیزوں سے روکتے ہیں مگر مخالفین عوام کے دلوں میں اشتعال دلانے کے لیے اس کا یہ مطلب بتاتے ہیں کہ علماء دیوبند کے دلوں میں اولیاء اللہ کی محبت ہی نہیں ہے اس لیے وہ قبروں پر جانے سے منع کرتے ہیں یہ مقدمہ وہ اپنی طرف سے لگا لیتے ہیں تاکہ لوگ ان سے بدظن ہو جائیں۔

سائل نے سوال کیا کہ فیض حاصل کرنے کے لیے عقیدت ضروری ہے یا بلا عقیدت کے بھی فیض پہونچتا ہے حضرت نے فرمایا کہ بلا عقیدت کے کوئی فیض نہیں پا سکتا ہے سائل نے کہا کہ ایک تو وہاں جا کر فاتحہ وغیرہ پڑھ دینا ہے دوسرے یہ کہ ان سے کوئی خاص عقیدت بھی ہو تو کیا فیض دونوں ہی سے ملتا ہے یا اس کے ساتھ عقیدت بھی ضروری ہے حضرت نے فرمایا کہ یہ تو ایک عام حق شرعی ہے جس کو حق تعالیٰ نے اموات کے لیے قائم کر دیا ہے خواہ تمہارا ان سے کوئی تعلق ہو یا نہ ہو حکم یہی ہے کہ وہاں پر جاؤ تو ان کے لیے ایصال ثواب کرو یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ فرمایا گیا اَفْشُوا السَّلَامَ عَلٰی مَنْ عَرَفْتَ وَعَلٰی مَنْ لَمْ تَعْرِفْ۔ یعنی ہر مسلم سے سلام کرو خواہ تم ان کو پہچانتے ہو یا نہ پہچانتے ہو سلام کرنا یہ حقِ مسلم ہے اس میں تعلق کا ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ مسلمانوں سے ملو تو سلام کرو اور جو سلام کرے اس کے سلام کا جواب دو یہ تو دعا دینا ہے اسی طرح مطلقاً ثواب پہونچانا یہ اس پر مبنی نہیں ہے کہ تمہاری ان سے کوئی رشتہ داری ہی ہو تو ثواب پہنچانا ورنہ نہیں بلکہ یہ تو حق مسلم ہے کہ اگر زندہ ہو تو سلام کرو اور اگر مر گیا تو قبر پر جاؤ اور ایصال ثواب کرو یہ حق عمومی ہے اور ایک یہ ہے کہ ان سے پہچان بھی ہے اور عقیدت بھی ہے تو اس میں زیادہ تاثیر ہوگی اور اگر کوئی خاص تعلق ہو تو یہ زیادہ موثر ہوگا سائل نے سوال کیا کہ بعض لوگ قبروں پر جا کر مراقبہ کرتے ہیں اس کے بارے میں کیا حکم ہے حضرت نے فرمایا کہ یہ شخصی احوال ہیں یہ کوئی قانون نہیں ہے کہ اس کو جائز اور ناجائز میں ملاؤ البتہ رسم بنا کر یہ ایسا کرنا ممکن ہے اگر کوئی صاحب حال ہو اور قبروں پر جا کر

مراقبہ کرے اوراس کے دل پر کچھ اثر ہو جائے تو یہ کوئی شرعی مسئلہ نہیں ہے کہ آپ اس کو جائز و ناجائز کا فتوی دو اگر سائل یہ سوال کرے کہ قبروں پر جانا جائز ہے یا ناجائز تو مفتی یہی فتوی دے گا کہ جانا جائز ہے لیکن وہاں پر جاکر آپ کے دل پر کیا اثر ہوگا اس کا تعلق فتویٰ سے نہیں ہے یہ تو احوال شخصیہ ہیں اسی طرح تصور شیخ کا مسئلہ ہے اگر آپ اس کے جائز و ناجائز کے بارے میں مفتی سے فتویٰ طلب کریں تو یہ دار الافتاء کا مسئلہ ہی نہیں ہے اس کا جواب تو شیخ وقت ہی دے گا اگر سالک مبتدی ہے تو اس کے لیے تصور شیخ جائز نہیں کیونکہ وہ اللہ تعالی کی طرف سے ہٹ کر شیخ کی طرف متوجہ ہو جائے گا اور یہ شرک ہے اس لیے شرک میں مبتلا ہونے کے خطرے سے اس کے لیے تصور شیخ جائز نہیں ہوگا اور اگر سالک منتہی ہے تو اس کے لیے تصور شیخ جائز ہے کیونکہ وہ حدود کو پہچانتا ہے اس لیے ان کے لیے تصور شیخ مضر نہ ہوگا۔

سائل نے سوال کیا کہ کیا اولیاء اللہ عالم برزخ میں لوگوں کے لیے دعائیں بھی کرتے ہیں حضرت نے فرمایا کہ سب کے لیے دعائیں کرتے ہیں البتہ جو لوگ ان کے لیے ایصال ثواب کرتے ہیں اور ان کو دعائیں دیتے ہیں تو ان کے لیے خصوصیت کے ساتھ دعائیں کرتے ہیں مثلاً آپ نے ان کے لیے ایصال ثواب کا ہدیہ بھیجا انھوں نے آپ کے لیے دعاؤں کا ہدیہ بھیج دیا مگر اس کے معنی تصرف کے نہیں ہیں بلکہ اس کے معنی اللہ تعالی سے مانگنے کے ہیں وہ بھی مانگتے ہیں اور آپ بھی مانگتے ہیں بعض چیزیں شخصی احوال کے ماتحت ہوتی ہیں وہ ایسی نہیں ہوتی ہیں کہ آپ اسٹیج پر ان کی تبلیغ عام کریں جیسے طبیب جب وہ تعلیم دے گا تو تعلیم عام ہوگی لیکن جب علاج کرے گا

تو مریض کے نبض کو دیکھ کر علاج کرے گا ویسی دوا تجویز کرے گا اسی طرح صوفیا حضرات معالج ہیں اور معالجہ میں طبیب کا کام یہ ہے کہ ہر ایک مریض اور اُنکے مزاج کو پہچان کر علاج کرے مگر اس کو قانون نہیں بنا سکتے اسی طرح باطنی امراض کے سلسلے میں صوفیا حضرات معالج ہیں وہ سالک کی حالت دیکھ کر اس کے لیے عمل تجویز کرتے ہیں۔

اہل قبور سے فیض حاصل کرنے کی شخصی صورت

منشی عظمت علی صاحب نے فرمایا کہ حضرت مجھ سے ایک مرتبہ حماقت ہوئی اور وہ یہ تھی کہ مجھے کچھ روپیہ کی ضرورت پڑ گئی ضرورت بڑی ہی اہم تھی کچھ قرض بھی ادا کرنا تھا میں اوپر کام کر رہا تھا میرے ایک عزیز نے مجھے کچھ ایسی باتیں کہیں کہ میرا قلب اس سے بہت ہی متاثر ہوا اس تاثر میں نیچے اُتر کر میں نے وضو کیا اور دو رکعت نفل نماز پڑھی اور سیدھے مزار قاسمی پر پہونچ گیا اور حضرت نانوتویؒ کے مزار کے پاس بیٹھ کر فاتحہ پڑھی اور اس کے بعد اپنی درخواست شروع کر دی کہ آپ سے میرا اس طرح کا تعلق ہے اور پورا سلسلہ بیان کیا اور کہا کہ میں بہت پریشان ہوں اس لیے یہاں پر آیا ہوں اپنے احوال ظاہر کر کے پھر اللہ تعالیٰ سے دعا کی اور مدرسہ میں آیا تو مدرسہ ہی کے ایک صاحب نے مجھے پانچسو روپیہ قرض عنایت فرما دیا جس سے ہمارا کام ہو گیا۔

حضرت حکیم الاسلامؒ نے فرمایا کہ اصل تو وہی ہے کہ آپ نے دو رکعت نماز صلوٰۃ الحاجۃ پڑھی اور صلوٰۃ الحاجۃ کی خود شریعت میں فضیلت بیان کی گئی ہے تو اصل بنیاد تو یہ دو رکعت نماز نفل تھی باقی آپ خوش عقیدگی

کے ساتھ مزار پر بھی پہونچ گئے مگر یہ معاملہ آپ کی ذات تک محدود ہے اس کو عام اصول نہیں بنا سکتے یہ مسئلہ نہیں ہے کہ دوسروں کے لیے جائز اور ناجائز کا فیصلہ کریں ایک مرتبہ دارالعلوم کے خزانے میں روپیہ کی کمی ہوگئی ملازمین کی تنخواہیں بانٹنی تھیں وقت قریب بھی آگیا میں نے حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ مرحوم سے عرض کیا کہ حضرت دعا فرمادیں اللہ تعالیٰ دارالعلوم کے خزانے کو بھر دے حضرت مدنیؒ نے فرمایا کہ دعا تو کروں گا مگر ایک تدبیر بھی بتلا دوں میں نے کہا کہ وہ تدبیر کیا ہے تو حضرت مدنیؒ نے فرمایا کہ تم حضرت نانوتویؒ کے مزار پر جاؤ اور کہو کہ آپ نے مجھے کس مصیبت میں پھانس رکھا ہے دارالعلوم کے خزانے میں ایک پائی نہیں ہے اور لوگ مجھ سے مطالبہ کر رہے ہیں اور آپ قطعاً توجہ نہیں فرماتے یہ جاکر تم مطالبہ کرو مگر یہ باتیں آواز کے ساتھ کہنا محض دل ہی دل میں مت کہنا خیر حضرت مدنیؒ کی یہ باتیں دل کو تو لگیں نہیں مگر ایک بڑے بزرگ کا فرمان سمجھ کر میں مزار پر چلا گیا اور اسی طرح سے کہا تو واقعی اگلے دن سے آمدنی شروع ہوگئی اور پھر کبھی کمی نہیں آئی مگر یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کو اسٹیج پر بیان کیا جائے اور لوگوں سے کہا جائے کہ تم بھی ایسا ہی کرو یہ تو شخصی حال ہے اور شخصی حال قانون نہیں بنا کرتا اور نہ وہ قابل حجت ہوتا ہے لہٰذا وہ چیزیں جو شخصی احوال کے تابع ہوتی ہیں ان کو قانون بنانا یا قانون کی شکل دینا یہ بالکل غلط ہے بہر حال جب قبروں پر جاکر مردوں سے سلام کیا جاتا ہے تو وہ جواب بھی دیتے ہیں حدیث شریف میں آیا ہے کہ وہ پہچانتے بھی ہیں ایک تو عمومی بات ہے کہ کسی نے جاکر سلام کیا اور انھوں نے اس کا جواب دیدیا اور ایک خصوصی تعلق کی بات ہے کہ ان

لوگوں سے خصوصی طور پر پہچان بھی ہوتی ہے اس سلسلے میں دو طبقے ہیں ایک طبقہ تو یہ ہے کہ ان امور باطنہ کا سرے سے کلیتہً قائل ہی نہیں ہے اس لیے ایسے طبقے پر ایسی باتیں شاق گزرتی ہیں اور سختی سے انکار کرتا ہے اور ایک طبقہ وہ ہے کہ قبولیت کا دارومدار انھیں قبروں کو ٹھہراتا ہے اور یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ سب کچھ قبروں ہی سے ہوتا ہے اس لیے قبروں پر جاؤ اور جو کچھ مانگنا ہو انھیں سے مانگو یہ دونوں طبقے افراط و تفریط کے ہیں اور دین اسلام چاہتا ہے اعتدال کو اسی لیے ہر ہر عمل میں اعتدال قائم کیا گیا ہے اور اعتدال اسی وقت آسکتا ہے جب افراط و تفریط سے خالی ہو اس سلسلے میں یہ اعتدال ہے کہ تصرف ان کے ہاتھ میں نہیں ہے اس سے تو غلو کرنے والوں کی تردید ہوگئی اور ان سے فیضان پہونچتا ہے اس سے منکرین کی تردید ہوگئی یعنی جو لوگ فیضان کے بھی قائل نہیں ان کی بھی تردید ہوگئی اور جو تصرفات کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کے قبضے میں سب کچھ ہے جو چاہتے ہیں کر دیتے ہیں ان کی بھی تردید ہوگئی علماء دیوبند بالکل بیچ کے راستے پر قائم ہیں یعنی اعتدال کے راستے پر ہیں یعنی بزرگان دین کی قبروں سے فیض پہونچتا ہے مگر تصرفات ان کے ہاتھ میں نہیں ہیں کہ جو چاہیں کر ڈالیں جیسا کہ علماء دیوبند اعتدال پر ہیں اسی لیے دونوں طرف کی بوچھاریں ان پر پڑتی ہیں نہ ادھر ہیں کہ یہ لوگ خوش رہیں اور نہ ادھر ہیں کہ وہ لوگ خوش رہیں یہ دونوں سے کٹے ہوتے ہیں اسی لیے دونوں طبقے کے لوگ ان پر لعن طعن کرتے ہیں یہ حضرات بالکل بیچ کے راستے سے گزر رہے ہیں اور وہی اعتدال کا راستہ ہے۔ ع

زاہدِ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا

اور کافر یہ سمجھتا ہے کہ مسلمان ہوں میں شریعت نے ہر چیز میں حد اعتدال قائم کردی ہے اس لیے کامیابی کا راستہ یہی ہے اور یہ مشکل بھی ہے

مزارات اولیا پر ایصال ثواب کی شرعی حیثیت

شرعی فتویٰ اپنی جگہ پر حق ہے عام حکم شرعی یہی ہے کہ مزارات اولیا پر جاکر فاتحہ اور ایصال ثواب کر کے اپنی موت کو یاد کر کے چلے آؤ اور آخرت والی زندگی بنانے کی فکر میں لگ جاؤ اور سوچو کہ جب ایسے اولیاء اللہ دنیا سے چلے گئے تو ہماری کیا حیثیت ہے وہ حضرات اللہ اور اللہ کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر چل کر اللہ اور اللہ کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو راضی اور خوش کر لیے ہم کو بھی ان حضرات کی طرح دنیا میں زندگی گزارنی چاہیئے یہاں تک شریعت نے صرف جائز ہی نہیں بلکہ ایسا کرنے کو پسند بھی فرمایا ہے اس کے علاوہ اگر کوئی مزارات اولیاء پر جاکر سجدہ ہی کرنے لگے یا ان کو حاجت روا اور مشکل کشا سمجھ کر مرادیں مانگنے لگے تو شریعت ایسا کرنے سے منع کرے گی اور اس کے فعل کو شرک قرار دے گی رہا شخصی احوال اس پر کسی قسم کے شرک وغیرہ کا فتویٰ نہیں لگایا جاسکتا کیونکہ علماء دین اور اکابرین حضرات اولیاء اللہ کو حاجت روا اور مشکل کشا نہیں سمجھتے اور نہ ان کے مزارات پر سجدہ ہی کرتے ہیں البتہ یہ عقیدہ ضرور رکھتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام کے جسموں کو مٹی نہیں کھاسکتی اللہ تعالیٰ ان کے جسموں کی بھی حفاظت کرتا ہے وہ حضرات ایسے ہوتے ہیں جیسے کوئی بستر پر آرام سے سو رہا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی لاشیں ہزاروں سال کے بعد نکلیں ان لاشوں میں کسی قسم کا تغیر نہیں ہوا تھا۔

دیکھنے والوں نے شہادت دی ہے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے سو رہے ہیں اور مسکرا رہے ہیں عام مردوں کا جسم سڑ جاتا ہے مگر انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کرام کے اجسام محفوظ رہتے ہیں اور جو لوگ مزار پر جا کر سلام کرتے ہیں اور ایصال ثواب کرتے ہیں ان کے سلام کا جواب بھی دیتے ہیں اور ان کے ایصال ثواب پر ان کے لیے دعائیں بھی کرتے ہیں۔

مسئلے کی نوعیت ایک مثال سے سمجھئے

اب مثال کے طور پر ایک شخص کو کسی بزرگ سے عقیدت بھی ہے اور محبت بھی ہے ان کے تبلائے ہوئے طریقے پر زندگی گزار رہا ہے اور ان کے لیے فاتحہ اور ایصال ثواب بھی کرتا رہتا ہے اور ان کے لیے دعائیں بھی کرتا ہے اتفاق سے اس کے اوپر کوئی پریشانی آگئی وہ پریشان اور بے چین ہے اس بزرگ کے مزار پر جاتا ہے اور اپنی پریشانی کا حال ان کو سناتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے کہ اے اللہ اپنے اس ولی کے صدقے میں ہماری پریشانی دور فرما دے یا اس طرح کہتا ہے کہ حضرت میں مصیبت اور تنگی سے پریشان ہو چکا ہوں آپ توجہ فرمائیں اور ہمارے حق میں اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہماری پریشانی دور فرمائیں اللہ تعالیٰ کے ولی کے وسیلے سے اس نے دعا کی اللہ تعالیٰ نے اس کی مصیبت دور فرما دی یا اللہ کے ولی نے اللہ تعالیٰ سے خود دعا کی اور اللہ تعالیٰ نے اس کی پریشانی دور فرما دی تو اس میں کیا شرک ہو گیا دوسرے لوگ حقیقت سمجھتے ہی نہیں اور افراط و تفریط سے کام لیتے ہیں یہ تو اولیاء اللہ کے متعلق باتیں تھیں حدیث میں عام مسلمان مردوں کے بارے میں یہ آیا ہے کہ

ان کے لیے دعائے مغفرت کرو اور ان کے لیے ایصال ثواب کرو یہ
تمہارا ایصال ثواب مکمل مردوں کو پہونچتا ہے وہ ایصال ثواب کرنے
والوں سے خوش بھی ہوتے ہیں اور ان کے لیے دعائیں بھی دیتے ہیں ان
کی دعائیں دنیا والوں کے لیے قبول ہوتی ہیں یہ الگ مسئلہ ہے
جس طرح عام مسلمانوں کا حال دنیا کی زندگی میں ہوتا ہے کہ ان کی کچھ دعائیں
قبول ہوتی ہیں اور کچھ نہیں بھی ہوتی ہیں ممکن ہے قبر میں بھی ایسا ہی ہوتا ہو
لیکن اولیاء اللہ جو اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے عاشق ہوتے
ہیں اللہ تعالیٰ ان کی دعاؤں کا احترام فرماتے ہیں اور مردود نہیں کرتے
تو قبر میں بھی ان کی دعائیں مردود نہ کریں اور قبول فرمالیں اس میں کیا اشکال
ہے اللہ والوں کے وسیلے سے جو دعائیں کی جاتی ہیں اللہ تعالیٰ ان کو قبول
فرمالیتے ہیں اس قسم کے آپ کو بہت سے واقعات ملیں گے جیسے حضرت
نانوتویؒ کے متعلق دو واقعات آپ کے سامنے آتے یہ خصوصی احوال ہیں۔
لوگ اس کی حقیقت نہیں سمجھتے اور لڑنے مرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں یا ہم
اسکو حکم شرعی نہیں سمجھتے اور نہ عام لوگوں کو کہتے ہیں کہ تم بھی ایسا ہی کرو عوام تو
اولیاء اللہ کو حاجت روا سمجھنے لگتے ہیں اس لیے ان کو ایسا کرنے سے منع کیا جاتے گا
اور کہا جائے گا کہ سب کو دینے والے اللہ ہیں ان سے ہی مانگو وہی تم کو بھی دیں گے
شخصی احوال نہ تو حجت شرعی بنتے ہیں اور نہ ان سے عوام کے لیے کوئی اصول بنایا
جاسکتا ہے کہ تم بھی اسطرح کرو عام دستور یہی ہے جسکو شریعت نے متعین کردیا ہے تم تو
شریعت کے اصول پر چلو یعنی اتباع شریعت کا اہتمام کرو اسی کامیابی کی راہ پر چلو یعنی اتباع
شریعت کا اہتمام کرو یہی کامیابی کی راہ ہے اللہ تعالیٰ سارے مسلمانوں کو
اتباع شریعت کی توفیق اور ہمت دے آمین

مجلس ۳۲

بعض بزرگوں کے خواب اور رویائے صادقہ کی تفصیل

سوال: مولانا علاؤالدین صاحب میرٹھی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا مگر وہ شکل ہو بہو آپ کی تھی انھوں نے آپ سے ملاقات کر کے اپنا خواب بیان فرمایا اب سوال یہ ہے کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بزرگوں کی شکل میں آتے ہیں تو اس سلسلے میں کوئی حدیث ہے جس سے اس کا ثبوت ملتا ہو حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اسی قسم کا واقعہ ہمارے والد مرحوم کا بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے شیخ حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کو خواب میں دیکھا حضرت نے فرمایا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک بہت بڑا دیوان خانہ ہے اس میں حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ بیٹھے ہوئے ہیں میں بھی اس دیوان خانہ میں حاضر ہوا اس کے بعد ان مسائل میں گفتگو شروع ہوئی جو مختلف فیہ ہیں یعنی حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا رسالہ 'ہفت مسائل' جس میں عرس و میلاد و قیام وغیرہ کے مسائل ہیں - حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس میں شدت سے کام نہیں لیے ہیں بلکہ بڑے ہی ڈھیلے پن سے لکھے ہیں تو میرے والد صاحب مرحوم اس مسائل کے سلسلے میں حضرت حاجی صاحب سے بحث کر رہے ہیں کہ حضرت ان مسائل کے بارے میں فقہا حضرات تو یہ لکھتے ہیں اور آپ ان کے خلاف لکھ رہے ہیں اس پر حاجی صاحب فرمانے لگے کہ ہاں ٹھیک ہے مگر اس سلسلے میں لوگوں سے زیادہ

دست گریباں نہیں ہونا چاہیئے تم صحیح مسئلہ بیان کرو اگر وہ نہیں ملتے تو ڈھیلا پن اختیار کرو مدِ مقابل نہ آؤ بلکہ نرمی سے کام لو اگر وہ کرتے ہیں تو کر لینے دو منشا تو محبت ہی ہے اس میں کیا حرج ہے اگر وہ عرس کرتے ہیں تو کر لینے دو منشا تو محبت ہی ہے اسی طرح اگر وہ میلاد و قیام کرتے ہیں تو کر لینے دو منشا تو محبت ہی ہے تو حضرت حاجی صاحبؒ منشا پر بحث کر رہے ہیں اور ہمارے والد صاحب مرحوم یہ فرماتے ہیں کہ فقہاء حضرات تو یہ فرماتے ہیں اور آپ یہ فرماتے ہیں مگر حاجی صاحب اس پر معارضہ نہیں فرماتے ہیں بلکہ یہ فرماتے تھے کہ کرتے ہیں تو کر لینے دو منشا تو محبت ہی ہے ہمارے والد صاحب مرحوم فرماتے تھے کہ بعض مرتبہ میری آواز کچھ تیز ہو جاتی تھی مگر حضرت حاجی صاحب کی عظمت میں کوئی کمی نہ ہوتی تھی اخیر میں خود ہی حاجی صاحبؒ نے فرمایا کہ اگر خود صاحبِ شریعت ہی آکر فیصلہ کر دیں تو پھر کیا ہوگا میں نے کہا کہ اگر خود ہی صاحبِ شریعت آکر یہ فیصلہ کر دیں تو پھر کس کی مجال ہے کہ کچھ بول سکے اس پر حضرت حاجی صاحبؒ نے فرمایا کہ پھر انتظار کرو صاحب شریعت تشریف لا رہے ہیں وہی ہمارے اور تمہارے درمیان فیصلہ کریں گے جب حاجی صاحبؒ نے یہ فرمایا تو میرے دل میں ان کی عظمت اور بڑھ گئی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ مرتبہ عنایت فرمایا ہے کہ ان کے گھر خود صاحبِ شریعت تشریف لاتے ہیں حاجی صاحب سر جھکا کر بیٹھ گئے اور میں بھی ادب کے ساتھ ان کے سامنے بیٹھ گیا اتنے میں حضرت حاجی صاحب نے فرمایا کہ حضور تشریف لا رہے ہیں اور خود یہ کہہ کر اٹھ پڑے پھر اس دیوان خانہ کے دروازہ پر ایک طرف حضرت حاجی صاحب کھڑے ہو گئے اور

ایک طرف میں کھڑا ہو گیا میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لا رہے ہیں اور صحابہؓ کا ایک مجمع آپ کے پیچھے ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت بالکل حضرت گنگوہیؒ کی ہے اور لباس بھی ویسا ہی ہے یعنی سفید لنگی اور سر پر پنج کلیا ٹوپی اور ہاتھ میں عصا اور بدن پر نیلون کا باریک کرتا جس سے بدن چمک رہا ہے کرتے کے نیچے بنیان نہیں ہے اس لیے بدن مبارک چمک رہا ہے آپ بہت وقار سے تشریف لا رہے ہیں اور صحابہؓ کا مجمع آپ کے پیچھے ہے یہاں تک جب آپ دیوان خانہ کے دروازے پر تشریف لاتے تو السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ فرمائے حضرت حاجی صاحبؒ نے بہت ادب سے جھک کر جواب عرض کیا اتنے میں بجائے اس کے کہ آپ مسند کی طرف تشریف لے جاتے کنارا کاٹ کر میری طرف تشریف لائے اور میرے کندھے پر دست مبارک رکھ دیئے اور فرمانے لگے کہ حاجی صاحب یہ لڑکا جو کچھ کہتا ہے صحیح کہتا ہے اس وقت حاجی صاحبؒ کی یہ حالت تھی کہ بجا و درست بجا و درست فرماتے جاتے تھے یہ کہتے کہتے اتنا جھک گئے کہ سر زمین کے قریب آگیا اور پھر کھڑے ہو کر بجا و درست بجا و درست فرماتے فرماتے جھک گئے یہاں تک کہ سر زمین کے قریب آگیا یہاں تک کہ سات مرتبہ اسی طرح سے کیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کھڑے ہیں جب حاجی صاحبؒ سات مرتبہ اسی طرح کر چکے تو مجھے اپنی کامیابی دیکھ کر کچھ کہنے کی جرات ہوئی میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ کا حلیہ مبارک جو حدیثوں میں آتا ہے یہ تو وہ نہیں ہے آپ کی صورت حضرت گنگوہیؒ کی ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

کہ اصل حلیہ تو وہی ہے جو آپ نے حدیثوں میں پڑھا ہے لیکن مولانا گنگوہی کی شکل میں ہم اس لیے آئے ہیں کہ وہ تمہارے شیخ ہیں اور تم کو ان سے مناسبت ہے اس مناسبت کی وجہ سے ہماری طرف کشش پیدا ہو ورنہ حلیہ وہی ہے جو حدیثوں میں آیا ہے اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حاجی صاحب کیا ہمیں اب اجازت ہے۔ حاجی صاحب نے ہاتھ جوڑ کر فرمایا کہ جیسا حضورؐ کا حکم ہو پھر آپ سلام کر کے واپس تشریف لے گئے اور میری آنکھ کھل گئی والد صاحب مرحوم فرماتے تھے کہ یہ خواب لکھ کر میں نے حضرت گنگوہیؒ کے پاس بھیجا حضرت گنگوہیؒ نے اس کے جواب میں یہ لکھا کہ یہ ایسا مبارک خواب ہے کہ اگر کوئی فقہ مانع نہ ہوتا تو میں حکم دیتا کہ اس خط کو میری قبر میں رکھدیا جائے یہ تو میرے لیے حجت اور دستاویز ہے۔

ارواحِ طیّبات کی مختلف شکلیں

اس کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شبیہ مبارک تو وہی ہے جو حدیثوں میں ہے مگر بعض مرتبہ آدمی آپ کو دوسری شکلوں میں بھی دیکھ سکتا ہے مگر یہ دیکھنا حسب مناسبت مقام ہوتا ہے چونکہ ارواح طیبات مجرد اور لطیف ہیں اس لیے ان کی مختلف شکلیں ہو سکتی ہیں جیسے ملائکہ علیہم السلام مختلف شکلوں میں تشریف لاتے ہیں مگر وہ حسب مناسبتِ مقام دوسری شکلوں میں ظاہر ہوتے ہیں اس لیے یہ ممکن ہے مگر ساتھ ہی ساتھ یہ یقین بھی ہو کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں اگر یقین کامل ہے تو خواب میں آپ کو دیکھنے والا آپ ہی کو دیکھ رہا ہے خواہ شکل کچھ بھی ہو شکل تو کسی عارض کی وجہ سے ہوتی ہے البتہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل

میں شیطان نہیں آسکتا لہذا جس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا اس نے حضورؐ ہی کو دیکھا اور وہی برکت اسے میسر ہوگی جو شبیہہ مبارک کی زیارت سے ہوتی ہے حدیث شریف میں تو اتنا ہے کہ مَنْ رَّاٰنِیْ فَقَدْ رَاٰنِیْ۔ یعنی جس نے مجھے دیکھا اس نے مجھے ہی دیکھا البتہ شیطان میری صورت میں نہیں آسکتا آپ نے اس کی نفی نہیں فرمائی کہ میں دوسرے کی شکل میں نہیں آسکتا یا مجھے کوئی دوسری شکل میں نہیں دیکھ سکتا بہر حال تبدیلِ شکل کے بارے میں واقعات شاہد ہیں اس لیے اگر کوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی بزرگ یا مرشد کامل کی شکل میں دیکھے تو بعید نہیں ہے اور نہ انکار کی کوئی وجہ بھی ہے جب کہ لوگوں نے آپ کو مختلف شکلوں میں دیکھا ہے تو انکار کی کوئی وجہ نہیں مگر وہ دیکھنا مناسبتِ احوال کی وجہ سے ہوتی ہے جیسے جب جنگ عظیم ہوئی تھی اس وقت بعض بزرگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ آپ فوجی لباس میں ہیں اور آپ کے دست مبارک میں ہتھیار ہے تو مُعبّرین حضرات نے تعبیر دی کہ معلوم ہوتا ہے کہ جنگ عظیم چھڑنے والی ہے چنانچہ ایسا ہی ہوا تو حالات کے تقاضہ کے مطابق شکل بدلتی رہتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جائے کہ وہ حالات تکوینِ الہی میں مقدر ہوتے ہیں اور پیش آنے والے ہوتے ہیں تو جیسے حالات نمایاں ہوتے ہیں وہ متمثل ہو جاتے ہیں اور ویسی ہی شکل بنتی ہے مثلاً جب جنگ کا حال نمایاں ہوگا تو کسی جرنل کی شکل نمایاں ہوگی اور جب علم کا حال نمایاں ہوگا تو کسی عالم کی شکل ہوگی اور جب اخلاق اور مقامات کے حال نمایاں ہوں گے تو کسی درویش زاہد یا بزرگ کی شکل نمایاں ہوگی تو ہر کیفیت اور ہر صفت اپنی مناسبت

سے اپنی شکلوں میں آتی ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو جامع کمالات ہیں آپ کے اندر علم وعمل و اخلاق و مقامات یہ ساری چیزیں جمع ہیں لہٰذا جس جگہ جس مقام کی ضرورت پڑتی ہے اسی صورت میں آپ کی جلوہ گری ہو جاتی ہے۔ لہٰذا کوئی اشکال نہیں رہا۔

تصورِ شیخ جائز ہے مگر شیخ کی اجازت پر موقوف ہے

سائل نے سوال کیا کہ کیا اس بیان میں جو تمثل کی مناسبت کی رعایت سامنے آئی ہے اس سے تصورِ شیخ کے مسئلے میں کچھ مدد مل سکتی ہے۔ حضرت حکیم الاسلام ؒ نے فرمایا کہ مدد مل سکتی ہے کیونکہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم حسب مناسبتِ مقام اختیار کرتے ہیں تو اصل مل گئی اس لیے اس سے مدد مل سکتی ہے کیونکہ مرید کو شیخ وقت سے مناسبت ہوتی ہے اس لیے شیخ وقت کا تصور اس کی صورت کا مراقبہ مرید کے لیے نافع ہو سکتا ہے مگر تصورِ شیخ نہ طریق کی بنیاد ہے اور نہ مقاصد طریق میں داخل ہے بلکہ یہ معالجہ ہے جب مرید پر قبض طاری ہو تو شیخ کا تصور کرے جیسے یہ بھی ہے کہ دفع قبض کے لیے قبرستان میں جائے یا دفع قبض کے لیے کچھ سن لے بہرحال تصورِ شیخ جائز ہے مگر شیخ کی اجازت پر موقوف ہے۔

تصورِ شیخ کے لیے درجات ہیں مثلاً مبتدی کے لیے تصورِ شیخ مضر ہے کیونکہ اس کے دل میں توحید کامل کا تصور نہیں ہوتا جب وہ شیخ کا تصور کرے گا تو شرک کی طرف متوجہ ہو جائے گا کیونکہ وہ اصل مقصود شیخ ہی کو سمجھتا ہے اس لیے اس کے لیے تصورِ شیخ جائز نہیں ہے کیونکہ وہ منتہی جو مقام تفرید و توحید پر پہونچ چکا ہو اور اس کا شرح صدر ہو چکا ہو

جب وہ تصور شیخ کرے گا تو اس کے دل میں شرک کا شائبہ نہیں آئے گا اس لیے صوفیا حضرات لکھتے ہیں کہ مبتدی کے لیے تصور شیخ جائز نہیں اور منتہی کے لیے جائز ہے اس لیے کہ ان کے احکامات مقامات قلب پر دائر ہوتے ہیں جیسے احکامات فقہ دائر ہوتے ہیں حالات حاضرہ پر اس لیے فقہا حضرات ظاہر کا فتویٰ دیتے ہیں اور صوفیا حضرات باطن کا فتویٰ دیتے ہیں تو مفتی کا فتویٰ دنیا کے حالات پر ہوتا ہے اور صوفیا کا فتویٰ قلب کے حالات پر ہوتا ہے ان کے یہاں اصل مدار قلب ہے اس لیے وہ کہتے ہیں کہ مبتدی کا قلب اس درجہ نہیں ہے کہ وہ تصور شیخ کرے اور شرک میں مبتلا نہ ہو اور منتہی کا قلب اس درجہ کا ہوتا ہے کہ تصور شیخ کے بعد بھی اس کی توحید میں فرق نہیں آتا۔ اس لیے اس کے لیے تصور شیخ جائز ہے جیسے ایک شخص حج کرنے گیا تھا وہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ حضرت میرا جی یہی چاہتا ہے کہ ہجرت کر کے یہیں پر آپڑوں حضرت نے فرمایا کہ ہرگز جائز نہیں ہے پھر ایک دوسرا شخص آیا اور اس نے بھی یہی کہا کہ حضرت میرا جی چاہتا ہے کہ یہیں پر آجاؤں حضرتؒ نے فرمایا کہ ضرور آجاؤ اور اجازت دیدی تو حضرت حاجی صاحبؒ نے دونوں آدمیوں کو دو حکم دیا پہلے کو فرمایا کہ تیرے لیے جائز نہیں کیونکہ اس کے دل میں اپنے وطن کی محبت اور لگاؤ کا غلبہ تھا اور ہجرت مکہ کی صورت عارضی طور پر ذہن میں آگئی تھی اگر حضرت اجازت دیدیتے تو نتیجہ یہ نکلتا کہ مکے میں پہونچ کر ہندوستان کی تخیل میں مبتلا رہتا اور ہجرت و عدم ہجرت دونوں برابر ہو جاتی اس لیے اس کو منع فرما دیا اور دوسرے شخص کے دل سے وطن اور زمین کی محبت قطعاً نکل چکی تھی اور

ارض مقدس اور مکے کی خالص محبت اس کے دل میں آگئی تھی اس لیے اس کے بارے میں اندیشہ نہیں تھا کہ یہاں پر آنے کے بعد ہندوستان کا خیال اس کے دل میں رہے گا اس لیے اس کو فرمایا کہ ضرور ہجرت کر کے آجاؤ چونکہ صوفیا کا فتویٰ قلب کے حالات پر ہوتا ہے اس لیے حضرت حاجی صاحبؒ نے قلبی حالت پر فتویٰ دیا۔

علاج احوال کا ہوتا ہے کیونکہ احوال سب پر پیش آتے ہیں

سائل نے سوال کیا کہ حضرت جو شخص توحید اور تفرید کا مقام طے کر چکا ہو اور اس کو انتہائی مقام حاصل ہو چکا ہو تو اس کو بظاہر تصور شیخ کی ضرورت نہیں ہے اس لیے کہ تصور شیخ کی ضرورت یوں سمجھ میں آتی ہے کہ غیر محسوس اور غیر مفسر چیزوں کے تصور کو ذریعہ بنایا جائے تصور شیخ کو مگر جو انتہائی مقام تک پہونچ گیا ہو پھر اس کو تصور شیخ کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

حضرت حکیم الاسلامؒ نے فرمایا کہ تفسیر احوال پر تصور شیخ کی ضرورت پڑتی ہے اور انسان میں احوال بدلتے رہتے ہیں مقام تو نہیں بدلتا لیکن مقام میں رہ کر اس کے نیچے تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے جیسے ایک شخص بالکل تندرست ہے اس کو دوا کی ضرورت نہیں ہے مگر اس کے قلب پر کبھی غم و خوشی اور عروج و نزول یہ احوال پیش ہوتے رہتے ہیں اسی طرح ایک منتہی المقام کو بھی احوال پیش آتے ہیں کبھی قبض ہوا اور کبھی بسط ہوا یہ ضروری نہیں ہے کہ قبض اور بسط صرف مبتدی ہی کو پیش آئیں کبھی منتہی کو بھی پیش آتے ہیں اس لیے جب قبض ہوگا تو علاج کی ضرورت پڑے گی تو علاج احوال کا ہوتا ہے اور احوال مبتدی المقام پر بھی ہوتے ہیں اور منتہی المقام پر بھی

آتے ہیں لیکن مبتدی کا علاج اور ہے اور منتہی کا علاج اور ہے مگر تعبیر احوال میں دونوں برابر ہیں جیسے حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ مَا حَالَ فَقَدْ زَالَ حال تو کہتے ہی اس کو جو آئے اور چلا جائے مگر وہ جتنی دیر رہے گا ایسے اثرات قائم کرے گا جس کی وجہ سے آدمی منقبض ہو گا حضرات صحابہؓ باوجودیکہ وہ منتہی المقام تھے مگر ان کو بھی وساوس پیش آتے تھے حتیٰ کہ بعض صحابہؓ کو ایسے وسوسے آئے کہ وہ یہ سمجھ گئے کہ ہمارا ایمان ہی ختم ہو گیا مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ منتہی المقام نہیں تھے بلکہ وہ حضرات تو اولیاء کاملین میں سے تھے اولیاء کاملین کو بھی وساوس اور احوال پیش آتے ہیں جیسے چور وہیں پر آتا ہے جہاں پر دنیاوی دولت ہوتی ہے اسی طرح شیطان بھی وہیں پر آتا ہے جہاں پر روحانی اور ایمانی دولت ہوتی ہے جب وہ دیکھتا ہے کہ یہ شخص اعلیٰ مقام پر پہونچ گیا ہے تو چاہتا ہے کہ وہیں سے اس کو گرا دے مگر وہ مقام تو بدل نہیں سکتا البتہ احوال میں وساوس پیدا کر دیتا ہے اس لیے علاج کی ضرورت پیش آتی ہے۔

مقصودِ اصلی تک پہونچنے سے پہلے رہبری کی ضرورت

سائل نے سوال کیا کہ منتہی حضرات کو تو علاج بالمقاصد کرنا چاہیئے وہ علاج بالوسائل کیوں کرتے ہیں مثلاً مقصودِ اصلی ذاتِ باری تعالیٰ ہے اس لیے ان کے فیصلوں پر اعتماد اور یقین ہونا چاہیئے اور یہی اصل مقصد ہے اور تصور شیخ وسائل میں سے ہے تو وسائل سے تصور کیوں کرایا جاتا ہے حضرتؒ نے فرمایا کہ منتہی اسی وجہ سے مقرب ہے کہ اس کا یقین اپنی جگہ پر

قائم ہے مگر پھر بھی احوال پیش آتے ہیں کیونکہ احوال کا پیش آنا یہ دنیاوی چیز ہے لہذا جب تک یہ دنیا میں ہے تو دنیا کی چیزیں اثر کرتی رہیں گی البتہ آخرت میں پہونچ جانے کے بعد پھر دنیا کے تغیر و تبدل نہ ہوں گے پھر احوال کے اندر بھی تغیر و تبدل نہ ہوں گے اس لیے منتہی المقام جب تک دنیا میں رہے گا یہ ممکن نہیں کہ دنیا کے احوال اس پر موثر نہ ہوں چونکہ عقیدہ اپنی جگہ پر قائم ہے اس لیے احوال عقیدے پر اثر انداز نہ کریں گے البتہ کیفیات پر اثر کریں گے اس لیے ان احوال کو بدلنے کے لیے معالجہ کی ضرورت پڑتی ہے تندرست آدمی بھی بیمار ہوتا ہے یہ کوئی ضروری نہیں کہ ضعیف ہی بیمار ہو اور آدمی جتنا ہی قوی ہوگا اتنی قوی بیماری بھی آئے گی مگر جو شخص کمزور ہے تو اس کو ضعیف قسم کی بیماری آتی ہے۔ تو یہ بیماری ہے اور بیماری میں قوی و ضعیف کا فرق نہیں اسی طرح یہ روحانی امراض ہیں جو مبتدی و منتہی دونوں کو لاحق ہوتے ہیں اور وہ اثرات بھی کریں گے تو کبھی حضور ہوگا اور کبھی غیبت بھی ہوگی اس لیے سالکین پر غیبت طاری ہو جاتی ہے تاکہ حضوری کی لذت میسر آئے رات لائی جاتی ہے تاکہ دن کی قدر ہو فقیری لائی جاتی ہے تاکہ مالداری کی قدر ہو بیماری لائی جاتی ہے تاکہ صحت کی قدر ہو تو یہ تغیرات اس لیے آتے ہیں کہ دنیا خود ہی متغیر اور متبدل ہے اور تغیرات اس لیے بھی آتے ہیں کہ ان کی ضرورت بھی ہے کیونکہ سالک کو جب بڑے مقام پر لانا ہوتا ہے تو چھوٹا مقام نمایاں کرتے ہیں تاکہ وہ اس کی قدر کرے اور تمیز کرے کہ میں پہلے کہاں تھا اور اب کہاں پہونچا۔

جنت کی مہمانی کی مثال سے مسئلے کی وضاحت

جیسا کہ جنت میں داخل کرنے سے پہلے حق تعالیٰ اہل جنت کی دعوت کریں گے اور تین دن تک ان کی مہمانی کریں گے اور غذا وہی دیں گے جو دنیا کی غذا ہے پوری زمین کی تو روٹی بنا دیں گے اور جس پر زمین قائم ہے اس کے جگر کا کباب دیں گے۔ اس لیے کریں گے تاکہ دنیا کے سارے ذائقے چکھ لینے کے بعد جب جنت کا ذائقہ سامنے آئے تو دونوں میں فرق معلوم ہو جائے کہ دنیا کا ذائقہ کیا ہے اور جنت کا ذائقہ کیا ہے تو وہاں پر دنیا کے سارے ذائقوں کو تازہ بتازہ کر دیں گے کیونکہ دنیا کے سارے ذائقے موت کی تلخیوں سے لوگ بھول جائیں گے اس لیے وہاں پر دنیا کے ذائقوں کو تازہ بتازہ کر دیں گے تاکہ دنیا کے سارے ذائقے پھر سامنے آجائیں اور دوسری بات یہ ہے کہ دنیا میں ہر خطے کے پھل الگ الگ ہیں ہر ایک شخص نے دنیا کے سارے ذائقوں کو نہیں چکھا ہوگا اس لیے حق تعالیٰ ساری زمین کی روٹی بنا دیں گے جس میں سارے ذائقے چھپے ہوں گے وہ سارے ذائقے ہر ہر انسان کو پہونچ جائیں گے اور سارے ذائقے مستحضر ہونگے حق تعالیٰ کا مقصد یہ ہوگا کہ یہ وہ دنیا ہے جس پر تم مرا کرتے تھے اب جنت میں جاؤ اور وہ ذائقے چکھو جس کو ہم نے تیار کیا اور اب جنت میں جا کر وہ نعمتیں دیکھو جن کو ہم نے تمہارے لیے تیار کیا ہے تو تقابل و توازن سے جنت کی قدر بڑھے گی جب دخول جنت کے وقت اس کی ضرورت پڑے گی کہ ساری چیزیں تازہ کر دی جائیں تاکہ زحمت کے

مقابلے میں رحمت کی قدر ہو تو دنیا میں بھی ایسا ہی کیا جائے گا تا کہ جب غیبت طاری ہو اور حضوری کی قدر ہو اس لیے شاہد دیا جاتا ہے تا کہ غیوب کی قدر ہو اور جہل طاری کیا جاتا ہے تا کہ علم کی قدر ہو جب ایک ضد کے بعد اصل سامنے آتی ہے تو لذیذ بن جاتی ہے۔

مزاح نبوی کی مثال سے مزید وضاحت

حدیث شریف میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کبھی کبھی مزاح بھی فرماتے تھے اور وہ مزاح واقعی ہوتا تھا محض تخیلاتی نہیں ہوتا تھا ایک مرتبہ ایک بڑی بی حاضر ہوئیں تو آپ نے فرمایا لَاتَدْخُلُ الْجَنَّةَ عَجُوْزٌ یعنی بڑھیا جنت میں داخل نہیں ہوگی وہ بیچاری یہ سن کر یہ رونے لگیں کہ میرا تو بڑھاپا ہے میری تو ساری محنت اکارت ہوگئی حضرت عائشہ صدیقہ رض نے فرمایا کہ یارسول اللہ آپ نے بڑھیا کو کیا فرما دیا یہ تو رو رو کر مر جائے گی آپ نے فرمایا کہ کیا بات ہے حضرت عائشہ صدیقہؓ نے کہا کہ آپ نے جو یہ فرمایا ہے کہ بڑھیا جنت میں داخل نہیں ہوگی یہ خبر سن کر وہ رو رہی ہے تو آپ نے بڑھیا کو بلا کر پوچھا کہ بڑی بی کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا ہے اس نے کہا کہ پڑھا ہے آپ نے فرمایا کہ کیا یہ قرآن شریف میں نہیں ہے اِنَّآ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْكَارًا ط یعنی ہم جنت میں داخل کریں گے تو جوان بنا کر داخل کریں گے بوڑھا بنا کر داخل نہیں کریں گے یہ سنتے ہی بڑی بی کھل کھلا کر ہنس پڑیں پہلے انھوں نے یہ سمجھا کہ لَاتَدْخُلُ الْجَنَّةَ عَجُوْزٌ فِی الْوَقْتِ ط یعنی آج جو بڑھیا ہے یا بڑھیا ہو کر مرے گی وہ جنت میں داخل نہیں ہوگی مگر آپ کی مراد

یہ تھی کہ لَا تَدْخُلُ الْجَنَّۃَ عَجُوْزٌ فِیْ ذَالِکَ الْوَقْتِ
۔۔۔۔۔۔۔۔۔ یعنی اس وقت جب کہ جنت میں داخلہ ہوگا تو اس وقت کوئی بوڑھا نہ ہوگا بلکہ جوان بنا کر داخل کئے جائیں گے آپ نے یہ کیوں فرمایا تاکہ اصل سے غیبت کرا کے جب بشارت سنائی جائے تو فرحت بڑھ جائے چنانچہ جب آپ نے یہ بشارت سنائی تو ان کی فرحت بڑھ گئی اور وہ بشاش ہو گئیں۔

رویائے صادقہ کی تفصیل

سائل نے سوال کیا کہ عموماً خواب تو آتے رہتے ہیں مگر رویائے صادقہ کی کوئی علامت بھی ہے جس سے آدمی خواب کی سچائی محسوس کر سکے۔ حضرت حکیم الاسلامؒ نے فرمایا کہ یہ کسی کتاب میں تھوڑے ہی لکھا ہے کہ یہ سچا خواب ہے یا غلط ہے بلکہ آدمی اپنے وجدان سے سمجھتا ہے کہ یہ سچا خواب ہے یا بخارات ہیں مثلاً کھانا زیادہ کھالیا اور بخارات چڑھ گئے تو آدمی خود ہی سمجھ جاتا ہے کہ یہ تخیلات ہیں خواب نہیں ہیں لیکن ایک شخص وہ ہے کہ نماز پڑھ کر دعائیں کر کے سویا اور پیٹ بھی خالی ہے اور قلب میں اِنْشِرَاح ہے تو جب وہ خواب دیکھے گا تو اس کا ذہن خود گواہی دے گا کہ یہ سچا خواب ہے۔ اور رویائے صادقہ کی ظاہری علامت یہی ہے کہ اخیر شب ہو اور سہانہ وقت ہو مثلاً فجر کا وقت ہو اس وقت قلب میں ایک قسم کا انشراح ہوتا ہے خواہ وہ سو ہی رہا ہو وہ عالمِ غیب کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ سائل نے سوال کیا کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اَصْدَقُکُمْ رُؤْیَا اَصْدَقُکُمْ حَدِیْثًا یعنی جس کی بات سچی ہوتی ہے اسی کا خواب بھی سچا ہوتا ہے۔

حضرت نے فرمایا کہ یہ تو ظاہر ہے کہ جب آدمی سچا ہوتا ہے تو نیند میں بھی سچا ہوتا ہے اور جھوٹا آدمی نیند میں بھی جھوٹا ہی ہوتا ہے اس لیے وہ نیند میں بھی جھوٹ بولتا ہے یہ تو حدیث شریف میں ایک اصولی طور پر فرمایا گیا ہے ورنہ اس قسم کی باتیں اکثری ہوتی ہیں کیونکہ کفار بھی کبھی سچا خواب دیکھتے ہیں حالانکہ ان سے جھوٹا کوئی نہیں ہوتا۔ وہ عقائد میں جھوٹے عمل میں جھوٹے مگر پھر بھی خواب سچا دیکھتے ہیں۔ اور وہی واقعہ بن جاتا ہے تو اس قسم کی جتنی چیزیں ہوتی ہیں یہ نہ سمجھا جائے کہ اس کے خلاف ہوتا ہی نہیں جیسا کہ آپ نے فرمایا اِلْتَمِسُوا الْخَيْرَ فِي حِسَانِ الْوُجُوْهِ یعنی اچھے چہروں میں خیر تلاش کرو اور جن کا چہرہ اچھا نہیں ہوتا اور قدرتاً ٹیڑھا ہوتا ہے ان کا دماغ بھی ٹیڑھا ہوتا ہے یہ بھی قاعدہ اکثریہ ہی ہے کیونکہ بعض دفعہ نہایت ہی سیاہ فام شخص عالم باعمل ہوتا ہے اور بعض دفعہ نہایت ہی حسین وجمیل شخص نہایت ہی بلید ذہن ہوتا ہے تو قدرت دکھانے کے لیے بعض دفعہ اللہ تعالیٰ اس قاعدہ اکثریہ کے خلاف بھی کر دیتے ہیں بہرحال اس حدیث کا حاصل تو یہی ہے کہ جس کے قلب میں صدق کا ملکہ ہے وہ سوتے جاگتے دونوں صورتوں میں سچا ہی رہے گا اور جس کے قلب میں مبالغہ آرائی اور جھوٹ کا ملکہ ہے وہ خواب میں بھی جھوٹ بولے تو کوئی بعید نہیں ہے اکثر تو ایسا ہی ہوتا ہے مگر کبھی کبھی اس کے خلاف بھی ہو جایا کرتا ہے اَصْدَقُكُمْ رُؤْيَا اَصْدَقُكُمْ حَدِيْثًا........ اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ

سچ اور حق کا تعلق عالمِ غیب سے ہوتا ہے یہ دنیا تو جھوٹ کی جگہ ہے یہاں پر تو ملمع سازی ہے لیکن جس کے دل میں سچائی ہوگی وہ سچی باتیں ہی کرے گا لہذا عالمِ غیب کی طرف بھی اسی کی رجوع ہوگی اور چونکہ خواب کا تعلق عالمِ غیب سے ہے تو سچا خواب بھی وہی دیکھے گا جو سچا ہوگا

مجلس ۳۳

صحبت اور معیت کے اثرات اور بزرگوں کے مختلف حالات

حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ سے سوال کیا گیا کہ قرآن وحدیث میں مصاحبت اور مجالست کے سلسلے میں ارشادات وارد ہوئے ہیں ان کے متعلق آپ کچھ بیان فرما دیں۔ حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ـــــ صحبت میں زیادہ مؤثر معیت کی ہوتی ہے۔ ایک یہ ہے کہ کسی چیز کا مطلقاً یاد ہو جانا اور ایک یہ ہے کہ وہ چیز اس کی طبیعت بن جائے جسکو ذوق خاص بھی کہتے ہیں اور یہ ذوق خاص اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب قلب کے اندر انشراح پیدا ہو جائے اور یہ انشراح اسی وقت حاصل ہوتا ہے کہ جب کسی بزرگ کی صحبت کے ساتھ ساتھ اس کی معیت بھی حاصل ہو اسی واسطے محدثین حضرات کے یہاں یہ اصول ہے کہ ایک راوی وہ ہے جس نے کسی سے روایت سن لی اور ایک راوی وہ ہے کہ اس کو شیخ کی صحبت بھی مل گئی۔ اور ایک راوی وہ ہے کہ جس نے کسی شیخ سے روایت سنی اور اس کی صحبت میں رہا اور اس کی معیت بھی اس کو حاصل رہی تو اس راوی کی روایت محدثین کے یہاں زیادہ قوی مانی جاتی ہے اور اس کی حدیث کا زیادہ اعتبار بھی کیا گیا ہے کیونکہ جب کسی راوی کی معیت حاصل ہو جاتی ہے تو اس کی روایت کے اندر حقائق ہوتے ہیں اور حقائق کا انکشاف جو ہوتا ہے وہ صحبت اور معیت ہی سے ہوتا ہے اور وہ علم جو صحبت اور معیت سے حاصل ہوتا ہے اس کے اندر ایک قسم کا رنگ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں فرمایا۔ یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ ○

اے ایمان والو تقویٰ اختیار کرو اور سچوں کی صحبت میں رہو اس سے معلوم ہوا کہ صرف تقویٰ کافی نہیں ہے بلکہ نیکوں کی صحبت اور معیت بھی ضروری ہے اور صادقین وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنے ظاہر و باطن کو اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے تابع بنا دیتے ہیں ان کی صحبت اور معیت میں رہنے کا حکم دیا گیا ہے ان کی صحبت اور معیت سے حق تعالیٰ کی معرفت اور محبت قلب میں پیدا ہوتی ہے ایک ہے معیت خداوندی یہ انبیاء علیہ السلام کو حاصل ہوتی ہے جیسے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ شریف سے ہجرت کر کے مدینہ شریف کے لئے روانہ ہوئے تو غار ثور میں آپ چھپ گئے اور تین دن تک چھپے رہے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ آپ کے ساتھ تھے جب کفار مکہ نے یہ اعلان کیا کہ جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پکڑ کر لائے گا اس کو سو اونٹ انعام میں دیئے جائیں گے تو یہ خبر سُن کر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ بہت غمگین ہوئے کہ کہیں ہم پکڑ نہ لئے جائیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی پریشانی دیکھکر فرمایا۔ لَاتَحْزَنْ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا۔ آپ غمگین اور پریشان نہ ہوں بیشک اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہیں یہ معیت خداوندی تھی اسی لئے انبیاء علیہم السلام دشمنانِ خدا سے نہیں ڈرتے کیونکہ اُن کو معیتِ خداوندی کی دولت حاصل ہوتی ہے پھر اس کے بعد صحابہ کو معیتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ملی پھر تابعین کو معیت صحابہ رضی اللہ عنہم ملی اور تبع تابعین کو تابعین کی معیت حاصل ہوئی اس طرح اولیاء کرام کو معیت در معیت حاصل ہوتی رہی۔

معیتِ صادقین سے صرف معلومات ہی حاصل نہیں ہوتیں بلکہ معرفت بھی حاصل ہوتی ہے اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک شخص وہ ہے کہ جو کسی کے دباؤ میں آکر یا کسی سے ڈر کر اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر چلتا ہے اور ایک شخص وہ ہے جو اپنی طبیعت اور اپنے ذوقِ طبعی سے اطاعتِ خداوندی میں لگا رہتا ہے ان دونوں کی

اطاعت میں فرق ہے اطاعتِ حق کا ذوق انھیں لوگوں کو حاصل ہوتا ہے جن کو صادقین کی صحبت اور معیت حاصل ہوتی ہے

بزرگوں کے مختلف احوال

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ کو نسبتِ صلوتیہ حاصل تھی۔ ہر وقت نماز ہی کی لگن دل میں رہتی تھی۔ ایک مرتبہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اگر قیامت کے دن اللہ تعالیٰ نے مجھ سے یہ سوال کیا کہ امداد اللہ مانگ کیا مانگتا ہے تو میں اللہ تعالیٰ سے یہی کہوں گا کہ مجھے آپ عرش کے نیچے ایک گز جگہ مصلے کے لئے عنایت فرمادیں تاکہ میں وہاں پر نماز پڑھتا رہوں حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو نسبتِ صلوٰتیہ حاصل ہوگئی تھی اس نسبت کی وجہ سے ان کے قلب میں نماز کا ذوق پیدا ہوگیا تھا اس لئے ان کے سامنے جنت اور جنت کے محلات اور اس کی حوریں سب ہیچ تھیں بس قلب میں ہر وقت نماز ہی کا فکر رہتا تھا اس کا مطلب یہ نہیں کہ دیگر اعمال کا ذوق نہیں تھا بلکہ ہر عمل خیر کا ذوق تھا البتہ سب اعمال میں جس کا غلبہ تھا وہ نسبتِ صلواتیہ کا تھا۔ اسی لئے حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ سات ۷ قسم کے لوگ ایسے ہوں گے جو قیامت کے دن عرش کے سائے کے نیچے ہوں گے ان میں ۲ دو قسم کے یہ لوگ بھی ہیں پہلا وہ شخص جو اللہ ہی کے لئے کسی سے محبت کرتا ہے اور انھیں کے لئے کسی سے بغض رکھتا ہے اور دوسرا وہ شخص جس کا دل مسجد میں اٹکا رہتا ہے یعنی جب مسجد سے نماز پڑھکر آتا ہے تو انتظار کرتا رہتا ہے کب اذان ہو اور میں نماز کے لئے اللہ کے دربار میں حاضر ہوجاؤں اور یہ دولت اسی شخص کو ملتی ہے جس کے اندر نماز کی نسبت پیدا ہوجاتی ہے اس سلسلے میں بزرگوں کے مختلف احوال ہوتے ہیں۔ بعضوں کو نسبتِ صلوٰتیہ حاصل ہوتی ہے جیسا حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو مثال میں پیش کیا گیا اسی طرح بہت سے اولیاء اللہ گذرے ہیں جن کو

نسبتِ صلوٰتیہ حاصل تھی۔ اور بعض لوگوں کو نسبتِ صومیہ حاصل ہوتی ہے وہ ہر وقت روزہ ہی کے فکر میں رہتے ہیں اور بعض لوگوں کے اندر زکوٰۃ اور انفاق فی سبیل اللہ کی نسبت حاصل ہوتی ہے وہ لوگ ہر وقت اللہ کی راہ میں اپنی دولت لٹانے کی فکر میں رہتے ہیں اور وہ تلاش کرتے رہتے ہیں کہ کوئی اللہ کا غریب اور ضرورت مند بندہ ملے تو اس کو اللہ کی دی ہوئی دولت دیدوں اور بعض لوگوں کو نسبتِ حج حاصل ہوتی ہے وہ لوگ ہر سال حج کرنے کی فکر میں رہتے ہیں جیسے حضرت مولانا خلیل احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ ان کو حج کی نسبت حاصل تھی ہر سال حج کے لئے تیار رہتے تھے اور بعض لوگوں کو نسبت جہاد حاصل ہوتی ہے۔

حضرت شیخ الہند رحؒ کا واقعہ

حضرت شیخ الہند رحؒ کو جہاد کی نسبت حاصل تھی وہ ہر وقت جہاد ہی کی فکر اور تیاری میں رہتے تھے ایک مرتبہ میں ان کے کمرے پر حاضر ہوا دیکھا کواڑ بند ہے میں نے کواڑ کو کھولا تو دیکھا حضرت ہاتھ میں تلوار لئے پینترے بدل رہے ہیں ان کے دل میں ہر وقت جہاد کی لگن رہتی تھی۔ ایک مرتبہ حضرت مولانا عزیر گل صاحب حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر تشریف لے گئے حضرت مولانا عزیر گل کے مزاج میں بے تکلفی تھی انھوں نے حضرت شیخ الہند رحؒ سے فرمایا کہ حضرت اپنے لئے جگہ پسند فرمالیں یہ آپ کے شیخ کا مزار ہے حضرت شیخ الہند رحؒ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ مجھے یہ جگہ پسند نہیں اس پر حضرت مولانا عزیر گل نے فرمایا کہ حضرت آپ کیا فرمارہے یہ تو آپ کے استاذ اور شیخ کی جگہ ہے اور آپ فرمارہے ہیں مجھے پسند نہیں۔ اس پر حضرت شیخ الہند رحؒ نے فرمایا کہ مجھے تو یہ پسند ہے کہ میدان جنگ ہو اور میں اللہ کے راستے میں شہید ہو جاؤں میرا سر کہیں ہو اور ہاتھ و پیر کہیں ہوں سر کہیں پر پڑا ہو جسم کہیں پر پڑا ہو مجھکو تو یہ پسند ہے حضرت شیخ الہند رحؒ

جہاد کا غلبہ تھا اس لئے آپ نے اپنے شیخ کے مزار کے بجائے میدانِ جہاد کو پسند فرمایا اس سے معلوم ہوا کہ بزرگوں کے مختلف احوال ہوتے ہیں کسی کو اس عمل سے مناسبت ہوتی ہے اور اس کا غلبہ ہوتا ہے اور کسی کو دوسرے عمل سے مناسبت ہوتی ہے اور اس کا ان پر غلبہ ہوتا ہے جس شخص پر جس عمل کا غلبہ ہوتا ہے وہ اسی عمل کے ذریعہ ترقی پاتا ہے۔

صوفیہ حضرات کا مقولہ ہے کہ عَدَدُ اُصُوْلَ اِلَی اللہِ بِعَدَدِ اَنْفَاسِ الْخَلَائِقِ اللہ تعالیٰ تک پہونچنے کے اتنے ہی راستے ہیں جتنی مخلوق کی سانس ہے اور یہ لامحدود ہے اس لئے حق تک پہونچنے کے لئے اتنے ہی راستے ہیں جتنی مخلوق کی سانس ہے اور یہ لامحدود ہیں اس لئے حق تک پہونچنے کے لئے راستے بھی غیر محدود ہیں صوفیہ کا مقصد اس سے یہ نہیں ہے کہ شریعت اور چیز ہے اور طریقت اور چیز ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ شریعت پر چلتے ہوئے اتنے راستے سامنے آتے ہیں وہ شریعت سے الگ نہیں ہوتے ہیں بلکہ یوں سمجھئے کہ شریعت کے جس راستے سے سالک کا طبعی لگاؤ ہوتا ہے وہ اسی راستے سے اللہ تک پہونچتا ہے۔

تین صحابہؓ کے ایک ہی سوال پر تین قسم کے جوابات

حدیث شریف میں آیا ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپؐ سے دریافت کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اَیُّ الْعَمَلُ اَفْضَلُ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ مجھے یہ بتلادیں کہ کون سا عمل زیادہ افضل ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بِرُّ الْوَالِدَیْنِ ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرنا یہ عمل زیادہ افضل ہے۔ پھر دوسرا شخص حاضر ہوا اس نے بھی یہی سوال کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اَلصَّلٰوۃُ لِوَقْتِهَا۔ نماز کو اس کے وقت پر پڑھنا یہ عمل زیادہ افضل ہے۔ پھر تیسرا شخص حاضرِ خدمت ہوا اس نے بھی

یہی سوال کیا تو رسول اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اَفْضَلُ الْاَعْمَالِ۔ اِنْفَاقٍ فِی سَبِیْلِ اللّٰہِ اعمال میں سب سے افضل عمل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی دولت اس کے راستے میں خرچ کرو۔ ایک ہی سوال پر تین شخصوں کو الگ الگ جواب دیئے گئے۔

محدثین حضرات نے اس کی تشریح فرمائی ہے کہ پہلا شخص جو آیا اور سوال کیا وہ اپنے والدین کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کرتا تھا اس کے اندر یہ کمزوری تھی اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بِرُّالْوَالِدَیْنِ کو افضل عمل بتلایا اس سے اس کی یہ کمزوری ختم ہو گئی اور وہ ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرنے لگے۔ دوسرا شخص جو آیا اور اس نے بھی وہی سوال کیا تو اس شخص کے اندر یہ کمزوری تھی کہ نماز کو اس وقت پر پڑھنے کا اہتمام نہیں کرتے تھے۔ اس کے بعد وہ بھی نماز کو اس کے وقت پر پڑھنے میں مضبوط ہو گئے۔ اور تیسرا شخص جو آیا اس نے بھی وہی سوال کیا وہ مالدار تھے مگر اللہ کی دی ہوئی دولت اللہ کے راستے میں خرچ کرنے میں کمزور تھے پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ترغیب سے وہ بھی مضبوط ہو گئے اس سے معلوم ہوا کہ جس عمل میں انسان کے اندر کمزوری ہوتی ہے پہلے انبیاء علیہم السلام اس کو دور فرماتے ہیں پھر اس کو اس سے مناسبت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ شخص اسی عمل کے ذریعہ ترقی پاتا ہے یہی صورت مشائخ حضرات نے بھی اختیار کی ہے وہ مرید کو دیکھتے ہیں اس کے اندر کون سی کمی ہے اور کس عمل سے اس کو مناسبت ہے مرید کی کمزوری کا علاج کر کے اس کی طبعی مناسبت جس عمل سے ہوتی ہے اسی عمل کے ذریعہ ترقی کراتے ہیں۔

ایک بزرگ کے اصلاح کا طریقہ

ایک شخص ایک بزرگ کی خدمت میں اصلاح کی غرض سے حاضر ہوا حضرت شیخ نے اس کو کچھ ذکر و شغل بتلایا مگر اس کے مزاج میں یکسوئی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ حضرت شیخ نے اس کی اصلاح کے لئے بڑی کوشش کی مگر اس کے اندر یکسوئی پیدا

نہیں ہوئی اس کی طبیعت ڈاماڈول رہتی تھی وہ بے چین سا رہتا تھا حضرت شیخ اس فکر میں پڑ گئے کہ اس کو مناسبت کس چیز سے ہے حضرت کے یہاں معمول یہ تھا کہ جتنے طالب علم اور مہمان ہوتے تھے سب کا کھانا آپ کے گھر سے آتا تھا ان کی ایک باندی تھی وہ کھانا لا کر تقسیم کر دیا کرتی تھی۔ حضرت شیخ نے دیکھا کہ جب باندی کھانا لاتی ہے تو وہ شخص اس کو گھور گھور کر دیکھتا ہے حضرت شیخ سمجھ گئے کہ اس کا مرض یہ ہے کہ یہ باندی پر عاشق ہے اس لئے کوئی وظیفہ اور عمل اس پر کارگر نہیں ہوتا۔ انھوں نے ایک دست آور دوا منگائی اور باندی کو کھلا دیا اور حکم دیا کہ قضائے حاجت ایک ہی جگہ کرے اس کے لئے ایک قدمچہ بنوا دئے شام تک باندی کے اتنے دست آئے کہ وہ بالکل کمزور ہو گئی اور اس کی صورت بدل گئی پھر شیخ نے باندی کو فرمایا کہ اب تم اسکے پاس کھانا لے کر جاؤ اور وہ جس طرح تمہارے ساتھ پیش آئے۔ مجھے اس کی اطلاع کرنا باندی بار بار دست آنے کی وجہ سے کمزور ہو گئی تھی اور وہ حُسن جس پر مرید عاشق تھا وہ باقی نہیں رہا اسی حالت میں باندی کھانا لے کر گئی۔ مُرید نے جب باندی کو دیکھا تو نفرت کی نگاہیں ڈال کر منہ پھیر لیا اور باندی سے کہا کہ تم کھانا رکھ کر جلدی سے چلی جاؤ۔ باندی نے شیخ کو اس کی اطلاع کر دی۔ حضرت شیخ نے مرید کو بلایا اور فرمایا کہ میرے ساتھ آؤ اور مرید کو پاخانہ کے قدمچہ کے پاس لے گئے اور کہا کہ یہ آپ کی محبوبہ ہے اس کو اٹھاؤ اور لیجاؤ اور بہت حفاظت سے رکھنا آپ کو باندی سے محبت نہیں تھی بلکہ آپ کو اس پاخانہ سے محبت تھی جب یہ پاخانہ اس کے اندر سے نکل گیا تو آپ کی محبت بھی ختم ہو گئی اس لئے آپ کو اس کے پاخانہ سے محبت تھی اس کو اٹھاؤ اور لے جاؤ اتنا کہنے کے بعد مرید کی طبیعت پلٹی اور حقیقت کا علم ہو گیا۔ حضرت شیخ کے سامنے اس نے توبہ کی اور معافی مانگی کہ آپ معاف فرمادیں ہم غلطی پر تھے۔ اللہ والے نرم دل ہوتے ہیں انھوں نے مرید کی غلطیوں کو معاف

فرمادی اور ان کو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس مرید کو عشق سے نسبت ہے یعنی یہ عاشق مزاج ہے آپ نے اس مرید کی طرف توجہ فرمائی اور اس کی نسبتِ عشقیہ کو جو غیر حق کی طرف مائل ہو رہی تھی حق تعالیٰ شانہٗ سے جوڑ دیا وہ مرید عاشقِ الٰہی بن گیا اس سے معلوم ہوا کہ مشائخ حضرات پہلے مرید کی طبیعت کی مناسبت دیکھتے ہیں کہ اس کو کس چیز سے مناسبت ہے اور کس عمل سے لگاؤ ہے جس عمل سے مناسبت قوی ہوتی ہے اسی راستے سے اس کی منزل طے کراتے ہیں اور اس کی اصلاح کر کے اس کو منزلِ مقصود تک پہونچاتے ہیں۔

مجلس ۳۴ ، ۳۵

علوم و معارف کا گنجینہ

تالیف و ترتیب

مولانا نثار احمد صاحب قاسمی

بزمانۂ قیام گاہ بنگلور کرناٹک

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم .... امّا بعد

میں نے تذکرہ حکیم الاسلام میں لکھا ہے کہ حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ جہاں بھی جاتے مواعظ کے ساتھ مجالس کا بھی اہتمام فرماتے تھے، لوگوں نے آپکی مجالس کو قلمبند کرنے کی کوشش نہیں کی، اگر آپ کی مجالس حسنہ کی نقل کا اہتمام کیا جاتا تو ایک علمی ذخیرہ آپ کی زندگی سے نکل کر آنے والی مسلم نسل کو علمی، اصلاحی فائدہ پہنچاتا نمونے کے طور پر حضرت مولانا نثار احمد قاسمی صاحب کی نقل کردہ دو مجالس کو اس کتاب میں شامل کر رہا ہوں۔ اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ خدّام کی لاپرواہی کی وجہ سے حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی مجالس کا ایک علمی اور اصلاحی مجموعہ ان کے ساتھ چلا گیا۔

مولانا نثار احمد صاحب قاسمی نے ان دو مجالس کو کتابی شکل میں طبع کرا کر اعلان کیا تھا کہ میں نے حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی مجالس کو قلمبند کر کے ان کی اشاعت کا پروگرام بنا لیا ہے۔ حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کے مریدین اور معتقدین کو بڑی امید ہو گئی تھی کہ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا موصوف کے ذریعہ مجالس حکیم الاسلام کا ایک علم و حکمت سے بھرپور علمی چشمہ جاری ہو گا، اور ہمارے قلوب ان سے روحانی اور اصلاحی سیرابی حاصل کریں گے، مگر مولانا موصوف بھی دو ہی مجالس کو نکال کر خاموش ہو گئے اس خاموشی کی وجہ کیا تھی، اس کو انھیں سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔

فقط

حبیب اللہ قاسمی

عرضِ حالُ

عَلامۃُ الدہر، خطیبُ العصر، حکیمُ الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا تبحرِ علمی، حُسن تدبّر، خوش انتظامی، تقریری مہارت اور بلند پایہ خطابت علمی طبقہ میں مسلّم تھا، آپ کا تکلم ایمان کو تازگی، رُوح کو پاکیزگی اور قلب سلیم کو تابندگی عطا کرتا تھا۔ قسّامِ ازل نے آپ کو ظاہری اور باطنی بہت سی خوبیوں اور صلاحیتوں سے بھرپور نوازا تھا۔ باذوق عُلماء آپ کی علمی گفتگو سننے اور اس سے استفادہ کے لئے سراپا انتظار اور عامۃ المسلمین آپ کے اِصلاحی اور رُوح پرور بیان کی سماعت کے لئے سراپا اشتیاق رہتے تھے۔

حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کے علمی اور معلوماتی خزانہ کا ایک بڑا حصّہ تو کتابی صورتوں میں سامنے آچکا ہے، ایک بھاری حصّہ فضا میں تحلیل ہوچکا ہے اور کچھ قیمتی جواہر پاروں کو اَربابِ قلم نے حیطۂ تحریر میں لاکر اپنی ذاتی لائبریری میں محفوظ کرلیا ہے اور چند دوسرے قسم کے قدر دانوں نے آپ کی بعض علمی اور اصلاحی تقاریر کو ٹیپ کرلیا ہے۔ میں نے آپ کے ان علمی خزانوں کو جو منتشر اور اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے ہیں یکجا کرکے کتابی صورت میں شائع کرنے کا بیڑا اُٹھایا ہے تاکہ علمی غوّاص ان بیش بہا موتیوں

سے اپنے دامن بھرتے رہیں اور یہ بھی کہ یہ گوہر نایاب نوکِ قلم پر آکر ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جاتے۔ اس سلسلے کی یہ میری پہلی کوشش ہے جو منظرِ عام پر آرہی ہے۔ اگر اہل علم اور قدردان حضرات نے ہر متقاضی پہلو سے میری حوصلہ افزائی فرمائی تو انشاء اللہ یہ مفید اور علمی پروگرام برابر جاری رہے گا، اور آہستہ آہستہ دیگر اکابرِ ملت اور اساطین علم کے بھی علمی جواہر پارے آپ کے مطالعہ کی میز پر آجائیں گے۔ پیشِ نظر کتاب کی تیاری اور اس کو جامۂ وجود پہنانے میں مجھ سے کہیں زیادہ مدرسہ ضیاء العلوم لبسونگڈھی محلہ اسلام آباد بنگلور ۱۲ کے صدر مدرس حافظ محمد نور اللہ صاحب عبیدی اور اسی مدرسہ کے دوسرے نمایاں مدرس برادرِ عزیز مولانا قاری محمد علاء الدین صاحب قاسمی غازیپوری نے محنت اور جانفشانی کی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اس کتاب کی طباعت اور آپ کے ہاتھوں میں پہونچنا بس انھیں دونوں حضرات کی محنتِ شاقہ کا ثمرہ ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ ان کو اجرِ جزیل عطا کرے اور آئندہ بھی ان کے حوصلے بلند فرمائے آمین۔

اس کتاب میں حاضرین مجلس کے چند علمی سوالات اور حضرت حکیم الاسلامؒ کے معلومات افزا جوابات ہیں۔

فقط

عرض گذار نثار احمد قاسمی

پہلی مجلس ۲۴

ایک صاحب نے سوال کیا کہ اگر قوم نے اپنے قومی مفاد کے خیال سے کچھ فنڈ جمع کیا مثلاً لاکھ دو لاکھ روپیہ اور پھر یہ سمجھ میں آیا کہ اس رقم کو بطور قرض تاجروں کو دیں اور چونکہ تاجر بہر صورت بینک سے قرض لیتا ہی ہے تو کیوں نہ ہم اس رقم کا سود وصول کریں تاکہ فنڈ قائم رہے اور ترقی کرتا رہے اور قوم کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہونچے تو قوم کی یہ ہمدردی اسلامی شریعت کے نزدیک جائز ہے یا نہیں؟

کسی عمل کیلئے محض نیّت کی خوبی کافی نہیں

حضرت حکیم الاسلامؒ نے فرمایا کہ سود کا مسئلہ تو واضح اور کھلا ہوا مسئلہ ہے۔ اِجتہادی یا فروعاتی مسئلہ نہیں ہے۔ قرآن کریم کی آیت ہے اَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا۔ اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال کیا اور سود کو حرام قرار دیا۔ سود کسی بھی نوعیت سے ہو وہ حرام ہی رہیگا اور قومی ہمدردی اگر حرام طریق سے ہو تو وہ مستقل وبالِ جان بنے گی، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ کسی عمل کے لئے محض نیت کی خوبی کافی نہیں جبتک کہ وہ عمل شریعت کے مُطابق نہ ہو، اچھی نیّت سے اگر کوئی گناہ کرے تو وہ نیکی نہیں بن جائے گا اور نہ ہی اس نیّت کا کوئی اعتبار ہوگا۔ جب دو چیزیں

تھیں بیع اور سود، ایک کو حلال قرار دیا اور ایک کو حرام، تو بجائے اس کے کہ اس پر سود لیں اور صریح حرام کے مرتکب ہوں خود بھی گناہ میں مبتلا ہوں، اور قوم کو بھی گناہ میں مبتلا کریں۔ اس کو کسی تجارت میں کیوں نہ لگا دیں خواہ ایک شخص وکیل بن جائے سب کی طرف سے۔ نفع و نقصان کا شریک رہے اور اس منافع سے وہ قوم کی خدمت کرے کہ وہ سرمایہ بھی باقی رہ سکتا ہے۔ یہ مناسب نہیں کہ محض سرمایہ کو باقی رکھنے کے لئے ایک حرام شکل اختیار کی جائے کہ وہ راس المال کو بھی حرام اور ناجائز بنا دے۔ اس سے قوم کو فائدہ نہیں بلکہ ضرر پہونچے گا۔ یہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جو مسلمان قرآن پر ایمان رکھتے ہیں وہ کھلے طور پر کیسے خلاف ورزی کریں گے محض اس نیت سے کہ قومی ہمدردی ہو۔

اہلِ یورپ آج یورپ والے جو سود لے رہے ہیں اور دے رہے ہیں ان میں بھی تو قومی ہمدردی کا جذبہ ہے کہ قوم کو فائدہ پہونچے لیکن وہ تو خیر شریعت کے مکلف ہی نہیں مگر جو لوگ شریعت کے مکلف ہیں اور اس پر ایمان بھی رکھتے ہیں اور یہ بھی جانتے ہیں کہ سود لینے دینے میں ضرر بھی ہے۔

پھر جانتے بوجھتے کسی کام کو کرنا اور اس پر اعتماد بھی کر لینا صرف یہ سمجھ کر کہ ہماری تو نیت نیک ہے، نہایت ہی غلط اور غیر مناسب بات ہے اور قوم کے ساتھ ہمدردی کے بجائے درپردہ دشمنی ہے۔ دنیاوی بھی اور اخروی بھی۔

حُسنِ نیت کیلئے عمل کا مشروع ہونا لازم ہے

لہٰذا کسی کام کیلئے محض نیت کی خوبی

کافی نہیں۔ اب نیک نیتی سے کوئی یوں سمجھ لے کہ نماز تو اچھی چیز ہے اس کی چھ رکعت ہی پڑھ لوں نفع ہی ہوگا تو چار بھی نہ ہوں گی وہ بھی منہ پر ماری جائینگی تو جہاں اسلام میں نیت کی خوبی ضروری ہے۔ عمل کی خوبی بھی تو ضروری ہے حُسنِ عمل یا عملِ صالح اسی کا نام ہے کہ جس میں اِخلاص اور حُسنِ نیت بھی ہو اور ساتھ میں عمل کی صورت بھی وہی ہو جو شریعت سے ثابت ہو۔ اسی لئے سورہ تبارک الذی میں فرمایا گیا ہے تَبٰرَكَ الَّذِیْ بِیَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرُ الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا برکت والی ہے وہ ذات کہ جس کے ہاتھ میں ملک ہے دُنیا کا بھی اور آخرت کا بھی اور کائناتوں کا بھی اور وہ ہر چیز پر قادر ہے اور وہی وہ ذات ہے کہ جس نے موت اور حیات پیدا کی، کسی کو وجود دیا کسی سے وجود چھینا، کسی کو زندہ کیا کسی کو مُردہ کیا، اسی کے ہاتھ میں ہے وجود اور عدم کی باگ ڈور۔

عالم میں یہ تغیرات، موت، حیات، نعمت، سلبِ نعمت کیوں رکھے؟ وجہ بیان فرمائی لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا تاکہ اللہ تمہیں جانچے کہ تم اچھا عمل کرتے ہو یا بُرا۔ جب تم اس کے مُلک میں ہو، اس کے اقتدار کے نیچے ہو، اس کی قدرت کے تحت ہو تو تم اس کی اتباع کرو گے یا نہیں۔ اسی کو جانچنے کے لئے عالم میں یہ تغیرات رکھے ہیں تاکہ تمہارے ایمان کی جانچ ہو اور دیکھیں کہ تم میں اَحْسَنُ عَمَلًا کون ہے۔

اَحْسَنُ عَمَلًا کی تفسیر

اَحْسَنُ عَمَلًا کی تفسیر ابن عباسؓ نے کی ہے کہ اَیْ اَخْلَصُهٗ وَاَثْبَتُهٗ، حُسنِ عمل اور عملِ صالح وہ ہے کہ خالص ہو رضاءِ خداوندی کے لئے، اس میں اخلاص ہو، ریا نہ ہو اور ثابت بالسنہ ہو یعنی اس طریقہ سنّت کے مطابق ہو جو شریعت

نے ثابت کیا ہو

عمل کا ظاہر و باطن

عمل باطن کے اعتبار سے خالص رضاءِ خداوندی اور اخلاص کے ساتھ ہو، مخلوق کی رضا یا اپنی رضاءِ نفس شامل نہ ہو۔ اگر رضاءِ نفس اور رضاءِ خلق کا شائبہ تک بھی شامل ہے عمل کے اندر تو وہ داخلِ شرک قرار دیا گیا ہے اور ظاہر کے اعتبار سے ثابت بالسنۃ ہو اور بطریق صواب ہو یعنی اس نہج پر ہو کہ جس طرح شریعت نے بتلایا ہے تو گویا عمل صالح کی دو بنیادیں ہو گئیں، ایک اخلاص للہ اور ایک اتباع سنت۔

عملِ صالح کی کسوٹی

اخلاص للہ کو جو کلمہ بیان کر رہا ہے وہ ہے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ وہی برحق ہے۔ اسی کا حکم ماننے کے قابل ہے اور اسی کی رضا پر چلنے سے نجات حاصل ہوسکتی ہے اور اسی کلمہ کے دوسرے جزو مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ سے نکلتا ہے اتباع سنت۔ اس لئے کہ بطریق صواب وہی ہے جس کو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کر کے دکھایا ہے یا جو آپ کے متبعین حضرات صحابہؓ کا تعامل ہے۔ اس کا حاصل یہ نکلا کہ جس عمل میں لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ شامل ہوگا وہی عمل صالح ہوگا۔

ایک غلط فہمی

عمل صالح اُسے نہیں کہتے جس کو ہم اور آپ سمجھ رہے ہیں کہ فلاں نے بڑے اچھے کام کئے۔ رفاہِ عام کا کام کیا۔ بہت ہی عمدہ کام کیا۔ ہمارے اور آپ کے سمجھنے سے اور محض تخیل سے وہ عمل صالح نہیں بنے گا۔ اگر کوئی ایسا سمجھتا ہے تو وہ غلط فہمی میں مبتلا ہے۔

عملِ صالح کی دو بنیادیں

بلکہ عمل صالح بنتا ہے دو بنیادوں سے۔ ایک بنیاد ہے اخلاص للہ اور دوسری

بنیاد ہے اتباعِ سنت۔ جس کام میں اخلاص ہے اور اتباعِ سنت بھی ہے وہ عمل صالح ہوگا۔

شرک فی العمل

اب اگر اخلاص میں کمی آئی یعنی کسی کام میں رضاءِ خداوندی کے ساتھ کچھ مخلوق کی رضا بھی شامل ہوگئی یا نفس کی رضا مخلوط ہوگئی تو وہ عمل خالص اللہ کے لئے نہ رہا۔ اس لئے جس درجہ اخلاص میں غیر اللہ کی رضا شامل ہوگی شرک کی بنیاد پڑتی چلی جاویگی اور شرک فی العمل ہوجائے گا۔

بدعت کی بنیاد

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کہنے کے معنیٰ ہیں کہ اتباع ہو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی۔ اب جس درجہ اتباع میں کمی آتی جائیگی اسی درجہ ابتداع اور بدعت کی بنیاد پڑتی چلی جاویگی جو شرک تک پہونچا دے گی۔ تو دین کی اصلاح کی دو بنیادیں ہیں، اخلاص اور اتباع، اور دین کے فساد کی دو بنیادیں ہیں شرک اور بدعت لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ میں کمی آنے سے شرک کی ابتدا ہوتی ہے اور مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ میں کمی آنے سے بدعت کی ابتدا ہوتی ہے۔

ہر آدمی کا کام

اب ہر آدمی کا کام ہے کہ اپنے ہر کام میں غور کرے کہ جو کام میں کر رہا ہوں اس میں لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ شامل ہے یا نہیں جس پر اسکے ایمان کا دارمدار[1] ہے۔ اگر ہے تو عمل صالح ہے ورنہ عمل طالح۔ ایک تو ہے صریح چیز جس کو شریعت نے صراحۃً ممنوع قرار دیا ہے اس کو اگر جائز کرنے کی فکر میں ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اخلاص تو پہلے ہی کھو دیا، وہ کام رضاءِ حق کے لئے نہ رہا اور ساتھ میں اتباع کو بھی خیرباد کہہ دیا،

---

[1] دارومدار

لہٰذا وہ رسالت کی پیروی نہ رہی تو اس عمل میں برکت کہاں سے ہوگی، اس سے جتنے بھی آثار پیدا ہوں گے وہ سب نجس اور ناپاک ہوں گے۔ اس لئے کہ معدہ ہی درحقیقت حوض بدن ہے اس کا پانی گندہ ہوا تو ایک ایک عضو میں گندگی پہنچے گی۔ معدہ میں پاک چیز بھری ہوتی ہے تو ہر عضو میں پاک چیز پہنچے گی۔ ایمانی خوشبو پیدا ہوگی۔ اسی لئے حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ جب مرنے کا وقت قریب ہوتا ہے اور ملائکہ نزع روح کرتے ہیں تو ملائکہ ہاتھوں کو، پیروں کو، منہ کو، ٹانگوں کو سونگھتے ہیں کہ ان میں ایمان کی خوشبو کتنی ہے۔ وہ جو قلب کا ایمان ہے جب وہ پھیلتا ہے تو ہاتھ پیر پر آتا ہے عمل کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے تو ملائکہ اس سے اندازہ کر لیتے ہیں کہ اس کے ہاتھ پیر میں ایمان کی اس قدر خوشبو ہے۔

ایمان کی جانچ

ابتدا سے لے کر انتہا تک اللہ تعالیٰ کے یہاں صرف دو ہی چیزوں کی جانچ ہے وہ یہ کہ ہر عمل میں ایمان کا دخل ہو اور ہر عمل میں اتباع کا دخل ہو۔ ایمان میں کمی آئی شرک پیدا ہوا، اتباع میں کمی آئی بدعت پیدا ہوئی اور یہ دونوں چیزیں دین کے فساد کی ہیں تو آدمی قومی ہمدردی کرے اور دین کو پہلے ہی خیر باد کہہ دے، یہ ہمدردی کیا ہوئی یہ تو نہ اپنی ہی ہمدردی رہی نہ قوم کی ہمدردی رہی۔

شاہ افغانستان کا ایک سبق آموز واقعہ

اس پر مجھے ایک بات یاد آئی، دیکھنے میں تو معمولی ہے لیکن سمجھدار کے لئے سبق آموز ضرور ہے۔ وہ یہ کہ افغانستان کے بادشاہ امیر دوست محمد خاں صاحب جو امیر عبدالرحمٰن خاں صاحب کے والد اور امان اللہ خانصاحب کے دادا تھے بہت دیندار بادشاد تھے، ان کی دینی باتیں ضرب المثل

تھیں۔ ایک روز وہ شاہی محلسرائے میں آئے تو چہرہ کچھ اُداس ساتھا تو بیگم نے پوچھا کہ آج آپ کے چہرہ پر غمگینی اور اُداسی کیوں ہے۔ انھوں نے کہا کہ ایک بہت بڑے حادثے کی اطلاع آئی ہے جس کی بنا پر میں مغموم ہوں، اور پریشان ہوں وہ یہ ہے کہ افغانستان پر کسی دشمن نے حملہ کیا تو میں نے اپنے شہزادے کو فوج دے کر مقابلہ کے لئے بھیجا تھا۔

شکست کی خبر ملی

آج سرحد سے یہ خبر آئی ہے کہ شہزادے کو شکست ہوگئی ہے اور وہ دوڑتا ہوا آرہا ہے اور دشمن اسکے پیچھے پیچھے ملک کو فتح کرتا ہوا آرہا ہے تو دو غم مجھے لاحق ہیں ایک تو ملک ہاتھ سے گیا وہ دوسروں کے قبضہ میں چلا جاوے گا۔ دوسرے یہ کہ میرا شہزادہ شکست کھا کے آیا اور بزدلی دکھلائی یہ داغ میرے اوپر مرتے دم تک باقی رہے گا کہ میرا شہزادہ کمزور اور بزدل ہے۔ ان دو غموں کی وجہ سے میرا چہرہ اُداس ہے۔

تردید شکست

بیگم نے کہا کہ یہ سب جھوٹی باتیں ہیں اور غلط خبر ہے میرا شہزادہ شکست کھا کر نہیں آسکتا ہے، یہ تو ہوسکتا ہے کہ وہ شہید ہو جائے لیکن دشمن کو پشت دکھا کر آئے یہ ممکن نہیں۔ یہ خبر جھوٹی ہے۔ بادشاہ نے کہا کہ پرچہ نویسوں کی اطلاع ہے اس نے کہا کہ وہ پرچہ نویس بھی جھوٹے ہیں۔ انھوں نے کہا خالص بادشاہی دفتر کی اطلاع ہے، اس نے کہا کہ دفتر بھی جھوٹا ہے۔ تو امیر نے کہا کہ اب کون اس عورت سے جھگل باؤل کرے۔ مُرغ کی ایک ٹانگ ہانکے جاویگی۔ نہ اسے سرکاری حکومت کے حالات کی اطلاع، نہ دفاتر کی، نہ سرکاری کاغذات کی، اس لئے سب کو جھوٹا قرار دے دیا، گھر میں بیٹھنے والی عورت ہے اسے کون سمجھاوے

واپس چلے آئے۔

اوراب فتح کا شادیانہ

اگلے دن گھر گئے تو چہرہ حشاش وبشاش تھا۔ بیگم نے کہا کہ کیا بات ہے آج تو آپ بہت خوش ہیں، کہا کہ تم نے جو بات کہی تھی وہی صحیح نکلی۔ وہ تو صورت یہ ہے کہ دشمن کو بھگا دیا شہزادے نے اور فتح کے شادیانے بجاتا ہوا آرہا ہے، فاتح بن کر آرہا ہے۔ دشمن کو دُور تک بھگا دیا ہے۔

واقعہ کی تحقیق اور حقیقت کا انکشاف

بیوی نے کہا الحمد للہ خدا نے میری بات سچی کر دی۔ اس پر امیر نے پوچھا کہ آخر تم نے اتنی قوت سے کیسے دعویٰ کیا کہ وہ شکست کھا کر نہیں آرہا ہے کیا تمہیں الہام ہوا تھا۔ اس نے کہا کہ میں عورت ذات ہوں مجھے الہام سے کیا تعلق اور پھر شاہی بیگم، سارے عیش کے سامان میسر ہیں میں ایسی ولی کہاں سے بن گئی کہ مجھ پر الہاماتِ خداوندی ہوں۔ امیر نے کہا کہ پھر آخر ایسی قوت سے تم نے کیسے دعویٰ کیا کہ ساری خبریں جھوٹی ہیں اور واقعی وہ نکلیں جھوٹی۔ یہ کیا بات ہے۔

اخفاءِ راز پر اصرار

بیگم نے کہا کہ یہ ایک راز ہے جسے میں ظاہر کرنا نہیں چاہتی، اب امیر سر ہوئے کہ ایسا کونسا راز ہے بیوی کا جو خاوند سے چھپا رہی ہے۔ خاوند سے زیادہ راز دار کون ہے بیوی کا، وہ پوچھنے پر مُصر ہیں اور یہ چھپا رہی ہیں۔ امیر نے کہا کہ میں بہرحال تم سے پوچھ کر رہونگا۔ اب وہ مجبور ہوئی تو اس نے کہا کہ میں نے عمر بھر یہ بات ظاہر نہیں کی آج میں وہ راز کھولے دیتی ہوں جب آپ بیحد مُصر ہیں۔

اِفشاءِ راز اور شہزادے کی والدہ کا کمالِ تقویٰ

وہ یہ ہے کہ جب شہزادہ میرے پیٹ میں آیا تو میں نے اللہ سے عہد کیا کہ کوئی مشتبہ لقمہ میرے پیٹ میں نہیں جائے گا، چنانچہ میں نے سلطنت کے خزانے سے ایک پائی نہیں لی اور جو تنخواہ آپ کو ملتی تھی نہ اس سے میں نے کوئی پائی لی۔ اپنے ہاتھ سے ٹوپیاں بناتی تھی ان کو بکواتی تھی۔ اس سے میں نے اپنا پیٹ پالا ہے۔ تو میں نے نو (۹) مہینے میں انتہائی تقویٰ سے کامل حلال غذا استعمال کی۔ اس کے بعد جب یہ پیدا ہوا تو میں نے بجائے دودھ پلانے والیوں کے سپرد کرنے کے کہ کسی انا کا دودھ پئے میں نے خود ہی دودھ پلایا، اس عہد کو قائم رکھا کہ دو برس تک کوئی مشتبہ لقمہ میرے پیٹ میں نہیں جائے گا۔ اسی طرح میں نے اپنی دستکاری سے محنت کر کے کمایا اسے کھایا اور اس کے ساتھ ساتھ میں نے یہ طریقہ بھی اختیار کیا کہ جب یہ دودھ پینے کے لئے رُوتا تو میں پہلے وضو کرتی پھر دو رکعت نفل نماز پڑھتی اور دعا مانگ کر پھر دودھ پلاتی تھی پاک و صاف ہو کر، تو اندر سے پاک کمائی تھی، اُوپر سے بھی پاکی تھی، لقمہ بھی مشتبہ نہ تھا۔ تو ظاہر بات ہے کہ جب وہ ایسی پاک غذا سے پلا، پیٹ میں ایسی پاک غذا سے نشو و نما پایا تو اس میں کمینہ اخلاق کیسے پیدا ہوں گے۔

بُزدلی خُلقِ ناپاک ہے

اور بزدلی کمینہ اخلاق میں سے ہے جس کی اسلام میں گنجائش نہیں۔ اسلئے میں نے توت سے کہا کہ وہ کمینہ اخلاق نہیں رکھتا، شجاعت رکھتا ہے۔ دشمن کو پشت دکھلانا یہ بزدلی تھی تو میں نے یقین سے کہہ دیا کہ یہ ناممکن ہے۔

اکلِ حلال کا لازمی نتیجہ اخلاق حسنہ کا پیدا ہونا ہے

جب اس کی غذا بھی پاک اس کا خون بھی پاک، اس کا نشو و نما بھی پاک، تو کیسے ممکن ہے کہ اس میں ناپاک اخلاق پیدا ہوں، اور جب اخلاق ناپاک نہیں تو افعال ناپاک کیسے سرزد ہوتے۔ تو بزدلانہ پن کمینہ اخلاق میں سے ہے اس کا وجود ہی نہیں محض اس اعتماد پر دعویٰ کیا تھا کہ خبریں جھوٹی ہیں۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ وہ شکست کھا کر آئے، یہ ہوسکتا ہے کہ وہ شہید ہو جائے۔ خدا نے میری بات سچی کر دی، مجھے اس پر یہ بات یاد آئی کہ شاہی بیگم محل میں رہ کر سارے عیش کے سامان میسر اور وہ تقویٰ اختیار کرتی ہے محض اس لئے کہ میرے پیٹ کے اندر ناپاک خون نہ پیدا ہو، تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اس میں ناپاک اخلاق پیدا ہوں، پھر بادشاہ کی بیگم محل میں رہ کر یہ تقویٰ اختیار کرسکتی ہے۔ ہم لوگ تو کہیں کے بادشاہ بھی نہیں ہیں، نواب بھی نہیں ہیں پھر آخر ہم اپنے لقمے اور اپنی غذا کو کیوں اس پاک نہیں بنا سکتے ہیں۔

ہمدردی یا دشمنی

محض قومی ہمدردی کے نام پر ہم قوم کو ناپاک غذا پہنچائیں اور ساری قوم کے اخلاق کو گندہ بنانا، کمینہ اخلاق قوم کے اندر پیدا کرنا یہ کونسی ہمدردی ہے۔ لہٰذا یہ نیت تو نہایت نیک ہے کہ لاکھ دو لاکھ جمع کیا محض اس لئے کہ ہماری قوم کی خدمت ہو مگر اس جمع کے اندر دین بھی تو شامل ہونا چاہیئے تاکہ قوم کے اندر ناپاک اخلاق نہ پیدا ہوں۔ اور قوم سے ناپاک افعال نہ سرزد ہوں۔

خُلقِ حسن موقوف ہے لقمہ حلال پر

اگر اس کی غذا لقمہ صحیحہ ہے تو اخلاق صحیح ہیں، لقمہ ناپاک ہے

تو اخلاق بھی ناپاک ہیں۔ اس لئے ہم نے اپنے اکابر کو یہ دیکھا ہے کہ بیعت کرتے وقت وہ پہلے پوچھتے تھے کہ تمھارے پاس موروثی زمین تو نہیں ہے۔ کچھ سود وغیرہ تو نہیں ہے جس کو تم کھاتے ہو۔ پہلے اس سے توبہ کرو جب بیعت کریں گے۔ اس لئے کہ جب غذا ہی تمھاری مشتبہ ہوگی تو ذکر اللہ تمھارے اندر کیا اسر رے گا۔ اگر اللہ کا نام لوگے تو اس کی تاثیر واقع نہیں ہوگی، اللہ کا نام جیسا پاک ہے وہ پاک ہی ظرف بھی چاہتا ہے۔ ناپاک ظرف کے اندر پاک چیز نہیں بھری جاتی وہ بھی ناپاک بن جاتے گی، تو غذا پر اور اکلِ حلال پر دار و مدار ہے اخلاقِ حسنہ کا۔

امام شافعیؒ کا واقعہ

ایک اور واقعہ مجھے اس کی تائید میں یاد آگیا۔ امام شافعیؒ کی ولادت ہوئی ہے مصر کے ایک مقام غزا میں اور ابتدائی زمانہ بھی مصر ہی میں گذرا ہے اور عمر کا بہت سا حصہ مکہ مکرمہ میں گذرا ہے اور ان کا فقہ بھی وہیں پھیلا ہے۔ اس لئے کثرت سے حجازی لوگ شوافع ہیں اور جہاں جہاں تک اثرات پہونچے شافعی بن گئے۔ اخیر زمانہ میں مصر تشریف لائے وہیں وفات ہوئی۔ مصر میں ہی مقام قاہرہ میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مزار ہے۔

امام شافعیؒ کا خط امام احمد بن حنبلؒ کو

امام شافعیؒ پر جب بڑھاپا غالب آیا اور چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے تو ان کے شاگردوں میں امام احمد بن حنبلؒ ہیں جو امامِ وقت ہیں اور ایک جلیل القدر امام کے شاگرد ہیں تو امام شافعیؒ نے امام احمد کو لکھا کہ میں تو بوڑھا ہو گیا ہوں اب سفر کے قابل نہیں رہا تم سے ملے عرصہ ہو گیا ہے ملنے کو جی چاہتا ہے اگر تم تکلیف کر کے مصر کا سفر کر لو تو تمنا پوری ہو جائے گی۔

امام احمدؒ کا جوابی خط اور مصر کو روانگی

حضرت امام احمدؒ نے لکھا کہ حضرت میں حاضر ہو رہا ہوں اور تاریخ متعین کر کے لکھ دی کہ فلاں تاریخ کو مصر پہنچوں گا۔ جب وہ تاریخ آئی تو امام شافعیؒ کے گھر میں خوشی ہی خوشی ہے۔ بچیاں اچھلتی کودتی پھر رہی ہیں کہ ایک امامِ وقت ہمارے یہاں مہمان ہوگا۔ امامِ وقت آنے والا ہے اور تمام مصر میں خوشی ہی خوشی ہو رہی ہے۔

امام احمدؒ کا استقبال

امام شافعیؒ استقبال کے لئے مصر سے کئی میل دور باہر نکل گئے اور جب وہ نکلے تو مصر کے تمام علماء ان کے ساتھ نکلے اور جب تمام علماء ساتھ نکلے تو تمام فوجی حکام بھی ساتھ ہو لئے اور جب وہ ساتھ ہوئے تو بادشاہِ وقت نے بھی کہا کہ میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔ مصر کی حکومت اور قوم سب مل کر امام احمدؒ کے استقبال کو کئی میل آگے بڑھے اور بڑے تزک و احتشام کے ساتھ امام احمدؒ کو لے کر آئے اور امام شافعیؒ کے یہاں مہمان ہوئے۔

امام شافعیؒ کی مہمان نوازی

امام شافعیؒ کی مہمان نوازی ضرب المثل ہے اس قدر مہمان نواز کہ یوں چاہتے تھے کہ سارا گھر مہمان کے پیٹ میں داخل کر دوں۔ انتہائی مدارات اور تکریم کی۔ بہت سی قسم کے کھانے پکوائے۔ اب شام کا وقت ہوا۔ دسترخوان بچھا کر امام احمدؒ کو بلایا گیا۔ امام احمدؒ نے اس طرح گر پڑ کر کھایا کہ جیسے کوئی سات وقت کا بھوکا کھانا کھا رہا ہو۔ اتنا زیادہ کھایا کہ دوسرے لوگوں کو تحیر پیدا ہوا کہ اتنا کھانا متقی کی شان سے بعید ہے کہ آدمی اپنے ناک تک بھر لے۔

ایک خلجان

جب امام شافعیؒ گھر میں پہونچے تو چونکہ فقہ وتقویٰ کا زمانہ تھا۔ بچیوں نے امام شافعیؒ کا دامن پکڑا کہ یہ کیسا امام ہے جو پیٹ بھر کر کھانا کھاتا ہے۔ یہ تو متقیوں کی شان سے بعید ہے۔ یہ کس قسم کا امام ہے جس کی آپ تعریف کرتے تھے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ مجھ سے جواب نہ بن پڑا اس لئے کہ مجھے خود ناگوار ہورہا تھا۔ تو بچیوں سے فرمایا کہ یہ خلجان میرے دل میں بھی ہے کہ احمد بن حنبل نے امام وقت ہوتے ہوئے اتنا کیوں کھایا مگر میں بول نہیں سکتا تھا۔ اس لئے کہ میں میزبان ہوں۔ اگر میں کہتا کہ تم کم کھاؤ تو اس کا مطلب ہے کہ میں اپنا کھانا بچانا چاہتا ہوں۔ میرا موقعہ نہ تھا مگر دل میں میرے بھی خلجان ہے اس لئے چپ ہو گئے۔

عشاء، تہجّد اور فجر ایک وضو سے

اس کے بعد دونوں امام عشاء کی نماز کے لئے تشریف لے گئے۔ امام شافعیؒ کی صاحبزادیوں نے بستر کیا اور چارپائی کے قریب لوٹا پانی کا بھر کر رکھا تاکہ اخیر شب میں اٹھنے میں، اور وضو وغیرہ کرنے میں دشواری نہ ہو۔ عشاء سے فراغت پر دونوں امام آکر اپنے اپنے مقامِ استراحت پر آرام فرما ہوئے۔ صبح کا وقت ہوا تو دونوں حضرات صبح کی نماز کو مسجد میں تشریف لے گئے۔ صاحبزادیوں نے آکر بستر لپیٹا تو دیکھا کہ لوٹا اسی طرح پانی سے بھرا ہوا رکھا ہے۔ اب تو اُن کے غصہ کا پارہ اور تیز ہو گیا۔ امام شافعیؒ نماز فجر سے فراغت پر جب گھر تشریف لائے تو بچیوں نے دامن پکڑ کر کہا کہ یہ کیسا امام ہے، پیٹ بھر کر یہ کھاتا ہے، رات کا تہجد اسے نصیب نہ ہو، وضو اس نے نہیں کیا، یہ کیسا امام ہے۔ جس کی آپ تعریف کر رہے تھے، یہ امام کی شان نہیں یہ تو ایک معمولی مسلمان کی شان ہے کہ بہت سے بہت پانچ وقت کی نماز پڑھ لی، امامت کا رتبہ تو بہت بلند ہے۔

امام شافعیؒ کا سوالِ تحیّر

اب امام شافعیؒ سے صبر نہ ہو سکا، بہر حال استاد تھے۔ امام احمد بن حنبلؒ سے آ کر کہا کہ اے احمد بن حنبل! یہ تغیر تم میں کب سے پیدا ہوا، کھانا کھانے بیٹھے تو تم نے کھانا زیادہ کھایا۔ میرے بولنے کا موقع نہ تھا مگر دل میں خلجان ضرور رہا۔ اس کے بعد لوٹا بھرا رکھا رہا، معلوم ہوا کہ تم تہجد کے لئے نہیں اٹھے۔

امام احمدؒ کا رفعِ خلجان

امام احمد بن حنبل مسکرائے اور فرمایا کہ حضرت واقعہ وہ نہیں ہے جو آپ سمجھ رہے ہیں۔ واقعہ کچھ اور ہے امام شافعیؒ نے فرمایا کہ کیا واقعہ ہے۔ امام احمدؒ نے فرمایا کہ جب کھانا چنا گیا تو اس کھانے پر اس قدر انوار و برکات کی بارش تھی کہ میں نے دنیا میں اتنی حلال کمائی آج تک نہیں دیکھی جتنا آپ کے گھر کا کھانا تھا۔ اس لئے میں نے چاہا کہ جتنا کھا سکتا ہوں کھا لوں چاہے بعد میں سات دن روزہ رکھنے پڑیں مگر یہ کھانا پھر مجھے نہیں ملے گا۔ یہ وجہ تو زیادہ کھانا کھانے کی ہے کہ میں نے اس کھانے پر انوار و برکات کی بارش دیکھی اور اتنا بابرکت اور حلال لقمہ میں نے عالم میں آج تک نہیں دیکھا، اور فرمایا کہ اس کی دو برکتیں ظاہر ہوئیں ایک علمی اور ایک عملی۔ علمی برکت تو یہ ظاہر ہوئی کہ رات چارپائی پر لیٹ کر قرآن کی ایک آیت سے فقہ کے سو مسئلے استخراج کئے۔ میرے اوپر علم کا ایک دروازہ کھل گیا۔ اور عملی برکت یہ کہ عشاء کے وضو سے تہجد پڑھا اور اسی وضو سے نماز فجر پڑھی، اس لئے جدید وضو کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

امام شافعیؒ پھولے نہ سمائے

امام شافعیؒ کھل گئے اور بچیوں سے کہا کہ دیکھا ہمارے یہاں امامِ وقت مہمان ہے۔ بچیوں کی خوشی کی بھی انتہا نہ رہی۔ یہ بات بھی اس پر یاد آئی تھی کہ

اکلِ حلال سے قلب میں نور اور معرفت پیدا ہوتی ہے اور مشتبہ غذا سے ظلمت اور تاریکی پیدا ہوتی ہے۔ اس سے نیکی کی توفیق بھی سلب ہو جاتی ہے کہ آدمی نیکی کرنا چاہتا ہے مگر توفیق نہیں ہوتی جیسے غالب نے کہا ہے ؎

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد ٭ پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

یہ تو معلوم ہے کہ یہ کام عمدہ ہے لیکن کرنے کو جی نہیں چاہتا اور جی اسلئے نہیں چاہتا کہ اندر لقمۂ حرام اور مشتبہ ہے تو توفیق اس سے سلب ہو جاتی ہے عمل صالح کی طرف توجہ باقی نہیں رہتی اور لقمۂ حرام میں یہ اثر ہے کہ توفیق بھی چھن جاتی ہے اور قلب میں کدورت بھی پیدا ہوتی ہے۔

شاہ جی عبد اللہ شاہ دیوبندی کا واقعہ

اس پر مجھے اپنے ہی بزرگوں کا ایک واقعہ یاد آیا۔ ہمارے یہاں دیوبند میں ایک بزرگ تھے۔ شاہ جی عبد اللہ شاہ گذر اوقات کے لئے انھوں نے گھاس کھودنے کا مشغلہ اختیار کیا تھا۔ گھاس کھود کر گٹھڑی بناتے، اسے بیچتے اور اس سے گذر اوقات کرتے اور گٹھڑی کی قیمت متعین تھی چھ پیسے، نہ کم لیتے تھے نہ زیادہ۔ بارہ مہینے ایک ہی قیمت تھی۔ دیوبند کے لوگوں کا یہ حال تھا کہ جو لوگ اپنے جانوروں کے لئے گھاس خریدنے آتے تھے تو ہر ایک کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ شاہ جی کی گٹھڑی میں خرید لوں۔ حالانکہ سینکڑوں گھسیارے اپنی اپنی گٹھڑیاں لئے بیٹھے رہتے تھے لیکن ان سے کوئی نہ خریدتا تھا بلکہ شاہ جی کو ترجیح دیتے تھے کہ اس میں ہمارے جانوروں کے لئے بھی برکت ہوگی اور ہمارے گھر میں بھی۔ اسی لئے پہلے سے انتظار میں کھڑے رہتے تھے، جب دیکھا کہ شاہ جی سر پر گٹھڑی لئے آرہے ہیں تو سب لوگ خریدنے دوڑتے تھے، جس نے گٹھڑی پر پہلے ہاتھ رکھ دیا بس گٹھڑی اسی کی ہو جاتی تھی اور وہ وہیں پر گٹھڑی

ڈال دیتے تھے۔ چھ پیسے لئے اور کہہ دیا کہ لے جاؤ اپنی گٹھڑی، پھر ان چھ پیسوں میں ان کے یہاں یہ طریقہ تھا کہ دو پیسے تو وہیں صدقہ کر دیئے اور دو پیسے گھر کا خرچ تھا۔ ایک کوڑی کی لکڑی لی، ایک پائی کا تیل لیا، ایک ادھیلہ کا آٹا لیا (سستائی کا زمانہ تھا۔ دو پیسے میں خاندان کا گذر ہوتا تھا) اور دو پیسے جمع لیا کرتے تھے۔ سال بھر میں جب آٹھ دس روپئے جمع ہو جاتے تو ہمارے اکابر کی دعوت کیا کرتے تھے۔ جن میں مثلاً حضرت نانوتویؒ، حضرت گنگوہیؒ، حضرت مولانا محمد یعقوبؒ وغیرہ وغیرہ ہوتے تھے۔

اکلِ حلال کی برکت اور نورانیت

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ فرماتے تھے کہ سال بھر ہمیں انتظار رہتا کہ کب وہ وقت آئے کہ شاہ جی کے گھر کی دعوت کھائیں اور فرماتے کہ جس دن ان کے گھر کی دعوت کھا لیتے تو چالیس چالیس دن قلب میں ایک نور رہتا تھا اور طبیعت میں ایک اُمنگ رہتی تھی کہ یہ بھی نیکی کر لوں اور یہ نفلیں بھی پڑھ لوں اور یہ تلاوت بھی کر لوں۔ یہ ذِکر بھی کر لوں۔ چوبیس گھنٹے یہ جذبہ اُبھرتا تھا۔ یہ اِس اکلِ حلال ہی کی برکت تھی۔

لقمۂ حرام کو شریعت نے ممنوع قرار دیا ہے

اسلام نے سب سے زیادہ زور اکلِ حلال پر دیا ہے اس لئے جتنی ایسی چیزیں ہیں کہ جس سے لقمہ میں کوئی حرمت پیدا ہو، کوئی شبہ پیدا ہو، کوئی ناجائز شکل پیدا ہو ان سب چیزوں کو شریعت نے ممنوع قرار دے دیا، سود کو حرام کر دیا۔ اِحتکار کو حرام قرار دے دیا۔ اِحتکار کے معنی ہیں گرانی کی اُمید پر مال کو روک کر رکھنا۔ اِحتکار کی صورت میں مخلوق کو ستانا ہے اور مخلوق کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اُٹھانا ہے۔ ضرورت ہوتے ہوئے

مال کو اپنے نفع کے لئے روک کر رکھنا، ایسی تمام چیزیں حرام قطعی ہیں اور کچھ "کرہی،" ہیں۔ مگر ایسی تمام چیزوں کو شریعت نے ممنوع قرار دیا ہے کہ جن سے مال میں کسی قسم کا اِشتباہ پیدا ہو، کوئی حرمت پیدا ہو یا کوئی کراہت پیدا ہو۔

دُنیا وسیلۂ آخرت ہے نہ کہ مقصد

مقصد اس کا یہ ہے کہ مسلم پیدا ہوا ہے دنیا میں اپنی آخرت بنانے کے لئے۔ دنیا اس کے لئے وسیلہ ہے۔ وسیلہ اس کا اگر گندہ بنا تو مقصد میں بھی گندگی آجائے گی۔ وسیلہ اگر پاک ہے تو مقصد بھی پاک ہو گا۔ اسی لئے مقصودِ اصلی آخرت ہے گو اس کے لئے دنیا وسیلہ ہے۔ اس کے قواعد بنا دیئے ہیں کہ جائز طریق پر کماؤ، جائز طریق پر خرچ کرو، ناجائز اور حرام، مکروہ اور مشتبہ چیزوں سے بچو، نہ بچنے کی صورت میں نہ صرف یہ کہ برکت نہیں ہوگی بلکہ برکت نہ ہونے کے ساتھ ساتھ ظلمت بھی ہوگی اور اس کے آثار ناپاک ظاہر ہوں گے عمل میں بھی اور اخلاق میں بھی۔

لقمۂ حلال کی قدر اور لقمۂ حرام سے احتراز

یہ دو تین واقعے میں نے اس لئے سنا دیئے کہ لقمۂ حلال کی کتنی قدر و قیمت ہے اور لقمۂ حرام اور لقمۂ مشتبہ سے شریعت نے کتنا بچایا ہے۔

حرام میں برکت نہیں

اگر ہم قومی خدمت کریں اور ہم اس کے اندر اشتباہ پیدا کریں یا کم از کم مکروہ چیزیں داخل کر دیں اور یا صریح حرام چیزیں داخل کر دیں تو اس سے برکت کیا ہوگی بلکہ خود بھی مبتلا ہوں گے غلاظت میں اور قوم کے قلب میں بھی غلاظت بھرنے والے ہوں گے ان کے دل میں بھی خیر و برکت پیدا نہیں ہوگی، اس لئے یہ نیّت تو نہایت

نیک ہے کہ سرمایہ جمع کیا تاکہ قوم کو فائدہ پہونچے۔

تحفظِ سرمایہ کی صورت

سرمایہ کے تحفظ کی صورت بجائے حرام کے جائز شکل کیوں نہیں اختیار کر لیتے، مضاربت کی صورت کرلیں۔ دو چار افراد اپنی تجارت میں لگادیں اور حسبِ رقم اس کا مُنافع دیتے رہیں۔ رقم بھی محفوظ رہے گی، مُنافع بھی چلتا رہے گا اور ترقی بھی ہوتی رہے گی۔

حرام کی طرف مسلم کی طبیعت نہیں جانی چاہیئے

آخر اس کے معنیٰ کیا ہیں کہ مسلمان نفع کمائے، تو اس کی طبیعت حرام اور مکروہات کی طرف کیوں جاتی ہے جبکہ وہ اللہ اور رسولؐ کو مانتا ہے، اس کی طبیعت اور فطرت کا تو تقاضہ یہ ہونا چاہیئے کہ مشتبہ چیزوں سے بچے اور جائز وحلال چیزوں کی طرف چلے تاکہ اپنا بھی نفع ہو اور دوسروں کا بھی نفع ہو، تو بھید یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ بات کیا ہے کہ صاحب سود سے کریں گے قوم کی خدمت، کوئی فرعی چیز ہو یا کوئی اجتہادی چیز ہو تو اس میں کچھ گنجائش نکالیں بھی ایک صریح اور قطعی حرام چیز اور آدمی اس سے فائدہ سوچے۔ یہ کسی طرح مناسب نہیں۔

حرام میں شفا نہیں

بیماری اور دواؤں کے سلسلے میں حدیث پاک میں فرمایا گیا ہے اِنَّ اللّٰہَ لَمْ یَجْعَلْ شِفَآءَکُمْ فِیْمَا حَرَّمَ عَلَیْکُمْ، اللہ نے ان دواؤں میں تمہارے لئے شفا نہیں رکھی جو دوائیں حرام ہیں، شراب ہے، قمار کی چیزیں ہیں، جوا ہے، اِن میں شفا نہیں ہے اگر ظاہری طور پر شفا ہوئی بھی تو رُوح اتنی بیمار ہوگی کہ بدن پھر آخر غلیظ اور گندہ ہوگا، پھر بیمار پڑے گا۔ جب مادی امراض کی شفا بھی حرام میں نہیں تو رُوحانی

امراض کی شفا کیسے ہو جاوے گی حرام کے اندر، اور وہ بھی قطعی، اس لئے یہ سوال ہی آنا نہیں چاہیئے، نیت نیک ہے، جذبہ نیک ہے پھر قومی خدمت کرے، کوئی بینک ایسا قائم کرے جو شرعی جواز کے تحت میں ہو، ذرا سے ہیر پھیر سے ایک ناجائز چیز جائز بن جاتی ہے، ذرا سا تغیر کر دو وہی نفع رہے گا مگر جائز بن کر رہے گا۔

میرٹھ کے ایک دیندار اور متقی تاجر کا واقعہ

ہمارے یہاں میرٹھ میں ایک تاجر تھے حاجی عبدالغنی صاحب مرحوم، وہ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب سے بیعت تھے۔ نہایت دیندار تاجروں میں سے تھے اور ٹوپیوں کی ان کے یہاں تجارت تھی۔ میرٹھ کی ٹوپیاں اس زمانہ میں مشہور تھیں اور ریشم کے زری کا کلابتور کا کام بھی ان کے یہاں ہوتا تھا۔ دارالعلوم کے ایک فاضل کو دو ٹوپیاں بنوانے کی ضرورت پیش آئی تو انھوں نے حاجی صاحب سے فرمائش کی مگر یہ کہا کہ مُغرق ہونی چاہئیں، کپڑا نظر نہ آئے، صرف سچی زری کا کام ہو کپڑے کے اوپر، اور کپڑا اس زری کے اندر چھپ جائے۔ اسے مُغرق کہتے ہیں گویا کپڑا زری میں غرق ہے۔ حاجی صاحب نے ٹوپیاں بنوادیں۔ دس پندرہ روز میں مولوی صاحب سے کہا ٹوپیاں بن گئیں اور ہر ایک ٹوپی کی قیمت پندرہ روپئے ہے، مولوی صاحب نے کہا کہ بہت اچھا ٹوپی دیدیجئے، قیمت کل کو آجائے گی۔ حاجی صاحب نے کہا کہ قیمت کل کے بجائے چاہے دو مہینے میں آجائے آپ سے کوئی بے اعتباری نہیں لیکن یہ جائز بھی ہے یا نہیں، اس کو سوچئے۔ مولوی صاحب کہنے لگے ناجائز ہونے کی کیا بات ہے۔ حاجی صاحب نے کہا کہ مغرق کپڑا حکم میں زری کے ہوتا ہے اس میں اُدھار جائز نہیں ورنہ سود ہو جائے گا، وہ تو

نقداً، یداً بید، مثلاً بمثلٍ، ہاتھ در ہاتھ، برابر سرابر ہونا چاہیئے۔ اس میں اُدھار جائز نہیں، اس لئے کہ وہ چاندی کی بیع ہے، وہ کپڑے کی بیع نہیں، کیونکہ مغرق کپڑا چاندی کے حکم میں ہوتا ہے تو اس لئے قیمت تو جب چاہے آجائے کوئی بے اعتباری نہیں، مگر یہ جائز نہیں، تو وہ نادم ہوئے اور انھوں نے کہا کہ میں فاضل دارالعلوم ہوں اور یہ دوکان پر بیٹھنے والے اَن پڑھ، انھیں اتنے مسئلے معلوم اور مجھے اس کا پتہ بھی نہیں۔ بہت ندامت ہوئی۔ کہا کہ حاجی صاحب میں شرمندہ ہوں۔ واقعی مجھے ذہول ہوا۔ مسئلے کی طرف التفات نہیں میں دو تین دن میں آؤں گا اور نقد خرید کرلے جاؤں گا۔

حاجی صاحب نے کہا کہ ایسی صورت نہ تمھیں بتادوں کہ نقد بھی ہوجائے اور اُدھار بھی ہوجائے اور جائز بھی ہوجائے، کہنے لگے کہ وہ کیا صورت ہوگی، حاجی صاحب نے کہا کہ تم تیس روپئے مجھ سے قرض لے لو، ٹوپیاں نقد خرید لو اور قرض چاہے دو مہینے میں ادا کردیجئے، کہنے لگے کہ میں فاضلِ دارالعلوم ہوکر بھی میری ان مسائل کی طرف التفات نہیں اور یہ تجّار دوکان پر بیٹھ کر اتنے مسائل جانتے ہیں۔ یہ اثر تھا اہل اللہ کی صحبت کا۔ خود عالم نہیں تھے مگر علماء کی صحبت میں بیٹھنے والے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے اندر حرام وحلال کی تمیز کا اس قدر مادہ تھا اور حرام سے بال بال بھی بچنے کی کوشش کرتے تھے اور یہی جذبہ تھا کہ مسائل پر اتنی نظر تھی کہ وہی کام اُدھار بھی ہوگیا اور جائز بھی ہوگیا صرف تھوڑے سے تغیر سے۔

رائے

تو ایسا کیوں نہ کیا جائے کہ اس لاکھ ڈیڑھ لاکھ کو باقی رکھنے کی صورت کو ذرا سی تبدیل کرکے حدِ جواز میں لے لی جائے تاکہ حرام سے بچا جائے۔

مسلم اور غیر مسلم میں فرق

مسلمان کا تو نام ہی یہ ہے کہ صاحبِ معاملہ ہو، اس کے اندر اطاعت ہو عبادت ہو، وہ حرام و مکروہ سے بچ کر حدِ جواز کی طرف آئے یہی معنی اس کے اِسلام کے ہیں ورنہ مُسلم اور غیر مُسلم میں فرق کیا باقی رہ گیا۔ وہ بھی سُود خور، تم بھی سُود خور، وہ بھی حرام خور، اور تم بھی حرام خور۔ ہم تو تمھیں حلال خور بنانا چاہتے، حرام خور نہیں بنانا چاہتے ہیں۔ آدمی اَکلِ حلال پر رہے۔

مشورہ

میں عرض کرتا ہوں کہ نیّت بھی نیک ہے، جذبہ بھی نیک، اور قومی خدمت کا جذبہ مبارک، ذرا سا تغیر کر کے اس کو حدِ جواز میں لے لیں، کیوں حرام کی طرف جا رہے ہیں کہ قوم کی رُوح کو بھی گندہ کریں اور خود بھی گندے بنیں اور آخرت کا مؤاخذہ الگ، کوئی بینک قائم کر دیں یا کوئی ایسی صورت قائم کر دیں کہ اپنی تجارت میں لگالیں، یا کوئی کمپنی تجارت کی بنا دیں اور اس میں شرکاء ہوں، نفع و نقصان کے شریک رہیں، اور پھر وہ رفاہِ عام کے لئے خرچ کریں تو اس سے رأسُ المال بھی محفوظ رہے گا۔ اور بڑھتا بھی رہے گا، تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ لوگ کیوں ایسا کر رہے ہیں اور کس قسم کا وہ اِسلام ہے جو اس پر ان کو آمادہ کر رہا ہے۔

ایک اور سوال اور جواب

دورانِ گفتگو میں ایک صاحب نے سوال کیا کہ حضرت! کہا جاتا ہے کہ اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً رِبٰوا ہے صرف ربٰو حرام نہیں ہے۔ اس پر حضرت نے دریافت فرمایا کہ یہ عُلماء کہتے ہیں یا تاجر کہتے ہیں۔ سائل نے کہا کہ حضرت یہ بات ڈاکٹر فضلُ الرحمٰن نے کہی تھی۔ رسالوں میں لوگوں نے دیکھ لی ہے۔ اس کو بہانہ بنایا جا رہا ہے حضرت نے فرمایا کہ رسالوں میں تو بہت سے مَضامین آتے رہتے ہیں اہلِ حق

کے بھی اور اہلِ باطل کے بھی، مُأوِّلین کے بھی اور مُکذِّبین کے بھی لیکن ان میں سے چھان بین کر کے حق اور صواب کو نکالنا یہ تو متدیّن علماء کا کام ہے اور تاجر جو متہم ہوں پیسہ کمانے کی خاطر ان کی بات کا کوئی اعتبار نہیں، وہ تو ایسی چیزوں کا حیلہ تلاش کریں گے کہ ان کا نفع ہاتھ سے نہ جائے، وہ جائز ناجائز کی پرواہ نہیں کرتے۔ یا تو فتویٰ لیا جائے ایسے علماء سے جو متدین ہوں، ملک وقوم کو جن کے دین و دیانت پر اعتماد ہو اور علم ان کا مستند ہو، قوتِ مطالعہ سے جو علم آتا ہے اس میں امام اپنا نفس ہوتا ہے جو چاہے کرے اور نفس ہے نا تہذیب یافتہ، اس لئے یہ معتبر نہیں کہ فلاں وکیل صاحب نے یہ کہدیا اور فلاں ڈاکٹر صاحب نے یہ کہدیا اور فلاں منسٹر صاحب نے یہ کہدیا۔ تو جس کے آخر میں "ٹر" ہو ہم اس کی بات نہیں مانیں گے (برسبیل لطیفہ فرمایا)، کوئی عالمِ متدین کہے یا فتویٰ دے یا مُستند اداروں سے فتویٰ حاصل کیا جائے وہ اجازت دیدیں تو آپ بے تکلف عمل کریں، فلاں نے کہہ دیا، اس نے کہہ دیا۔ یہ قابلِ اعتبار بات نہیں۔

سُودی مُعاملہ مسلم اور حَربی کے درمیان بھی جائز نہیں

ایک صاحب نے سوال کیا کہ حدیث لَا رِبٰوا بَیْنَ الْمُسْلِمِ وَالْحَرْبِی کے تحت مُسلم اور حَربی کے درمیان سود کا معاملہ ہو سکتا ہے، حضرت نے فرمایا کہ یہ حدیث لَا رِبٰوا بَیْنَ الْمُسْلِمِ وَالْحَرْبِی کہاں ہے اور اس حدیث کے ساتھ جو دوسری حدیث ہے وہ آپ کے سامنے نہیں۔ یہ ائمہ میں خود مختلف فیہا مسئلہ ہے قطعی بات یہ ہے کہ سود کسی حالت میں جائز نہیں، اب جو کہتے ہیں لَا رِبٰوا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ رِبٰوا جائز ہے بلکہ اس کا یہ مطلب ہے کہ وہ رِبٰوا ہوتا ہی نہیں۔

دارالحرب کا مطلب

مسلم اور کافر کے درمیان دارُالحرب میں معاملہ اور ہوتا ہے اور پھر دارُالحرب میں یہ بھی قید ہے کہ جنگ جاری ہو، حالت راہ نہ دے۔ اس وقت کا یہ مسئلہ ہے۔ ایک دارُالحرب کے یہ معنی ہیں کہ شعائرِ اسلام وہاں بلند نہ ہوں۔ اس کے مسائل دوسرے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر دارُالحرب مان لیا جاوے تو دارالحرب کے دوسرے احکام سامنے نہیں۔ دارُالحرب جب ہو تو ہجرت کرنی واجب ہے ملک چھوڑ کر دارُالاسلام کی طرف جائیے۔ اس کی تو جرأت کرتے نہیں کہ یہ دارُالحرب ہے۔ اسے چھوڑ کر دارُالامن اور دارُالاسلام میں جانا چاہیئے، اسکا دھیان کسی کو نہیں جاتا۔ جب دھیان جاوے تو پیسہ کی طرف جاوے گا۔ تو دارُالحرب کا حیلہ مل گیا ہے پیسہ بٹورنے کو۔ یہ حیلہ جوئی اور پیسہ بٹورنا ہے تدین اور تقوٰی جسے کہتے ہیں وہ نہیں ہے۔

دارُالحرب سے ہجرت ضروری ہے

اگر دارُالحرب مانتے ہیں تو دوسرے مسائل پر کیوں نہیں عمل کرتے مثلاً ہجرت ضروری ہے۔ وہ قوت پیدا کرنا ضروری ہے جس سے دارُالحرب دارالاسلام بنے۔ کفار سے جنگ کرو، اس کی تیاری کرو اور پیسہ اس میں لگاؤ، جہاد کے لئے ہتھیار فراہم کرو۔ اس کے لئے کوئی صاحب تیار نہیں کوئی صاحب آمادہ نہیں، دارُالحرب صرف اس لئے رہ گیا ہے کہ سودی لین دین جائز ہو جائے اور بینک کا سود جائز ہو جائے۔ اس وقت دارُالحرب کے متعلق یہی ایک مسئلہ نہیں ہے بلکہ ہجرت بھی ہے، جہاد بھی ہے۔ قومی معاملات بھی ہیں۔ کتنے ہی مسائل دارُالحرب کے متعلق ہیں تو پھر آخر پیسہ ہی کیوں سامنے آتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جذبہ پیسے کا ہے اور دارُالحرب حیلہ ہے

اور جذبات دوسرے ہیں۔ دارالحرب کی آڑ لے کر پیسہ بٹورنا چاہتے ہیں سودی لین دین کر کے۔

دارالحرب اور سود لازم و ملزوم نہیں

ایک صاحب نے سوال کیا کہ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کا فتویٰ ہندوستان کے دارالحرب ہونے کے بارے میں ہے پھر اس کا کیا جواب ہوگا؟ اس پر حضرت نے فرمایا کہ ہمارے اکابر کا بھی یہ فتویٰ ہے تو کیا ان کا یہ بھی فتویٰ ہے کہ سودی لین دین بھی کرو۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فتویٰ دیا تھا اس زمانے میں جبکہ انگریز کا کامل تسلط تھا لیکن کیا انھوں نے یہ بھی فتویٰ دیا تھا کہ سودی لین دین بھی شروع کردو؟۔

سود پر ایک دلچسپ مباحثہ

حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ، حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ اور حضرت مولانا مرتضیٰ حسن صاحب چاند پوریؒ لاہور تشریف لے گئے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ حضرت مولانا طفیل احمد صاحبؒ زندہ تھے جو مُسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں رجسٹرار تھے اور صحیح دیندار لوگوں میں تھے تھے۔ بی اے بھی تھے۔ ان کی رائے یہ تھی کہ سودی لین دین جائز ہونا چاہیئے بغیر اس کے قوم ترقی نہیں کرسکتی۔ انھوں نے اس سلسلے میں ایک رسالہ بھی نکالا تھا "سودمند" نام کا۔ سود کے جواز کے جتنے حیلے مل سکتے تھے اس میں وہ سب موجود تھے اور باقاعدہ اس کی اشاعت وطباعت کی گئی۔ اس پر مجھے ایک لطیفہ یاد آیا۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے ان کا ذکر کیا کہ حضرت! وہ سُود کے جواز کی فکر میں ہیں۔ حضرت نے فرمایا کہ لونڈے کی بات کا کیا اعتبار۔ ذکر

کرنے والے نے کہا کہ حضرت! وہ لونڈا ہے؟ وہ تو (مولانا طفیل احمد صاحب) بوڑھے آدمی ہیں۔ حضرت نے فرمایا کہ جس کا نام طفیل ہے (طفیل کے معنی ہیں چھوٹا سا بچہ) تو وہ لونڈا نہیں تو اور کیا ہے۔ خیر اس زمانے میں یہ قصہ چل رہا تھا اور یہ سب حضرات لاہور پہونچے۔ مولانا ظفر علی خاں صاحب (ایڈیٹر زمیندار) اور ڈاکٹر اقبال اور دوسرے بڑے بڑے لوگ ملنے کی خاطر حاضر ہوئے۔ اتفاق سے مولانا ظفر علی خاں صاحب بھی کچھ اسی خیال کے تھے جو خیال مولانا طفیل احمد صاحب کا تھا۔ انھوں نے سود کے جواز پر آدھ گھنٹہ بڑی مُدلل تقریر کی اور اقتصادی دلائل وغیرہ سے ثابت کیا۔ مقصد یہ تھا کہ یہ حضرات ذرا کچھ مائل ہوں گے۔ ڈھیلے پڑیں گے سود کے سلسلے میں حضرت شاہ صاحب نے جو جواب دیا وہ تو صرف دو لفظوں کا تھا۔ ان کی بات تو ایسی تھی۔ فرمایا کہ "بھائی ہم پُل بننا نہیں چاہتے۔ جسے جہنم میں جانا ہو خود جائے، ہماری گردن پر پیر رکھ کر نہ جائے۔" یہ جواب سن کر سب چپ بیٹھے رہے۔ علّامہ اقبال بھی اور مولانا ظفر علی خاں صاحب بھی۔ کسی کو بولنے کی ہمّت نہ ہوئی۔ پھر علّامہ شبیر احمد صاحب عثمانی نے آدھ گھنٹہ بڑی مفصّل تقریر کی جس میں انھوں نے دلائل سے ثابت کیا کہ سود ہر حالت میں حرام ہی ہے کسی صورت میں بھی جائز نہیں۔

قومی ہمدردی کا صحیح طریقہ

یہ سلسلہ بہت دنوں سے چل رہا ہے اور قومی ہمدردی کے نام پر چل رہا ہے اور ایسے ہمدرد پیدا بھی ہوئے اور گذر بھی گئے اور دوسرے ہمدرد بھی پیدا ہوئے وہ بھی گذر گئے اور بھی پیدا ہوں گے وہ بھی گذر جائیں گے مگر مسئلہ اپنی جگہ اٹل رہا ہے اور رہے گا۔ اس سلسلہ میں اگر خلجان ہے تو سیدھی سی بات ہے

کہ جو معتمد اور مستند ادارے ہیں ان سے استفتاء کرلیں۔ اس میں منشا ظاہر کرو کہ ہم نے اتنی رقم جمع کی ہے اور ہمارا منشا یہ ہے کہ قوم کی خدمت ہو اور رقم محفوظ رہے۔ اس کے منافع سے قوم کو فائدہ پہونچے۔ اس کی جائز صورتیں کیا ہوسکتی ہیں۔ ایک صورت یہ ہے کہ سود لیا جائے، ایک صورت یہ ہے کہ تجارت میں لگا دیا جائے تو اس بارے میں شریعت کا کیا حکم ہے، جو وہاں سے مستند فتویٰ آجائے اس پر عمل کیا جائے۔ اجر بھی ملے گا اور قوم کا فائدہ بھی ہوگا۔

دین کا مدار حجّت پر ہے کثرت پر نہیں

ایک صاحب نے پوچھا کہ اگر جماعت کی اکثریت نے فیصلہ کردیا کہ سود کا روپیہ لے لیا جائے، اس میں کچھ حرج نہیں۔ تو اس میں شریعت کا کیا حکم ہے؟ حضرت نے فرمایا کہ دین کا مدار مجاریٔ پر یا دوسروں کی گنتی پر نہیں ہے۔ یہ کوئی کونسل یا اسمبلی کے فیصلے تھوڑا ہی ہیں۔ اسمبلی میں سر گنے جاتے ہیں، سروں کی تعداد پر فیصلہ ہوتا ہے۔ سروں کے اندر کی چیز نہیں دیکھی جاتی یعنی عقل بھی ہے یا نہیں، اس کا کوئی خیال نہیں کیا جاتا۔ بلکہ تعداد کی زیادتی پر فیصلے ہوتے ہیں اور دین کا مدار حجت پر ہے، اس کے بارے میں تو علامہ اقبال صاحب نے بڑی اچھی بات کہی ہے، فرماتے ہیں:

بترس از طرزِ جمہوری اسیر پیر دانا شو
کہ از مغز دو صد خر فکرِ انسانی نمی آید

کہ اس جمہوری طرز کو چھوڑ دو اور کسی پیر دانا کے قیدی بن جاؤ۔ اگر دو سو گدھے جمع ہو جاویں تو انسانی فکر تھوڑے ہی ان کے دماغ میں سے نکلے گی دو سو، چار سو گدھے جمع ہو جائیں تو گدھے کا خیال ہی نکلے گا۔ انسانی فکر کہاں

سے نکلے گا۔ انسانیت ہو تو جب ہی انسانیت کی بات ذہن سے نکل سکتی ہے اور انسانیت وہاں مفقود ہے تو بیوقوفی کا خیال ذہن سے برآمد ہوگا۔ اسی کو قرآن کریم نے کہا ہے وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ زمین میں بیوقوفوں کی جو اکثریت ہے اس کا اتباع مت کرو وہ تم کو گمراہ کر کے رہیں گے۔ حق کے راستے سے ہٹا کر چھوڑیں گے۔ اس لئے اگر اکثریت فیصلہ کرے تو وہ دینی حجت کے مقابلے میں کوئی کارگر نہ ہو سکے گا۔ خواہ پوری دُنیا کے انسان اس فیصلے کو بل کر پاس کر دیں اور دینی حجت اس کے خلاف ہو۔ لہٰذا سُود حرام ہی رہے گا۔ جیسے شریعت نے حرام قرار دیا ہے کسی کے حلال یا جائز کرنے سے جائز نہیں ہوگا۔ پاخانے کو کتنا ہی دھولو، صاف کر لو وہ پاخانہ ہی رہے گا۔ پاک تو ہونے سے رہا، ناپاک ہی رہے گا اور اس پانی کو بھی ناپاک کر دے گا جس پانی سے اس کو پاک کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ تو ایسے ہی ایک حرام قطعی چیز خود تو حلال نہیں ہوگی۔ اُوپر سے ان اذہان کو بھی اپنی رَو میں بہا کر گندہ کر دے گی۔ جن اذہان میں اس قسم کے تصورات آتے رہتے ہیں کہ اپنے مفاد کی خاطر ایک حرام شے کو حلال کریں۔ اس لئے ایسے تصورات آتے رہنے ہیں نہ جمانے چاہئیں اور نہ ہی ایسے ارادے کرنے چاہئیں۔ جب کوئی شے حلال طریقہ سے حاصل ہو سکتی ہے تو اس کے حصول میں حرام طریقہ کو کیوں استعمال کریں۔ اللہ ہمیں محفوظ فرمائیں اس قسم کے خیالات سے۔

دُعا پر مجلس ختم ہوئی۔

دوسری مجلس ۳۵

انبیاء، واولیا اور اطفال کی عصمت میں فرق ہوتا ہے۔

ایک صاحب نے سوال کیا کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام باجماعِ اُمت معصوم ہیں۔ ان کی عصمت میں کسی کو کلام نہیں۔ اور قبل البلوغ بچے بھی ازروئے شرع معصوم ہیں کیونکہ شریعت نے قبل البلوغ ان کے کسی فعل شنیع پر دارو گیر نہیں کی۔ لہٰذا ان کی عصمت بھی متفق علیہ ہے اور اولیاء اللہ بھی گناہ سے بہت بچتے ہیں، اس اعتبار سے وہ بھی معصوم ہوئے تو اب حضور والا وضاحت فرمادیں کہ ان کی عصمت میں کچھ تفاوت ہے یا سب کی عصمت ایک ہی قسم کی ہے۔

اس پر حضرتؒ نے ارشاد فرمایا کہ ہاں بھائی فرق ہے اور وہ یہ ہے کہ بچوں کے اندر جو قوت ہے گناہ کی وہ اس وقت بیدار نہیں۔ وہ اُبھار جس کا تعلق فعل سے ہے وہ اُبھری ہوئی نہیں ہے، صرف مادہ موجود ہے اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام میں مادہ بھی موجود ہے اور نفس بھی موجود ہے اور پھر نفس کا مقابلہ کرکے گناہ سے بچتے ہیں اور یہ کمال ہے۔

گناہ کا منشاء

فرمایا کہ انسان میں گناہ کا منشا صرف دو چیزیں ہیں۔ حبِ جاہ اور حبِ باہ۔ اسی لیے بعض گناہ تو سرزد ہوتے ہیں جاہ طلبی سے مثلاً آدمی اقتدار چاہتا ہے، اس کے لئے دوسروں کی توہین کرتا ہے تذلیل کرتا ہے، زبردستی دباتا ہے جس کو اس زمانے کی اصطلاح میں استحصال عوام کہتے ہیں یعنی عوام کو حاصل کر کے ایک شخص لیڈر بنتا ہے، پھر چاہے دوسروں کا خون ہو، مگر اسے کرسی ملی، اسے عزت ملی، ہزاروں مخلوق برباد ہوتی ہے، کٹ جاتی ہے مگر اس کی لیڈری چمک جاتی ہے۔ اس کا منشا ہوتا ہے حبِ جاہ اور محبتِ اقتدار۔

حُبِّ جاہ۔

ایک شخص اپنے کو بڑا جانتا ہے تو ظاہر بات ہے کہ وہ کسی کو سلام کرنے میں اپنے لئے عار محسوس کرے گا چاہے گا کہ دوسرے مجھے سلام کریں میں بڑا آدمی ہوں، یہ چھوٹے ہیں، ان کا فرض ہے کہ یہ میرے آگے جھکیں، تو کبر کے معنے فقط بڑے بننے کے نہیں ہیں، بلکہ تحقیر ناس یعنی لوگوں کو حقیر سمجھنا اور ذلیل جاننا اور اپنے کو ان سے بالاتر، اور بڑا جاننا یہ حقیقت ہے کبر کی، اور یہ جذبہ انسان میں موجود ہے۔ اس سے سینکڑوں گناہ متعلق ہیں، لڑائی جھگڑا، گالم گلوج، مارپیٹ، قتل و غارتگری، اور دنیا بھر کے سینکڑوں گناہ محض جاہ کی وجہ سے عمل میں آتے ہیں، آدمی اپنے کو چھوٹا سمجھے تو اس قسم کے گناہ کا انسداد ہو سکتا ہے۔

حُبِّ باہ (شہوت رانی)

ایک جذبہ انسان میں باہ کا ہے یعنی شہوانی قوت کا ہونا، ہزاروں گناہ اس سے متعلق ہیں۔ یہ شہوتیں دو ہیں۔ ایک شہوتِ بطن ہے اور ایک شہوتِ فرج ہے۔ انسان شہوتِ بطن کو پورا کرنے کے لئے کھانے پینے کی چیزیں جمع کرتا ہے

اور شہوتِ فرج سے اس کو نکالنے کی کوشش کرتا ہے تو ہزاروں گناہوں کا سرچشمہ یہ بھی ہے۔ اس قسم کی شہوت کو پورا کرنے کے لئے حلال وحرام کی کوئی تمیز نہ رہے گی، مال حاصل کرنے میں جائز وناجائز کی پرواہ نہ کرے گا، چوری ہو، رشوت ہو، سود ہو، بہر حال کسی طرح سے پیسہ جمع ہو اور اس سے نفس کے اندر وہ قوت بڑھے جس سے شہوانی جذبات پورے ہوسکیں تو شہوتِ بطن کا حاصل ہے مرغوباتِ نفس کو بٹورنا اور جمع کرنا، مال ہو، لباس ہو، سامان ہو، آدمی اسے حاصل کرے جس طرح بھی ہو سکے۔ جب اس قوت میں آدمی غرق ہو جاتا ہے اس کو حرام وحلال کی کوئی پرواہ نہیں رہتی۔ جیب کترے جیب کترتے ہیں، چوری کرنے والے چوری کرتے ہیں، ڈکیتی ڈالنے والے ڈکیتی ڈالتے ہیں۔

قانونی ڈکیتی — ایک خاص قسم کی ڈکیتی ہے قانونی جس میں قانون کی آڑ لے کر مال بٹورا جاتا ہے، خواہ ٹیکس لگا کر خواہ کسی کو ڈرا دھمکا کر جیسے پولیس والے اکثر کیا کرتے ہیں کہ جرم ہو یا نہ ہو اسے ڈرایا دھمکایا۔ اس نے کچھ رشوت دی اسے چھوڑ دیا۔ تو مال کی تحصیل میں آدمی حرام اور حلال کی پرواہ نہیں کرتا اور ہزاروں گناہ اس سے سرزد ہوتے ہیں۔

شہوتِ فرج — ایک شہوتِ فرج یعنی شرمگاہ کی شہوت ہے، اس سے آدمی بدکاری، زناکاری، فحش، عریانی وغیرہ میں مبتلا ہوتا ہے جیسے شہوتِ بطن سے ہزاروں گناہ متعلق ہیں۔ اسی طرح شہوتِ فرج سے بھی ہزاروں گناہ متعلق ہیں۔

گناہِ شیطان اور لغزشِ آدم — عالمِ ازل میں ایک گناہ شیطان نے کیا اور ایک لغزش حضرت آدمؑ سے

سرزد ہوئی۔ شیطان کے گناہ کا منشا تھا جاہ طلبی، جب اس کو حکم دیا گیا کہ آدم کو سجدہ کرو، تو اس نے کہا کہ میں آدم کے سامنے سجدہ کیوں کروں۔ اس نے حکم عدولی کی اور یہ ہی نہیں کہ صرف اتنا ہی کہہ کر بس کر دی ہو بلکہ حق تعالیٰ کے حکم میں "مین میخ" بھی نکالی اور کہا کہ (معاذ اللہ) آپ کا یہ حکم خلافِ فطرت ہے خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ ۝ آپ نے مجھے آگ سے بنایا اور آدم کو مٹی سے اور آگ کی فطرت ہے سر اونچا کرنا اور مٹی کی خاصیت ہے پست ہونا۔ تو آپ نے سربلند ہونے والے کو پست کے سامنے ذلیل ہونے کا کیوں حکم دیا۔ میں اونچا ہونے والا اس پست کے آگے کیسے جھک جاؤں یہ گناہ حکم عدولی کا تو سرزد ہوا ابلیس لعین سے، جس کا منشا جاہ طلبی، عزت، حسب، کبر، رعونت، فرعونیت۔ اور ایک لغزش سرزد ہوئی حضرت آدمؑ سے وہ حقیقۃً گناہ تو نہیں تھی بلکہ غلط فہمی تھی، اور وہ یہ کہ شجر ممنوعہ کے کھانے سے روکا گیا تھا اور باقی جنت کی تمام نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کا حکم تھا اور اس درخت کے پاس تک جانا ممنوع تھا، کھانا تو درکنار، وہ درخت حضرت آدمؑ نے کھا لیا لیکن حکم عدولی کا کوئی واہمہ تک بھی نہ تھا۔

شیطان کی تلبیس

حضرت آدمؑ کے ذہن میں شیطان نے اولاً وسوسہ ڈالا اور تدبیر سمجھائی اور تلبیس کر کے تاویل سمجھائی کہ اس کی ممانعت ابدی نہیں ہے بلکہ خاص وقت تک تھی۔ وہ وقت نکل گیا، اب تمہارا معدہ اس نعمت کو ہضم کرنے کا متحمل ہے اور اس کی خاصیت یہ ہے کہ جو اس درخت کو کھا لے گا وہ ہمیشہ ہمیش جنت میں رہے گا۔ اس نعمت سے نہیں نکل سکے گا۔ جھوٹ بھی بولا اور دھوکہ بھی دیا اور قسم بھی کھائی وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّیْ لَکُمَا لَمِنَ النّٰصِحِیْنَ ۝ قسمیں کھا کھا کر کہ میں

تمہارا خیر خواہ ہوں، تم کھالو گے تو اَبدی طور پر جنت میں رہو گے اور اگر اس کو نہ کھایا تو ممکن ہے کہ جنت سے نکال دیئے جاؤ، اور ان کو سمجھایا کہ اَبدی حکم نہیں، بلکہ ایک وقت تک کے لئے تھا۔ اب جنت کی آب وہوا آپ میں اثر کر گئی۔ پوری طرح رچ گئی ہے۔ اب آپ کھالیں گے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ ابتدائی حالت میں کھانے میں مضرت تھی، حالانکہ حضرت آدم علیہ السلام کے ذہن میں یہ بات تھی کہ اس کی ممانعت کی گئی ہے میں کیسے کھاؤں اور حکمِ خداوندی کے خلاف کیسے کروں مگر ادھر تو اس کمبخت نے قسم کھائی اور آدم علیہ السلام چونکہ پاک قلب اور سچے قلب والے تھے، نہ دھوکے سے واقف نہ فریب سے واقف، اور اللہ کا نام لے کر ایک شخص فریب کرے تو گویا ان کے وہم میں بھی یہ نہیں آ سکتا تھا کہ کوئی آدمی خدا کا نام لے کر اور خدا کی قسم کھا کر بھی جھوٹ بول سکتا ہے، ممکن ہے کہ یہی بات ہو، اور یہ واقعہ ہے کہ جو شخص سچا ہوتا ہے اسے دھوکہ یہی یہ ہوتا ہے کہ کوئی شخص جھوٹ بھی بول سکتا ہے۔ وہ تو جھوٹ کو بہت بُری چیز سمجھتا ہے، اسی لئے سچا آدمی دوسروں کو بھی سچا سمجھتا ہے، اس کا وہم بھی نہیں جاتا کہ یہ جھوٹ بول کر دھوکہ دے رہا ہے۔ اسی واسطے محدثین لکھتے ہیں اِنَّ اَکْذَبَ الْحَدِیْثِ حَدِیْثُ الصَّالِحِیْنَ کہ صوفیاء کی حدیثیں جھوٹی ہوتی ہیں، اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ جھوٹ بولتے ہیں معاذ اللہ، وہ تو اتنے سچے ہوتے ہیں کہ اللہ کے رسولؐ کا نام لے کر کوئی راوی روایت کرے کہ اللہ کے رسولؐ نے یہ فرمایا ہے تو ان کو وہم نہیں گذرتا کہ کوئی آدمی اللہ اور رسول کا نام لے کر جھوٹ بھی بول سکتا ہے۔ وہ تو صحیح سمجھ لیتے ہیں۔ تو سچے آدمی بعض دفعہ دوسروں کے قسم کھانے کی وجہ سے اور یقین دلانے کی وجہ سے مبتلا ہو جاتے ہیں اس لئے کہ ان کا قلب تو چھل سے، فریب سے پاک ہے۔ ابلیس نے فقط تاویل ہی نہیں سُجھائی بلکہ قسم

بھی کھائی، ادھر آدمؑ پاک قلب والے ہیں۔ دھوکے سے، فریب سے واقف نہیں اور پھر جنت میں رہ کر کوئی قسم کھائے کہ اللہ کی قسم میں آپ کا خیرخواہ ہوں تو حضرت کا وہم بھی نہیں جائے گا اس کے جھوٹ بولنے پر۔ اِدھر تو ابلیس نے دھوکہ دیا اُدھر حضرت حوا نے کہا کہ اجی کھا بھی لو، ایک دانہ میں کیا حرج ہے۔ بیوی کی آدمی جلدی سُنتا ہے اور جلدی سے اس کے خلاف نہیں کرتا۔ اتنا کہنے سننے سے حضرت آدمؑ کے قلب میں یہ بات بھی بیٹھ چکی تھی کہ ممکن ہے یہی بات ہو کہ اس کی ممانعت اَبدی نہ ہو، ابتدا میں ہو۔ اب جبکہ یہاں کی آب و ہوا اثر کر گئی تو ایک آدھ دانہ کھا لینے میں کیا حرج ہے، اُوپر سے شیطان لعین نے قسمیں کھائیں اور بیوی نے دیا سہارا تو کھا لیا درخت، اسلئے حقیقۃً یہ گناہ نہیں تھا۔ گناہ کہتے ہیں جان بوجھ کر کسی حکم کی خلاف ورزی کرنا حضرت آدمؑ جان بوجھ کر خلاف ورزی کرنے سے پاک تھے۔ یہ سمجھے کہ ہو سکتا ہے کہ حکمِ خداوندی کے معنی اور مطلب یہی ہو جو یہ شخص قسم کھا کر بیان کر رہا ہے۔ ممکن ہے کہ میں غلط فہمی میں ہوں۔ اس قسم کے فریب میں آ کر مبتلا ہو کر وہ دانہ کھا لیا، یہ لغزش ہوئی صورۃً، اور حقیقۃً یہ گناہ نہیں بلکہ غلط فہمی ہے یا یوں کہنا چاہیئے کہ غلط فکری ہے یا خطاء اجتہادی ہے، یہ سرزد ہو گئی، اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام سے خطاء اجتہادی ہو سکتی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ ان کو غلطی پر باقی نہیں رکھا جاتا ہے فوراً حق تعالیٰ مُطلع کر دیتے ہیں، دوسرا کوئی مجتہد خطاء اجتہادی کرے تو ہو سکتا ہے کہ عمر بھر اسے ثواب سمجھتا رہے اور وہ حقیقت میں خطاء ہو، غرض ان چیزوں میں مبتلا ہو کر حضرت آدمؑ نے درخت کھا لیا۔

لغزشِ آدمؑ کا منشا کبر نہ تھا

مگر اس کا منشا کبر اور جاہ نہیں تھا خود ہی کہتے ہیں کہ اللہ کے حکم کی خلاف ورزی

کیسے کروں لیکن معنی حکم کے قسم کھا کر بیان کرنے والے نے غلط بیان کر دیا، اور چیز تھی کھانے پینے کی، اور کھانے پینے کی چیزوں میں قوتِ باہ اور قوتِ شہوت آگے بڑھتی ہے، کبرت و نخوت اس میں نہیں ہوتا، شیطان کے گناہ کا منشا کبر تھا اور تکبر تھا اور آدمؑ کی لغزش کا منشا حرص تھا اور حرص آدمی کی چیز ہے اور کبر درحقیقت شیطان کی چیز ہے اور اللہ تعالیٰ کے یہاں کبر کا گناہ بہت سخت ہے، وہ معاف نہیں ہو سکتا جب تک پوری توبہ نہ کرے اس نے توبہ نہ کی ابدالآباد تک کے لئے ملعون قرار دے دیا گیا اور ابدی جہنمی بنا دیا گیا اور آدم سے جو لغزش سرزد ہوئی اس میں کبر و نخوت کا (معاذ اللہ) کوئی شائبہ ہی نہیں تھا۔ زیادہ سے زیادہ حرص تھی اور اُوپر سے غلط فہمی۔ اس لئے جو گناہ شہوت سے یا باہ سے سرزد ہو وہ شدید نہیں ہوتا ہے، وہ تو آدمؑ کی خصوصیت ہے اور کبر سے جو سرزد ہو وہ تکبر ہے اور وہ حق تعالےٰ شانہٗ کی شان ہے اس میں گویا اپنے کو اللہ کا شریک بنا رہا ہے اور یہ کھلا شرک ہے، لازمی بات ہے کہ یہ کتنا بڑا گناہ ہے اسی لئے حدیث میں فرمایا گیا ہے

وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا جس میں ذرہ برابر بھی تکبر موجود ہو، جبتک کہ اس سے توبہ نہ کرے۔

کبر اور حرص

ایک گناہ وہ ہے جس کا منشا کبر و نخوت ہے اور ایک لغزش وہ ہے جس کا منشا حرص ہے، حرص سے سرزد ہونا یہ تو انسان کی جبلت ہے اور کبر سے سرزد ہونا یہ شیطان کا کام ہے، کبر میں ٹھیک مقابلہ ہوتا ہے حق تعالیٰ شانہٗ کا کہ آپ بڑے ہیں، میں بھی بڑا ہوں۔ اور باہ سے جو گناہ ہوتا ہے اس میں آدمی خود اپنے کو ہیچ سمجھتا ہے کہ میں حرص میں مبتلا ہوں

اس سے اللہ کی بڑائی میں دل کے اندر کوئی کمی نہیں آتی۔ اب نتیجہ نکال لیجئے کہ آدمؑ سے جو لغزش ہوئی وہ جاہ سے ہوئی یا باہ سے، ہمیں غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ آدمؑ کے قلب میں عظمتِ خداوندی بدستور موجود تھی اور دوسرے کی عظمت جب ہی ہو سکتی ہے جب اپنے آپ کو کم سمجھے لہٰذا حضرت آدمؑ کی لغزش میں کبر کا شائبہ تک بھی نہ تھا اور اُدھر اس کمبخت کے دل میں حق تعالیٰ کی عظمت تھی ہی نہیں اس لئے وہ اَبَدُالآباد کے لئے ملعون ہو گیا اور اِدھر ان کے سر پر خلافت کا تاج رکھا گیا جبکہ توبہ کی اور چالیس برس تک برابر روتے رہے اور بعد توبہ واستغفار کیا، حالانکہ وہ گناہ نہ تھا بلکہ وہ ایک فکری لغزش تھی۔ بہر حال میں نے عرض کیا کہ دو ہی قوتیں ہیں، ایک جاہ طلبی کی ایک باہ طلبی کی۔

بچّوں میں دونوں قوتیں بیدار نہیں

بچوں میں جاہ طلبی اور باہ طلبی کی دونوں قوتیں بیدار نہیں ہوتیں، نہ ان میں تکبر ہوتا ہے کہ وہ لیڈر بنیں، صرف کھیل کود کرتے ہیں، اسی طرح سے شہوانی مادہ تو ہوتا ہے مگر اُبھرا ہوا یا بیدار نہیں ہوتا، بلوغ سے قبل اس میں ابھار نہیں ہوتا، لہٰذا وہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ پس معلوم ہوا کہ بچوں میں جو معصیت ہے وہ اس لئے ہے کہ ان میں وہ قوت ہی ابھی اُبھری ہوئی نہیں ہے جو گناہ کا منشا ہے۔

عصمتِ انبیاءؑ

انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی تمام قوتیں کامل ہوتی ہیں پھر وہ بچتے ہیں نفس کی مخالفت کر کے اپنے صبر سے، جبر سے، کمالِ نیت سے اور کمال استقلال سے اور کمال عظمتِ خداوندی سے، یہ بات نہیں کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام مجبور ہیں گناہ کرنے

سے، وہ گناہ کرہی نہیں سکتے۔ اگر وہ مجبور ہوتے تو گناہ سے بچنا ان کے حق میں کوئی کمال نہ ہوتا۔ کمال یہی ہے کہ ہر قوت ہے اور پھر بچتے ہیں، حکمِ خداوندی کی عظمت ہیں، اور نفس کا مقابلہ کرنے کی ان میں اتنی قوت ہے کہ ان سے گناہ سرزد ہی نہیں ہوتا اور بالکل عصمت ہی رہتی ہے، انبیاءؑ علیہم السلام کی عصمت کے معنی مجبوری کے نہیں بلکہ ان میں سارے مادے بدرجۂ اتم موجود رہتے ہیں مگر سارے مادوں کو وہ کلیۃً تابع کر لیتے ہیں حق تعالےٰ کی مرضی کے کہ جہاں آپ فرمائیں گے وہاں ہم ان مادوں کو استعمال کرینگے اور جہاں سے آپ روک دیں گے وہاں سے ہم رک جائیں گے تو انبیاءؑ میں قوتیں اور مادے سب موجود رہتے ہیں پھر ان کا گناہ سے بچنا ارادی اور اختیاری ہے اس لئے ان کے حق میں کمال ہے۔ اگر ان کا گناہ سے بچنا مجبوراً ہوتا تو یہ ان کے حق میں کوئی کمال نہ تھا کیونکہ یہ ایسا ہی ہے کہ ایک نامرد ہو اور وہ یوں کہے کہ میں بڑا متقی ہوں کہ میں عورت کے پاس نہیں جاتا ہوں کوئی دوسرا کہے گا کہ کمبخت تیرے اندر جانے کی طاقت کیا ہے تو مجبوری میں بچا ہوا ہے، تیرے اندر وہ مادہ ہے ہی نہیں۔ بچنا اسے کہتے ہیں کہ شہوانی مادہ پورا موجود ہو اور پھر آدمی خوفِ خداوندی کی وجہ سے بچے، ایک لنگڑا لولا آدمی جو چارپائی سے ہل بھی نہیں سکتا وہ یوں کہے کہ میں چوری نہیں کرتا ہوں اس سے پاک ہوں، لوگ کہیں گے کہ تو پاک کیا ہے تو تو مجبور ہے، تجھے آج قوت مل جائے تو ڈکیتیاں ڈالے گا۔ اب تیرے اندر طاقت ہی نہیں تو کرے گا کیا محض چارپائی پر پڑا رہے گا۔ بچنا اسے کہتے ہیں کہ طاقت موجود ہو اور کرتب پورا جانتا ہو اور پھر بچتا ہے کہ اللہ کے حکم کے خلاف ہے تو ارادے اور اختیار سے سوچ سمجھ کر علم و عقل کی روشنی میں آدمی بچے اسے تو بچنا کہتے ہیں۔

اور جہاں روشنی موجود نہ ہو اور بچے اس سے بچنا نہیں کہتے۔

عصمتِ انبیاء اور عصمتِ اطفال

بچوں میں جو معصومیت ہے وہ اس لئے ہے کہ ان میں گناہ کرنے کی قوت بیدار نہیں ہوتی، صرف مادہ موجود ہوتا ہے، اور انبیاء میں وہ ساری قوتیں موجود ہیں پھر وہ معصوم ہیں، ارادے سے اختیار سے، تو عصمت دونوں میں موجود ہے مگر فرق اتنا ہے کہ انبیاء اختیاری معصوم ہیں اور بچوں میں غیر اختیاری عصمت ہے، یہ علم کے ساتھ معصوم اور بچے لاعلمی کے ساتھ معصوم، وہ ناطاقتی سے معصوم اور انبیاء کمالِ طاقت اور قوت کے ساتھ معصوم۔ ایک کی عصمت کمال میں داخل ہے، ایک کی عصمت کمال میں داخل نہیں۔ اگر دو برس کا بچہ گناہ نہ کرے تو اسے کامل نہیں کہتے، اسلئے کہ نہ اس میں ارادہ ہے اور نہ وہ قوت ہے، لہٰذا اس کے معصوم ہونے کے معنی یہ ہیں کہ خدا نے اسے مجبوراً گناہ کرنے سے روک دیا ہے وہ طاقت اس میں خدا نے ابھاری نہیں، اسلئے وہ بیچارہ اپنے ارادہ سے کچھ نہیں کرسکتا۔ اور انبیاء میں ساری قوتیں موجود ہیں اور پھر بچتے ہیں۔ یہ ہے کمال، اور اصول بھی یہی ہے کہ رکاوٹیں اور موانع بہت ہوں اور پھر نیکی کرے تو وہ زیادہ قابل قدر ہے اور ایک یہ ہے کہ کوئی رکاوٹ موجود نہیں اور نیکی کرنے کے لئے دواعی ہی دواعی موجود ہیں تو ہے تو وہ بھی نیکی ہی مگر زیادہ عجیب وغریب نہیں زیادہ قابل قدر نہیں۔ اس قسم کی ایک حدیث بھی ہے۔

حدیث، اَیُّھُمْ اَعْجَبُ اِیْمَانًا کی تشریح

ایک حدیث میں آپ نے صحابہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ بتلایا اَیُّھُمْ اَعْجَبُ اِیْمَانًا سب سے زیادہ عجیب ایمان کس کا ہے

صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ سب سے زیادہ عجیب ایمان ملائکہ کا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ملائکہ کو کیا ہو گیا جو وہ ایمان نہ لاویں گے، عرش ان کے سامنے کرسی ان کے سامنے، جنت ان کے سامنے، دُوزخ ان کے سامنے۔ وہ بھی ایمان نہ لاویں گے تو اور کون ایمان لانے والا ہوگا۔ یعنی ان کا مان لینا کوئی زیادہ کمال نہیں کیونکہ وہ اس چیز کو مان رہے ہیں جس کو آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ اس لئے نہ ماننے کے کوئی معنی ہی نہیں۔ پھر عرض کیا یا رسول اللہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کا ایمان زیادہ عجیب ہے، آپ نے فرمایا کہ انبیاءؑ کو کیا ہوا جو وہ ایمان نہ لاویں، وحی ان کے اُوپر آ رہی ہے، فرشتے انھیں نظر آ رہے ہیں، مشاہدۂ حق میں وہ مشغول ہیں، جلال وجمال کا دروازہ اُن پر کھُلا ہوا ہے۔ تجلی حق ان کے سامنے ہے۔ وہ بھی انکار کریں گے تو اور کون اقرار کرے گا۔ اس لئے ان کا ایمان کیا عجیب ہے؟ پھر عرض کیا گیا کہ ہمارا ایمان عجیب ہے۔ فرمایا کہ تمھیں کیا ہوا کہ تم ایمان نہ لاؤ، پیغمبر تمھارے سامنے موجود، وحی تمھارے سامنے اتر رہی ہے، معجزات تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو، تم بھی ایمان نہ لاؤ گے تو اور کون ایمان لائے گا۔ اس لئے تمھارا ایمان بھی عجیب نہیں ہے۔

پھر کس کا ایمان زیادہ عجیب ہے؟

پھر عرض کیا کہ اللہ اور رسول ہی بہتر جانتے ہیں کہ سب سے زیادہ عجیب ایمان کس کا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ عجیب ایمان ان لوگوں کا ہے جو تمھارے بعد میں آئیں گے۔ نہ رسول ان کے سامنے نہ معجزے ان کے سامنے نہ ان کے سامنے وحی اتر رہی ہوگی بلکہ رکاوٹ وموانع اتنے ہوں گے کہ کوئی ایمان میں شک ڈال رہا ہے، کوئی اسلام سے ہٹانے کی کوشش کر رہا ہے۔

کوئی دل میں تردّد پیدا کر رہا ہے۔ کہیں کفار، کہیں منافقین، کہیں نفس کے جذبات، ہزاروں رکاوٹیں موجود، اور دواعی جو تھے ایمان کے کہ وحی اور رسول کا سامنے ہونا، وہ ہے نہیں پھر بھی ایمان پر جمے ہوئے ہیں تو ان کا ایمان زیادہ عجیب ہے۔

مَوانع کا ہجوم عمل کو قیمتی بنا دیتا ہے

اس سے معلوم ہوا کہ کثرتِ موانع اور رکاوٹوں کے اندر جو خیر کا کام کرے وہ زیادہ قابلِ قدر ہے بہ نسبت اس کے کہ رکاوٹ ہی نہیں بلکہ دَواعی اور محرکات ہی موجود ہوں اور پھر خیر اور نیکی کرے تو رہے گی تو وہ خیر ہی اور نیکی ہی مگر زیادہ عجیب و غریب نہیں ہوگی، تو بچّے اگر گناہ سے بچتے ہیں تو اس لئے نہیں کہ وہ سمجھتے بوجھتے ہیں اور نفس کا مقابلہ کر کے بچتے ہیں، ایسا نہیں، بلکہ نفس میں تو ان کے جذبے ہی گناہ کے نہیں ہیں، نہ شہوت کا جذبہ ہے، نہ کبر و نخوت کا جذبہ ہے، لہٰذا اب جو وہ گناہ سے بچ رہے ہیں اسے بچنا نہیں کہتے ہیں، وہ تو گناہ سے اَلگ تھلگ ہیں۔ بچنا اسے کہتے ہیں کہ قوّتِ ارادی بھی ہو۔ اور قویٰ بھی مضبوط ہوں۔۔۔ کہ اس کام کو کر گذرے اور پھر بچے، تو بچّوں میں عصمت ہے مگر مجبوری کی ہے اور وہاں انبیاءؑ کے اندر عصمت ہے اِرادی اور اختیاری، تو معصوم دونوں ہیں مگر فرق رہے گا علم کا اور لاعلمی کا، اِرادے کا اور غیر ارادے کا، خبر کا اور بے صبری کا۔

اَولیاءَ اللہ گناہ سے بچتے ہیں

سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ رہے اَولیاءَ اللہ صلحاء، متقین جو گناہ سے بچتے ہیں، ابھی عرض کیا گیا ہے کہ گناہ سے انبیاءؑ بھی بچتے ہیں اور بچّے بھی اور اَولیاءَ اللہ بھی، فرق اتنا

ہے کہ انبیاء میں تو عصمت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے، اس معنی کر وہ معصوم ہیں، اور بچوں میں مادہ موجود ہے مگر بیدار نہیں، اس معنی کر ان میں گناہ کرنے کی قوت نہیں، لہٰذا وہ بھی معصوم ہیں۔ اب رہے اولیاء اللہ، ان سے گناہ ہوتے بھی ہیں اور نہیں بھی ہوتے۔ حتی الامکان وہ بچتے ہیں اس لئے ان کو معصوم تو نہیں کہیں گے بلکہ محفوظ کہیں گے منجانب اللہ ان کی حفاظت ہوتی ہے اور اس حفاظت کی بنا کثرتِ ذکر ہے، رات دن ذکر اللہ میں مشغول رہتے ہیں اور مشاہدہ ہوتا رہتا ہے ان کو جلال و جمالِ حق کا اور قلب کا رابطہ اور نسبت اتنی قوی ہوتی ہے کہ کسی وقت بھی حق تعالیٰ کا تصور اور دھیان ان سے اوجھل نہیں ہوتا اس واسطے وہ بچتے ہیں۔ لیکن اگر ذرا اوجھل ہو جائے تو امکان ہے کہ لغزش کر سکیں اور ایسا ہوا بھی ہے کہ بعض اولیاء کبار کو بعض دفعہ غلبہ ہوا اور معصیت سرزد ہوگئی، خواہ حکمت اس کی کچھ ہی ہو مگر اس کا امکان ہے۔

حضرت شیخ ابو عبد اللہ اندلسی کا عبرتناک واقعہ

حضرت شیخ ابو عبد اللہؒ مشہور شیخ المشائخ

اندلس کے اکابر اولیاء اللہ میں ہیں۔ ہزاروں خانقاہیں ان کے دم سے آباد، ہزاروں مدارس ان کے فیوض سے جاری، ہزاروں شاگرد، ہزاروں مریدین، آپ کے مریدین کی تعداد بارہ ہزار تک بتائی جاتی ہے۔ ایک دفعہ بارادۂ سفر تشریف لے گئے، ہزاروں مشائخ و علماء ہمرکاب ہیں جن میں حضرت جنید بغدادیؒ، حضرت شبلیؒ بھی ہیں۔ حضرت شبلیؒ کا بیان ہے کہ ہمارا قافلہ نہایت ہی خیرات و برکات کے ساتھ چل رہا تھا کہ عیسائیوں کی ایک بستی پر گذر ہوا، نماز کا وقت تنگ ہو رہا تھا، بستی میں پانی نہ ملا، بستی سے باہر ایک کنوئیں پر چند لڑکیاں پانی بھر رہی تھیں۔ حضرت شیخ کی نگاہ ایک لڑکی پر پڑی۔ حضرت کی نگاہ

اس پر پڑتے ہی تغیر ہونے لگا۔ حضرت شبلیؒ فرماتے ہیں کہ شیخ اس کی گفتگو کے بعد سر جھکا کر بیٹھ گئے۔ تین دن کامل گذر گئے کہ نہ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں نہ کسی سے بات کرتے ہیں۔ حضرت شبلیؒ کہتے ہیں کہ سب خدام پریشان حال تھے تیسرے دن میں نے جرأت کر کے عرض کیا یا شیخ! آپ کے ہزاروں مریدین آپ کی اس حالت سے پریشان ہیں۔ شیخ نے ان لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا "میرے عزیزو! میں اپنی حالت تم سے کب تک چھپاؤں، پرسوں میں نے جس لڑکی کو دیکھا ہے اس کی محبت مجھ پر اتنی غالب آچکی ہے کہ تمام اعضاء و جوارح پر اسی کا تسلط ہے، اب کسی طرح ممکن نہیں کہ اس سرزمین کو میں چھوڑ دوں۔"

حضرت شبلیؒ نے فرمایا کہ "اے میرے سردار! آپ اہل عراق کے پیر و مرشد علم و فضل، زہد و عبادت میں شہرۂ آفاق ہیں، آپ کے مریدین کی تعداد بارہ ہزار سے متجاوز ہو چکی ہے، بطفیلِ قرآنِ عزیز ہمیں اور ان سب کو رسوا نہ کیجئے۔"

شیخ نے فرمایا "میرے عزیز! میرا تمہارا النصیب، تقدیرِ خداوندی ہو چکی ہے مجھ سے ولایت کا لباس سلب کر لیا گیا ہے اور ہدایت کی علامات اٹھا لی گئیں" یہ کہہ کر رونا شروع کیا اور کہا "اے میری قوم! قضا و قدر نافذ ہو چکی ہے اب کام میرے بس کا نہیں۔"

حضرت شبلیؒ فرماتے ہیں کہ ہمیں اس عجیب واقعہ پر سخت تعجب ہوا اور حسرت سے رونا شروع کیا۔ شیخ بھی ہمارے ساتھ رو رہے تھے، یہاں تک کہ زمین آنسوؤں سے اُمنڈ آنے والے سیلاب سے تر ہو گئی۔ اس کے بعد ہم مجبور ہو کر اپنے وطن بغداد کی طرف لوٹے۔ جب ہم نے واپس آکر یہ واقعات سُنائے تو شیخ کے مُریدین میں کہرام مچ گیا، چند آدمی تو اسی وقت غم و حسرت میں عالمِ آخرت کو سدھار گئے اور باقی لوگ گڑگڑا کر خدائے بے نیاز کی بارگاہ میں دُعائیں کرنے

لگے کہ اے مقلب القلوب شیخ کو ہدایت کر اور پھر اپنے مرتبہ پر لوٹا دے۔ اس کے بعد تمام خانقاہیں بند ہو گئیں اور ہم ایک سال تک اسی حسرت وافسوس میں شیخ کے فراق میں لوٹتے رہے۔ ایک سال کے بعد جب مریدوں نے ارادہ کیا کہ چل کر شیخ کی خبر لیں کہ کس حال میں ہیں تو ہماری ایک جماعت نے سفر کیا، اس گاؤں میں پہونچکر لوگوں سے شیخ کا حال دریافت کیا تو گاؤں والوں نے بتایا کہ وہ جنگل میں سوٗر چرا رہا ہے۔ ہم نے کہا خدا کی پناہ یہ کیا ہوا؟ گاؤں والوں نے بتایا کہ اس نے سردار کی لڑکی سے منگنی کی تھی، اس کے باپ نے اس شرط پر منظور کرلیا اور وہ جنگل میں سوٗر چرانے کی خدمت پر مامور ہے۔ ہم یہ سن کر ششدر رہ گئے اور غم سے کلیجے پھٹنے لگے، آنکھوں سے بیساختہ آنسوؤں کا طوفان اُمنڈنے لگا۔ بمشکل دل تھام کر اس جنگل میں پہنچے جس میں وہ سوٗر چرارہے تھے۔ دیکھا تو شیخ کے سر پر نصاریٰ کی ٹوپی اور کمر میں زنار بندھا ہوا ہے اور اس عصا پر ٹیک لگائے ہوئے خنزیروں کے سامنے کھڑے ہیں جس سے وعظ اور خطبہ کے وقت سہارا لیا کرتے تھے، جس نے ہمارے زخموں پر نمکپاشی کا کام کیا۔ شیخ نے ہمیں اپنی طرف آتے دیکھ کر سر جھکا لیا۔ ہم نے قریب پہنچکر السلام علیکم کہا۔ شیخ نے کسی قدر دبی آواز سے وعلیکم السلام کہا۔ حضرت شبلیؒ نے عرض کیا کہ "اے شیخ! اس علم وفضل اور حدیث وتفسیر کے ہوتے آج تمہارا کیا حال ہے؟"

شیخ نے فرمایا "میرے بھائیو! میں اپنے اختیار میں نہیں، میرے مولیٰ نے مجھے جیسا چاہا ویسا کردیا اور اس قدر مقرب بنانے کے بعد جب چاہا کہ مجھے اپنے دروازہ سے دور پھینک دے تو پھر اس کی قضا کو کون ٹالنے والا ہے۔

اے عزیزو! خدائے بے نیاز کے قہر وغضب سے ڈرو، اپنے علم وفضل پر مغرور

نہ ہوئی" اس کے بعد آسمان کی طرف نظر اٹھا کر کہا کہ " اے میرے مولیٰ! میرا گمان تو تیرے بارے میں ایسا نہ تھا کہ تو مجھ کو ذلیل و خوار کر کے اپنے دروازہ سے نکال دے گا" یہ کہہ کر خدا تعالیٰ سے استغاثہ کرنا اور رونا شروع کر دیا اور فرمایا "اے شبلی! اپنے غیر کو دیکھ کر عبرت حاصل کر۔"

شبلی نے روتے ہوئے عرض کیا " اے ہمارے پروردگار! ہم تجھ ہی سے مدد طلب کرتے ہیں اور تجھ ہی سے استغاثہ کرتے ہیں اور ہر کام میں ہم کو تیرا ہی بھروسہ ہے، ہم سے یہ مصیبت دور کر دے کہ تیرے سوا کوئی دفعہ کرنیوالا نہیں۔"

خنزیران کا رونا اور ان کی دردناک آواز سنتے ہی ان کے پاس جمع ہو گئے اور انھوں نے بھی رونا اور چلّانا شروع کر دیا ادھر شیخ بھی زار زار رو رہے تھے، حضرت شبلی نے عرض کیا کہ "شیخ! آپ حافظِ قرآن تھے اور قرآن کو ساتوں قرأتوں سے پڑھا کرتے تھے، اب بھی کوئی اس کی آیت یاد ہے؟"

شیخ نے کہا " اے عزیز! مجھے قرآن میں دو آیت کے سوا کچھ یاد نہیں رہا۔ ایک تو یہ ہے:۔ وَمَنْ يُهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ؕ

(جس کو اللہ ذلیل کرتا ہے اس کو کوئی عزت دینے والا نہیں، بیشک اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے)

اور دوسری یہ ہے: وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ؕ"

(جس نے ایمان کے بدلہ میں کفر اختیار کیا، تحقیق وہ سیدھے راستہ سے گمراہ ہو گیا۔)

حضرت شبلی نے عرض کیا اے شیخ! آپ کو تیس ہزار حدیثیں مع اِسناد کے برزبان یاد تھیں، اب ان میں سے بھی کوئی یاد ہے۔؟"

شیخ نے کہا " صرف ایک حدیث یاد ہے یعنی مَنْ بَدَّلَ دِيْنَهٗ فَاقْتُلُوْهُ"

(جو شخص اپنا دین بدل ڈالے اس کو قتل کر ڈالو۔)

حضرت شبلیؒ فرماتے ہیں ہم نے یہ حال دیکھ کر شیخ کو وہیں چھوڑ کر بغداد کا قصد

کیا۔ ابھی تین منزل طے کرنے پائے تھے کہ تیسرے روز اچانک شیخ کو اپنے آگے دیکھا کہ ایک نہر سے غسل کر کے نکل رہے ہیں اور بآواز بلند شہادتین اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ پڑھتے جاتے ہیں۔ اس وقت ہماری مسرت کا اندازہ وہی شخص کر سکتا ہے جس کو اس سے پہلے ہماری مصیبت کا اندازہ ہو۔ بعد میں شیخ سے ہم نے پوچھا کہ کیا آپ کے اس ابتلا کا کوئی سبب تھا تو شیخ نے فرمایا "ہاں، جب ہم گاؤں میں اترے اور بت خانوں اور گرجا گھروں پر ہمارا گذر ہوا، آتش پرستوں اور صلیب پرستوں کو غیر اللہ کی عبادت میں مشغول دیکھ کر میرے دل میں تکبر اور بڑائی پیدا ہوئی کہ ہم مومن موحد ہیں اور یہ کمبخت کیسے جاہل و احمق ہیں کہ بے حس و بے شعور چیزوں کی پرستش کرتے ہیں مجھے اسی وقت ایک غیبی آواز دی گئی کہ یہ ایمان و توحید کچھ تمھارا ذاتی کمال نہیں کہ سب کچھ ہماری توفیق سے ہے، کیا تم اپنے ایمان کو اپنے اختیار میں سمجھتے ہو؟ اور اگر تم چاہو تو ہم تمھیں ابھی بتلا دیں۔ اور مجھے اسی وقت یہ احساس ہوا کہ گویا ایک پرندہ میرے قلب سے نکل کر اڑ گیا جو درحقیقت ایمان تھا۔"

کرشمۂ قدرت

بعض بزرگوں نے لکھا ہے کہ جب شیخ بحال ہو کر اپنی خانقاہ میں چلے گئے اور پھر اصلاح امت کی خدمت میں لگ گئے تو وہ عیسائی کی لڑکی کہتی تھی کہ ہمارے شیخ کہاں گئے وہ ان کی جدائی میں بے چین تھی اور تلاش کرتی تھی اس کو ایک شخص ملا اور کہا کہ تم اسقدر بے چین کیوں ہو اس نے اپنا واقعہ سنایا انھوں نے کہا کہ آنکھ بند کرو اس نے آنکھ بند کر لی پھر کہا کہ اب آنکھ کھولو تو اس لڑکی نے دیکھا کہ شیخ کی خانقاہ سامنے ہے اور وہ اس میں تشریف فرما ہیں لڑکی ان کی خدمت میں حاضر ہوئی حضرت شیخ عبداللہ اندلسیؒ نے فرمایا کہ اب مجھے شادی کی ضرورت نہیں ہے لڑکی

نے کہا کہ میں مسلمان ہو رہی ہوں اور آپ کے پاس رہ کر اسلام کی تعلیم کے مطابق زندگی گزاروں گی۔ حضرتؒ نے منظور فرما لیا۔ وہ لڑکی دن و رات عبادت اور ذکر میں مصروف رہتی تھی اور ولیہ بن گئی۔ اور چند سال کے بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کی نماز جنازہ پڑھا کر دفن کرا دیا۔

اللہ تعالیٰ اس طرح اپنے مخلصین بندوں کی مدد فرماتے ہیں اور تنبیہ کے طور پر کسی کوتاہی اور بھول پر سزا بھی دیتے ہیں اسی لئے اولیا اللہ چھوٹی چھوٹی خطاؤں کو اور غلطیوں کو بھی گناہ کبیرہ کہتے ہیں کیونکہ بعض مرتبہ چھوٹی غلطی بھی اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا سبب بن جاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اولیاء اللہ سے بھی غلطی ہو جاتی ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ عام لوگوں سے بڑے بڑے گناہ سرزد ہوتے رہتے ہیں مگر ان کی کوئی پکڑ نہیں ہوتی۔ اور مقربین کی چھوٹی چھوٹی غلطیوں کی پکڑ ہو جاتی ہے مگر وہ حضرات چھوٹی سی غلطی پر اس قدر نادم ہو کر روتے ہیں اور توبہ کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا غضب اُن کے رحم و کرم سے بدل جاتا ہے۔ باری تعالیٰ توبہ کرنے والے اور معافی مانگنے والے اپنے اولیاء کی توبہ کو قبول فرما کر ان کے مقام کو پہلے سے بہت زیادہ بلند فرما دیتے ہیں جیسا کہ حضرت شیخ ابو عبداللہ اندلسی رحمۃ اللہ علیہ کے واقعہ کو آپ لوگوں نے سُنا۔ اگر بندہ اپنی غلطی پر نادم ہو کر اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتا رہے تو وہ رحیم و کریم ہیں بڑے بڑے گناہوں کو معاف فرما کر ان کی جگہ پر حسنات شامل فرما دیتے ہیں۔ اس لئے تمام بندگانِ خداوندی کو اپنی زندگی کے ہر لمحہ کی قدر کرنی چاہیئے اور باری تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی مغفرت طلب کرنا چاہیئے۔

اولیاء اللہ گناہ پر دیر تک باقی نہیں رہتے

چونکہ اولیاء اللہ میں تقویٰ کا غلبہ زیادہ ہوتا ہے اس لئے اس غلبہ کی ہی وجہ سے حق تعالیٰ شانہ بہت جلد رجوع نصیب فرماتے ہیں اور قرآن کریم میں اسی لئے فرمایا گیا ہے اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّھُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ تَذَکَّرُوْا فَاِذَا ھُمْ مُّبْصِرُوْنَ ۝ جن لوگوں کی عادت تقویٰ اور طہارت کی ہے اور وہ تقویٰ دل میں جما ہوا ہے اور پھر شیطان کی کوئی جماعت ان کو ورغلاتی ہے تو تھوڑی دیر تو وہ مبتلا ہوتے ہیں اس کے بعد اچانک وہ تقویٰ ابھرتا ہے اور فوراً وہ قوتِ ایمانی سامنے آتی ہے تو لاحول پڑھتے ہیں اور اس سے بچتے ہیں۔

ماحول سے متاثر ہو کر گناہ کرنے کی حقیقت

یہاں سے ایک بات یہ معلوم ہوئی کہ ایک گناہ تو وہ ہے کہ قلب میں اس کا مادہ جمع ہے اور مسلسل گناہ کرتا جا رہا ہے، جیسے معاذ اللہ زناکاری کا مادہ ہے اور وہ شخص مبتلا بھی ہے اس میں، اور ایک وہ ہے کہ قلب بالکل پاک ہے، مادہ ہی نہیں گناہ کرنے کا، البتہ ماحول سے متاثر ہو کر گھبرا کر اتفاق سے کوئی غلطی سرزد ہو گئی تو وہ ہزار توبہ کریگا اور وہ اتنی بڑی توبہ ہو گی کہ اگر وہ یہ گناہ نہ بھی کرتا اور ہزاروں نیکیاں کرتا تو شاید اتنے درجات بلند نہ ہوتے جتنے اس توبہ واستغفار سے بلند ہوتے، اولیاء کرام میں گناہ کا مادہ بھی موجود ہے اور امکان بھی ہے کہ وہ گناہ میں مبتلا ہو جائیں اور کھلی معصیت سرزد ہو لیکن جب تک وہ توبہ نہ کرلیں چین نہیں آتا اور بہت بڑی توبہ نصیب ہوتی ہے۔

انبیاء علیہم السّلام کا خمیر

مگر انبیاء علیہم السلام میں یہ نہیں کہ کھلی معصیت سرزد ہو جائے۔ ہاں خطاء فکری ہو سکتی ہے لیکن اس کے تقاضوں پر کوئی عمل ہو اس سے وہ بری ہیں اور اس کی وجوہات بھی ہیں۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ انبیاء علیہم السّلام کا بدن جو تیار کیا گیا ہے اس میں غالب حصہ جنت کی مٹی کا ہے تو مٹی جب پاک شامل ہے تو خمیر بھی پاک ہے۔ پہلی چیز تو پاکی کی یہی ہے کہ بدنوں کے مادے جب ان کے پاک پیدا کئے گئے ہیں اس سے جو طبیعت بنے گی قدرتی طور پر اس طبیعت میں پاکی ہوگی، اور ظاہر بات ہے کہ جب طبیعت ایسی ہے تو بالطبع خیر ہی کی طرف جائیں گے، شر کی طرف کبھی نہ جائیں گے۔ لامحالہ اس میں خیر ہی خیر ہوگا اور کوئی گناہ سرزد تو کیا ہو کسی گناہ کا خطرہ تک بھی ان کے قلب پر نہ گذرے گا، تو مادہ پاک ہے، بدن بھی پاک ہے، لازمی بات ہے ان بدنوں سے جو اعمال اور افعال صادر ہوں گے وہ بھی پاک ہی ہوں گے۔

ظاہر پاک، باطن پاک، لہٰذا گناہ عادۃً ممکن نہیں

جب ابدانِ ظاہرہ پاک مادے سے بنے ہیں تو ظاہر بات ہے روح بھی ان میں اتنی ہی مقدس ڈالی جائے گی، اس لئے انبیاء علیہم السلام کے بدن بھی اتنے پاک ہیں کہ ہماری رُوحوں میں بھی اتنی پاکی نہیں ہے اور پھر جب ان کی روحیں اتنی مقدس ترین ہیں، اور ان روحوں کے اندر مشاہدہ ہے کمالاتِ حق کا، ہر وقت حق تعالیٰ کے سامنے حضوری ہے، کوئی آدمی گھر میں بیٹھ کر گناہ کا تصوّر کرے یہ تو ممکن ہے لیکن بادشاہ کے دربار میں ہو، اس کی عظمت، اس کا جلال دیکھ رہا ہو، وہاں ممکن نہیں کہ بادشاہ کی خلاف ورزی کرے، انبیاء علیہم السلام تو ہر وقت مشاہدہ کی حالت

میں ہیں، ملائکہ ان کے سامنے، وحی ان پر آ رہی ہے تو وہ بیچارہ نفس کر لیگا کیا، گو مادے سادے موجود ہوں نفس مغلوب ہی رہے گا۔ تو مادہ بھی پاک، رُوح بھی پاک اور اوپر سے احوال بھی پاک کہ مشاہدہ ہے عالمِ غیب کا، اور وحی کا نزول اور علمِ الٰہی براہِ راست اتر رہا ہے اور اُوپر سے پھر حفاظتِ خداوندی بھی شامل ہے، چونکہ ان سے دنیا کی ہدایت کا کام لیتا ہے اس لئے انبیاء علیہم السلام کو معصوم رکھا گیا ہے کہ اگر ان سے ایک گناہ بھی سرزد ہو تو مخلوق ان کی بات نہیں مان سکتی کہ جب آپ ہی ان چیزوں میں مبتلا ہیں پھر ہمیں کیوں نصیحت کرتے ہیں، اس لئے ان حضرات کو بری رکھا گیا ہے۔ ان کے مادے پاک، روحیں پاک، اَحوال پاک، ماحول پاک اور اُوپر سے مشاہدات اور ہر وقت حضوری شاہی دربار ہیں، اسلئے وہاں عادۃً ممکن نہیں کہ کوئی گناہ سرزد ہو، زیادہ سے زیادہ عقلی امکان رہ جاتا ہے۔

اَولیاء اللہ سے گناہ عقلاً بھی ممکن ہے اور عادۃً بھی

اَولیاء اللہ سے عقلاً بھی گناہ کا امکان ہے اور عادۃً بھی، اسلئے کہ جو رکاوٹیں انبیاء کو دی جاتی ہیں من جانب اللہ وہ نہ ان کے مادے میں ہیں نہ ان کی ارواح میں وہ چیزیں ہیں نہ ملائکہ ان کے سامنے حاضر ہیں اور نہ وحی ان پر اتر رہی ہے، اس لئے گناہ کرنے کا امکان ہے اور بہتوں سے گناہ ہوا بھی ہے بعض عامۃ صحابہ سے گناہ سرزد ہوا جیسے ماعز ابن مالک ہیں ان سے گناہ سرزد ہوا اور ان کو رجم کیا گیا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ قلب تو پاک ہے اور گناہ جڑ پکڑے ہوتے بھی نہیں ہے صرف ماحول سے متاثر ہو کر ایک حرکت سرزد ہو گئی، لیکن پھر اتنی توبہ کی، اتنی توبہ کی کہ حدیث پاک میں ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ماعز ابن مالک رضی اللہ عنہ

نے اتنی بڑی توبہ کی ہے کہ اگر وہ توبہ عالم کے اندر پھیلا دی جائے تو سب کے گناہ معاف ہو جائیں اس ایک توبہ کے اثر سے، تو اولیاء کے اندر فقط امکان عقلی ہی نہیں بلکہ ایک درجہ میں امکان عادی بھی ہے کہ گناہ سرزد ہو جائے مگر حفاظتِ خداوندی شامل ہوتی ہے تو گناہ ہوتا نہیں اور اگر ہو جائے تو اتنی بڑی توبہ نصیب ہوتی ہے کہ سو برس کی عبادت سے شاید وہ درجات بلند نہ ہوں جو اس توبہ سے ان کے بلند ہوتے ہیں۔

امیر معاویہ کا عجیب واقعہ

امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے کہ رات کو لیٹے اور شیطان نے کچھ اثرات پھیلا کر قلب اور دماغ میں پہونچائے۔ تہجد کے وقت آنکھ نہ کھل سکی اور تہجد چھوٹ گیا حالانکہ ترک تہجد کوئی معصیت نہیں اس لئے کہ اُمتی کے اوپر نہ فرض ہے نہ واجب، مگر جو اہل اللہ تہجد کے عادی ہوتے ہیں ان کا اگر ایک تہجد بھی قضا ہو جائے تو سمجھتے ہیں کہ ساری عمر اکارت ہو گئی اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑ سر پر آپڑا۔ تو حضرت معاویہؓ اس تہجد کے قضا ہونے پر تمام دن روئے، استغفار کیا، دعائیں مانگی اور کہا کہ یہ پہلی بار قضا ہوا ہے۔ غرض اگلے دن جب سوئے ہیں تو عین تہجد کے وقت ایک شخص نے انگوٹھا ہلایا کہ حضرت امیر! تہجد کا وقت ہو گیا ہے اُٹھئے تہجد پڑھ لیجئے۔ حضرت امیرؓ نے اجنبی آواز محسوس کر کے اس کا ہاتھ پکڑ لیا کہ میرے محل سرائے میں تو کون اجنبی ہے جو مجھے میرے زنانہ خانہ میں تہجد کے لئے اُٹھانے آیا ہے۔ اس نے کہا کہ میں شیطان ہوں، تہجد کے لئے اُٹھانے آیا ہوں۔ فرمایا کہ کمبخت تو اور تہجد کے لئے اُٹھائے، اس نے کہا کہ جی ہاں! خیر خواہی کا جذبہ اُبھرا اور مجھے گوارا نہ ہوا کہ آپ کا تہجد قضا نہ ہو، فرمایا کہ تو اور خیر خواہی کرے، اللہ نے فرمایا ہے اِنَّ الشَّيْطَانَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوهُ عَدُوًّا

شیطان تمہارا دشمن ہے تم اسے دشمن ہی سمجھو، وہ کبھی دوست نہیں بن سکتا، اس لئے تو اور دوستی کرے، یہ ناممکن ہے، سچ سچ بتا کہ تو کیوں آیا ہے ورنہ میں بھی صحابی ہوں اور اتنی قوت رکھتا ہوں، تیری گردن مروڑدوں گا اور اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑلیا تب وہ اصلیت کھلی۔ اس نے کہا کہ اصل قصہ یہ ہے کہ کل میں نے ہی ایسی ہی حرکت کی تھی کہ آپ کی تہجد قضا ہوگئی۔ میں نے کچھ ایسے وساوس اور آثار دماغ اور قلب پر ڈالے کہ آپ کو گہری نیند آگئی اور وقت پر آنکھ نہ کھلی۔ آپ نے سارے دن استغفار کیا اور توبہ کیا تو اتنے درجے بلند ہوئے آپ کے کہ سو برس بھی تہجد پڑھتے تو شاید اتنے درجے بلند نہ ہوتے جتنے اس توبہ سے بلند ہوئے اسی لئے میں نے آپ کو اٹھایا کہ اگر آج تہجد کی قضا ہوگئی تو پھر توبہ کریں گے اور پھر درجے بلند ہوں گے تو سو درجوں کے بجائے ایک ہی درجہ بلند ہو، یہی اچھا ہے، کچھ تو درجات میں کمی ہوگی۔ جب یہ اتنی بات اس نے سچ کہہ دی تب حضرت امیرؓ نے اس کو چھوڑا۔ فرمایا کہ صحیح ہے یہ خباثت تیرے دل میں چھپی ہوئی تھی۔ بہرحال اولیاء کاملین سے گناہ کے سرزد ہونے کا امکان بھی ہے اور عادۃً بھی ممکن ہے اور وہ تقویٰ کے منافی بھی نہیں ہے اس لئے کہ تقویٰ جڑ پکڑے ہوئے ہے۔ گناہ جڑ پکڑے ہوئے نہیں، وہ کچھ بیرونی اثرات سے گھر گھرا کر شاذونادر واقع ہوسکتا ہے لیکن انبیاء علیہم السّلام سے یہ چیز ممکن نہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا شیطان مسلمان ہوگیا حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ ہر قلب کے دائیں جانب فرشتے کا مقام ہے اور بائیں جانب شیطان کا مقام ہے۔ فرشتہ خیر کے وعدے دیتا ہے اور شیطان شر سجھاتا ہے، دونوں کی جنگ ہوتی

ہے۔ صدیقہ عائشہ رضؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا آپ کے قلب کے بائیں جانب بھی شیطان کا مقام ہے فرمایا کہ ہاں وَلٰکِنَّہٗ اَسْلَمَ لیکن وہ شیطان خود مسلمان ہوگیا، اس کا اثر مجھ پر کیا پڑتا میرا اثر اس پر یہ پڑا کہ اس کی ماہیت بدل گئی، اور بعض روایتوں کے الفاظ ہیں وَلٰکِنَّنِیْ اُسْلِمُ کہ ہے وہ شیطان ہی مگر میں اس سے بچا لیا جاتا ہوں، اس کا کید و مکر مجھ پر اثر نہیں کرتا۔

شیطان انبیاء پر نہ اثر ڈال سکتا اور نہ انکی صورت اختیار کرسکتا ہے

شیطان انبیاء علیہم السلام پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتا اور نہ اُن کی صورت اختیار کرسکتا ہے۔ حدیث پاک میں ہے کہ اگر خواب میں کسی نے مجھے دیکھا تو اس نے مجھے ہی دیکھا، شیطان کو قدرت نہیں کہ میری صورت میں آئے اور میرا نام لیکر کہے کہ میں ہوں۔ وہ ایسا نہیں کرسکتا۔ وہ صورت بھی نہیں پا سکتا چہ جائیکہ ان کی حقائق میں اثر انداز ہوسکے۔

اولیاء اللہ پر شیطان اثر ڈال سکتا ہے

شیطان اولیاء اللہ کے قلوب میں اثر ڈال سکتا ہے اور امکان بھی ہے کہ وہ کسی وقت بہک جائیں اور امکان ہے کہ کوئی معصیت بھی ان سے کسی وقت سرزد ہو جائے لیکن چونکہ تقویٰ غالب ہے اس واسطے وہ غالب آ کر یا تو اس گناہ سے بچا دیتا ہے اور اگر سرزد ہو جائے تو عظیم الشان توبہ نصیب ہوتی ہے کہ وہ سو عبادتوں سے بڑھ کر عبادت ہوتی ہے۔

خلاصۂ کلام

مطلب یہ ہوا کہ انبیاء علیہم السلام معصوم ہیں عصمتِ اختیاری کے ساتھ اور اولیاء اللہ محفوظ ہیں حفاظتِ خداوندی کے ساتھ، اور حفاظت کے معنی یہ ہیں کہ گناہ عادۃً ممکن ہے اور انبیاء علیہم السلام

میں عادۃً ممکن نہیں صرف عقلی امکان ہے مگر ان سے گناہ ہوگا نہیں، اگر ہو تو وہ گناہ نہیں بلکہ خطاء فکری ہے جس پر ان کو بہت جلد متنبہ کر دیا جاتا ہے ان کو اس پر باقی نہیں رکھا جاتا ہے، اور بچے معصوم ہیں عصمتِ اضطراری کے ساتھ، کیونکہ ان میں مادہ ہی اُبھرا ہوا نہیں ہے جو سرچشمہ ہے گناہ کا۔ نہ نہ شہوانی قوتیں اُبھری ہوتی ہیں اور نہ جاہ طلبی کی قوتیں اُبھری ہوتی ہیں، نہ فکر وقید کی قوتیں اُبھری ہوئی ہیں کہ شیطانی حرکت کریں۔ صرف ایک طبیعت کی شوخی ہوتی ہے کھیل کود کرتے ہیں، لیکن کوئی اِرادی چیز نہیں ہوتی کہ ارادے سے کچھ مکر و فریب کر کے دُنیا کو دھوکہ دیں۔ بچوں کی طبیعتیں بالکل سادہ ہوتی ہیں، تو عصمت دونوں میں ہے مگر ایک میں خلقی عصمت ہے، ایک میں اِرادی عصمت ہے، ایک میں علم کے ساتھ عصمت ہے، ایک میں ناواقفی کے ساتھ عصمت ہے، ایک میں قوت و تمام و کمال کے ساتھ عصمت ہے اور ایک میں قوتوں کی ناتمامی اور خامی کے ساتھ عصمت ہے۔ تو عصمت دونوں میں ہے بچوں میں بھی اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام میں بھی، مگر یہ فرق ہے، اور اولیاء اللہ معصوم نہیں بلکہ محفوظ ہیں۔

اَسرار آثار ہیں جو اطاعت پر مُرتّب ہوتے ہیں طلب نہیں کئے جاتے،

ایک صاحب نے اسی مجلس میں ایک پرچہ پر ایک سوال لکھ کر حضرت کی خدمت میں پیش کیا، حضرت حکیم الاسلام رح نے اس پرچہ کو پڑھا، سوال یہ تھا کہ کُفار و مُشرکین کی نابالغ اولاد جو انتقال کر جائے ان کا حشر کیا ہوگا، آخر وہ بھی تو معصوم ہیں۔ اس میں شریعت کا کوئی فیصلہ ہو تو مع اَسرار و حِکَم بیان کیجئے، سوال

کا آخری جز" مع اسرار و حکم بیان کیجئے"۔ حضرت کو ناگوار معلوم ہوا اسلئے تلخ مزاجی کے ساتھ جواب ارشاد فرماتے ہوئے فرمایا کہ یہ کیا لفظ ہے "مع اسرار و حکم بیان کیجئے۔ اسرار و حکم ہم پر کب ضروری ہیں۔ ہم تو ناقل ہیں احکام کے حکم بیان کر دیں گے۔ یہ اسرار و حکم کا مطالبہ ہی غلط ہے۔ طالبِ اسرار کو اسرار کبھی نہیں مل سکتے ہیں، خادم اور مطیع پر اسرار منکشف ہوتے ہیں۔ اگر بادشاہ کے سامنے کوئی جا کر یوں کہے کہ حضور اپنی سلطنت کے سارے راز مجھے بتلا دیجئے اور بیگماتِ شاہی کا پردہ بھی اٹھا دیجئے اور یہ بھی بتلا دیجئے کہ آپ کے خزانے میں کتنے جواہرات ہیں تو حکم یہ ہوگا کہ اس نامعقول کو کان پکڑ کر نکال دو، یہ کون ہے ہمارے اسرار پوچھنے والا۔ اور ایک شخص بادشاہ کا مطیع و فرماں بردار ہے بادشاہ نے حکم دیا کہ کھڑے ہو جاؤ وہ کہے کہ بہت اچھا، حکم دیا کہ بیٹھ جاؤ۔ وہ کہے کہ بہت اچھا، حکم ہوا کہ گھر چلے جاؤ۔ وہ کہے کہ بہت اچھا، حکم ہوا کہ فلاں وقت حاضر ہو جاؤ، وہ کہے کہ بہت اچھا۔ ہر کام اور ہر بات کو ماننے کو تیار ہے، بس حکم کا بندہ ہے۔ سال بھر تک اطاعت کر کے کر کے جب بادشاہ کو اعتماد قائم ہوگا تو کہے گا کہ بڑا مخلص ہے، بڑا مطیع ہے تو حکم دیا جائے گا کہ آج سے تم شاہی محل سرائے میں ہر وقت آ سکتے ہو۔ تم معتمد علیہ ہو کوئی روک ٹوک نہیں، تو لیجئے بیگمات کا پردہ اٹھ گیا۔ اب وہ گھروں میں آ رہا ہے اور اس کی اطاعت اسی طرح جاری ہے اور بالکل حکم کا بندہ ہے، اسی طرح دو برس گذر گئے۔ تو بادشاہ کو پورا اطمینان ہو گیا کہ بڑا مخلص اور مطیع ہے، اس پر بادشاہ خوش ہو کر کہے گا کہ آؤ آج ہم تمھیں اپنے خزانے دکھلائیں گے خزانہ کھول کر اس کو اندر لے جائے گا اور دکھلائے گا کہ یہ جواہرات ہیں۔ یہ سونا ہے، یہ چاندی ہے، لیکن اس کی اطاعت پھر اسی طرح جاری و ساری

ہے۔ چار پانچ برس بعد بادشاہ کہے گا کہ آؤ ہم تمہیں اپنی حکومت کی پالیسیاں سمجھائے دیتے ہیں۔ ایک پالیسی حکومت کی یہ ہے اور ایک یہ ہے اور ایک یہ بھی ہے، اور یہ حکمتِ عملی ہے۔ تو خادم اور مطیع پر ساری چیزیں منکشف ہو جاتی ہیں، اور جو طلب کرے کہ جناب پردہ اٹھا دیجئے بیگمات کا تو بادشاہ کہے گا کہ اس کا کان پکڑ کر باہر نکال دو، اس کو پھانسی دے دو، یہ کون ہے طلب کرنے والا، تو اسرار کی طلب نہیں کی جاتی۔ اسرار تو آثار ہیں جو اطاعت پر مرتب ہوتے ہیں۔ اس لئے آدمی کو چاہیئے کہ حکم معلوم کرے۔ یہ کیا سوال ہے کہ اس کی حکمت بھی بتاؤ، اس کا راز بھی بتاؤ۔ آپ کون ہیں راز پوچھنے والے، جب اللہ کا حکم آ گیا تو اس سے بڑھ کر راز اور کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ حکم نہ مانیں گے جب تک راز نہ معلوم ہو۔ تو آپ اللہ کے مطیع نہیں بلکہ اپنی عقل کے مطیع ہو گئے کہ عقل میں راز سمجھ میں آ گیا تو مان لیا، نہ سمجھ میں تو رہ گئے۔ یہ تو نہایت لغو سوال ہے کہ اسرار بتائیے، حکم بتائیے، سوال یہ ہونا چاہیئے کہ حکم کیا ہے اور بس۔ اسرار معلوم کرنے ہیں تو پہلے اطاعت کیجئے، دین پر مضبوطی سے قائم رہیئے، فرائض و واجبات ادا کر کے ثابت کر دیجئے کہ ہماری طبیعت بھی خادم، عقل بھی غلام، ارادہ بھی اللہ کا غلام، مشیّت بھی غلام، پھر اسرار منکشف ہوں گے۔ اسرار تو آثار ہیں اور آثار کی طلب نہیں کی جاتی ہے۔ احکام کی طلب کی جاتی ہے تو حکم پوچھئے کہ مشرکین کی نابالغ اولاد کا حکم کیا ہے۔

ذراریِ مشرکین کے بارے میں علماء کے مذاہب

اولادِ مشرکین کا شرعاً جو حکم ہے اور جس میں محدثین ذراریِ مشرکین کے الفاظ سے باب باندھتے ہیں

کہ مشرکین کی نابالغ اَولاد آیا جنتی ہے یا جہنمی، اس میں علماء کے آٹھ مذہب ہیں ایک مذہب یہ ہے کہ ان کی فِطرت پر حکم لگا دیا جائے گا، چونکہ یہ بڑے نہیں ہوئے۔ فطرتوں میں سادگی تھی اور عمل واقع نہیں ہوا۔ اور جنت ونار عمل کے اُوپر ہے اور وہاں عمل ہے نہیں اسلئے فطرت پر حکم لگا کر داخلِ جنت کریں گے مگر وہ داخلہ سزا یا جزا کے طور پر نہ ہوگا بلکہ محض انعام و تکریم کے طور پر ہوگا اور انھیں خَدَمہ بنا دیا جائے گا اہل جنت کا۔ وہ داخل تو رہیں گے جنت میں مگر اصل باشندوں کے خادم بن کر بطور خدّام کے رہیں گے اور یہی ان کے حق میں بڑے اِعزاز کی بات ہوگی کہ انھیں جنت میں خَدَمَہ بنا کر داخل کرلیا جائے گا۔ امام ابوحنیفہؒ کا مذہب یہ ہے کہ اس میں توقف کیا جائے یعنی حکم مت لگاؤ، اس لئے کہ روایات مختلف ہیں اور قطعی حکم لگا دینا کہ وہ جنتی ہیں یا جہنمی ہیں، ٹھیک نہیں۔ اس سے سکوت اختیار کیا جائے، مُعاملہ کو تفویض کیا جائے حق تعالےٰ کے، اور کہا جائے کہ ہمیں کچھ معلوم نہیں کہ کیا انجام ہوگا بلکہ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

ایک مذہب یہ ہے کہ ان کو تابع کیا جائے گا ان کے آبا، واَجْداد کے یعنی ملحق کر دیا جاوے گا۔ اگر آبا واَجداد جہنمی ہیں تو وہ بھی جہنمی ہیں، اور اگر آبا، واَجْداد جنتی ہیں تو وہ بھی جنّت میں جاویں گے۔ اس دُنیا میں جب مَردم شُماری ہوتی ہے تو نابالغ بچّوں کو بھی تو گِنتے ہیں مُسلمانوں کے بچّوں کو مسلمانوں میں شمار کرتے ہیں حالانکہ نہ انھیں اِسلام کی خبر ہے نہ دوسری چیزوں کی خبر ہے مگر ماں باپ کے تابع بنا کر مسلمان سمجھے جاتے ہیں تو گویا وہ اہلِ مذہب قیاس کرتے ہیں قرآن کی اس آیت پر وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّیَّتُهُمْ بِاِیْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ ؕ جو لوگ ایمان

لے آئے مگر عمل ان کے زیادہ صحیح نہیں تھے تو ان کے آباء واجداد کی کرامت کی وجہ سے درجہ ان کا بھی بلند کر دیا جائے گا گو عمل ان کے ٹھیک نہیں، تو جب مومن کی کرامتوں کی وجہ سے ان کے بچوں کے درجات بلند ہو سکتے ہیں تو ان کے آباء واجداد کی خباثتوں کی وجہ سے وہ بھی ان کے تابع ہو جائینگے لہٰذا وہ بھی جہنمی، اور وجہ اس کی یہ ہے کہ بچہ جب تک نابالغ رہے اور بالخصوص شیر خوار، وہ حقیقت میں نفس کا جزو ہوتا ہے ماں باپ کے، ماں دودھ پلا رہی ہے اس لئے ماں کے نفس کے تابع ہے۔ اس کا نفس مستقل نہیں، اور باپ کما کے کھلاتا ہے اس لئے وہ باپ کے نفس کے تابع ہے۔ جب وہ عاقل بالغ ہو کر اپنے پیروں پر کھڑا ہو، تب کہا جائے گا کہ اب اس میں اِستقلال پیدا ہوا ہے اور جب تک عقل میں بلوغ نہ ہو تو وہ ماں باپ کے تابع ہی سمجھا جائے گا۔ وہ مسلم ہے تو یہ بھی مسلم، وہ کافر ہے تو یہ بھی کافر۔ اس کا کفر واسلام جب ہی معتبر ہوگا جب وہ عقل واِرادے اور اختیار سے قبول کرے تو نابالغ اَولاد ماں باپ کے توابع میں سے ہے۔ لہٰذا جو اُن کا حکم ہے وہی ان کے نابالغ بچوں کا حکم ہے۔

ایک مذہب یہ ہے کہ نہ وہ جنّتی ہیں نہ دوزخی، بلکہ وہ بیچ میں اَعراف کے اندر رکھ دیئے جائیں گے کہ وہ نہ جنت ہے نہ دُوزخ۔

ایک مذہب یہ ہے کہ قیامت کے دن ان کی آزمائش کی جائیگی۔ اور ایک آگ روشن کی جائے گی اور حق تعالیٰ کی جانب سے ان بچوں کو کہا جائے گا کہ اس آگ میں کود پڑو، تو جن کے مزاج میں سلامتی ہو گی فطرتوں کی وہ کود پڑیں گے۔ وہ آگ حکمِ خداوندی سے باغ وبہار بن جائے گی، اور بعضے تأمل کریں گے کہ ہم آگ میں کیسے چلے جاویں، ڈریں گے، جھجکیں گے

ادھر سے حکم ہے کہ آگ میں کود دو، اور وہ کود تے نہیں معلوم ہوگا کہ اگر یہ جوان ہوتے تو یہ ہی سرکشی ان کے اندر ہوتی۔ ان کی فطرت ہی کے اندر سرکشی داخل ہے۔ ان کی فطرت میں سلامتی نہیں۔

ایک مذہب یہ ہے: اور بعض حضرات اس کے قائل ہیں کہ وہاں امتحان لیا جائے گا۔ عمل سرزد ہوا، صرف جانچ کرلی جائے گی کہ فطرتوں کا رُخ کیا ہے، اسی اعتبار سے وہ جنتی یا جہنمی ہوں گے۔

اسلم ترین مذہب

بہر حال اس میں آٹھ مذہب ہیں لیکن جو اسلم ترین مذہب ہے وہ صرف توقف کا ہے کہ ہم حکم نہیں لگاتے، حق تعالیٰ جانتے ہیں چاہے وہ فطرت پر حکم لگادیں چاہے وہ عمل پر حکم لگادیں۔ ہم اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے ہیں۔ اس لئے کہ شریعت ظواہر پر حکم لگاتی ہے اور وہاں ظاہر کچھ ہے نہیں تو کاہے پر حکم لگادیں، رہی فطرت تو وہ باطنی چیز ہے اور باطن کی ہمیں خبر نہیں کہ ہے کیا، اور ہم کون ہیں حکم لگانے والے، تو اسلم طریق یہی ہے کہ توقف کیا جائے یا پھر زیادہ سے زیادہ یہ کہو جو اکثر علماء کہتے ہیں کہ وہ اہلِ جنت کے خدمہ بن کر جنت میں داخل ہوں گے۔

(دُعا پر مجلس ختم ہوئی)

اُحِبُّ الصّالِحِینَ وَلَسْتُ مِنْھُمْ
لَعَلَّ اللّٰہَ یَرْزُقُنِیْ صَلَاحًا

قابلِ توجہ

میں نے تذکرہ خاندان قاسمی میں اس طرف اشارہ کیا تھا کہ اگر حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے خدام کی طرح حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کے خدام بھی حضرتؒ کی مجالس کو نقل کرنے کا اہتمام کرتے تو ان کی ذات سے ایک بہت بڑا علمی اصلاحی دینی معلومات کا ذخیرہ نکل کر لوگوں کے سامنے آجاتا اور آنے والی مسلم نسل اُن سے فائدہ اٹھاتی۔ مگر خادموں نے اس کا اہتمام نہیں کیا اب افسوس اور ندامت کے علاوہ کیا ہو سکتا ہے میں اپنی کوشش میں لگا رہا اور دلی تمنا بھی یہ تھی کہ کچھ لوگ میرے سامنے آئیں اور میری ہمت افزائی کے طور پر تھوڑا سا سہارا دیدیں اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ اسفار میں جانے کی اجازت بھی دیدیں تو میں اپنے ادارۂ تالیفات اولیاء کو بند کر کے اس کام کو ضروری سمجھوں گا مگر کسی نے ہمارے جذبات کی قدر نہ کی بلکہ کام میں رُکاوٹ پیدا کرنے والے افراد سامنے ضرور آئے کوئی ہمت افزائی کرنے والا نہ ملا اگر کوئی ملنے والا بھی ہوتا تو اس کو روک دیا جاتا کچھ لوگوں کو ایسا بھی محسوس ہو رہا تھا کہ میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی مجالس سے اپنی تجارت کو چمکانا اور بڑھانا چاہتا ہوں اور حضرت کو دھوکا دیکر بہت کچھ کمائی کرنا چاہتا ہوں۔ اس لئے افسوس کرتا رہا اور اپنی وسعت کے مطابق مجالسِ حکیمُ الاسلام حاصل کرتا رہا۔ صرف حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت تھی کہ جنھوں نے میری اس کاوش کی قدر کی۔

مولانا نثار احمد صاحبؒ قاسمی کی نقل کردہ ان دو مجالس کو سامنے رکھتے ہوئے پڑھنے والے خود فیصلہ کریں کیا کہیں میں نے عقیدت میں آکر غلط بیانی سے کام تو نہیں لیا ہے۔

خادمِ بزرگانِ امت
حبیبُ اللہ قاسمی غفرلہٗ

مجلس ۳۶

اولاد کی تعلیم و تربیت
اور
دعوت الی اللہ

حضرت حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحب
رحمۃ اللہ علیہ کی دو مخصوص مجالس مع مجلس دعا

تالیف و ترتیب

حضرت مولانا حبیب اللہ صاحب قاسمی

مرتب و مؤلف حضرت مولانا حبیب اللہ صاحب قاسمیؒ کے قلم سے

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید المرسلین
وامام المتقین ورحمۃ العالمین محمد وعلیٰ الہٖ واصحابہٖ اجمعین

امّا بعد! حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی ساری ہی مجالس ان کی شخصیت کے ساتھ مخصوص ہیں مگر یہ دو آخر کی مجالس اس حیثیت سے مخصوص ہیں کہ اگر مسلمان عام طور پر ان کو خود پڑھیں اور اپنے گھر والوں کو ان کے پڑھنے کی ترغیب دیتے رہیں تو آج مسلمانوں کے بچے' جن کو آنے والی مسلم نسل بھی کہا جاتا ہے ان کے اندر بگاڑ پیدا ہو چکا ہے' انشاء اللہ ان مجالس کے پڑھنے سے ان کے اندر کچھ سدھار پیدا ہوگا' اور ان کے اندر بیداری پیدا ہوگی۔

اس لیے ان دو آخر والی مجلسوں کو رسالہ کی شکل میں' الگ سے مجلس دعا کو ان میں شامل کر کے چھپانے کا انتظام کیا گیا ہے ایک چھوٹی سی کتاب ہونے کی وجہ سے خریدنے اور پڑھنے میں بڑی سہولت ہوگی۔ میں امید کرتا ہوں کہ مجالس حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کے پڑھنے والے بھی اس کو پسند کریں گے۔

فقط

حبیب اللہ قاسمیؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مجلس ۳۶

اولاد کی تعلیم و تربیت اور حدیث جبریلؑ پر محققانہ بیان

حامِدًا وَّمُصَلِّیًا اَمَّا بَعْدُ:۔

حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ سے سوال کیا گیا کہ تعلیم و تربیت کے سلسلے میں ہمارے اکابر کا طرز انداز کیا تھا اس عنوان پر آپ کچھ ارشاد فرمادیں۔ حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ طالب علمی کے زمانے ہی سے میرا اُٹھنا بیٹھنا اپنے اکابر کے پاس رہا ہے ان حضرات کی مختلف مجالس ہوتی تھیں ہر بزرگ کی الگ الگ مجلسیں ہوتی تھیں لیکن اس وقت ہمارے بڑوں میں سب سے بڑے حضرت مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ شیخ الہند تھے رمضان شریف کے مہینے میں ان کے یہاں مجلس کا خصوصی اہتمام ہوتا تھا نماز تراویح کے بعد بارہ بجے رات تک مجلس کا معمول رہتا تھا ہمارے سارے اکابر اس مجلس میں خصوصیت کے ساتھ شرکت فرماتے تھے میرا بچپن کا زمانہ تھا لیکن اس پر بھی اپنے بزرگوں کی مجالس میں شرکت کرنے کا طبعی ذوق تھا میں اس مجلس میں بالالتزام حاضر ہوتا تھا، بچپن کا زمانہ تھا ان کی علمی باتیں تو بہت کم سمجھ میں آتی تھیں البتہ بزرگانِ دین کے واقعات کان میں پڑتے رہتے تھے وہ خوب سمجھ میں آتے تھے۔

جہاں تک میں نے اندازہ لگایا تھا وہ یہ تھا کہ ہمارے اکابر تعلیم دین پر زیادہ زور دیتے تھے اور اس کی اہمیت اور ضرورت کے عنوان پر خصوصیت کے ساتھ بیان فرماتے

تھے اس کی وجہ یہی تھی کہ اس زمانے میں جہالت عام تھی تعلیم دین کا کوئی خاص انتظام نہیں تھا شہروں میں تو کچھ مکاتب اور مدارس تھے مگر دیہاتوں میں اس کا کوئی اہتمام نہیں تھا کوئی عالم نہ ہونے کی وجہ سے مسلمان اپنے مُردے کو بغیر نماز جنازہ کے ہی دفن کر دیا کرتے تھے نام مسلمانوں کا ہوتا تھا مگر اکثر اسلام سے واقف نہیں تھے اس لیے ہمارے اسلاف کی کوشش یہ تھی کہ تعلیم کا سلسلہ عام ہو اس لیے کہ ساری خرابیوں کی جڑ اور بنیاد جہالت ہے جب تک مسلمان دین اسلام کی تعلیم سے واقف نہیں ہوگا تو جہالت اور بدعملی میں مبتلا ہوگا اور عیسائی مبلغین کی تبلیغ کے اثرات ان پر یقیناً پڑیں گے اور وہ مرتد ہو جائیں گے چنانچہ عیسائی مبلغین نے ہندوستان میں اپنا ایسا جال پھیلا دیا کہ لاکھوں مسلمان جو نام کے مسلمان تھے مرتد ہو گئے جہالت کی وجہ سے ان میں بدعات عام تھیں انھیں کو اپنا مذہب سمجھ بیٹھے تھے اس لیے ہمارے بزرگوں نے تعلیمی سلسلہ کو عام کرنے کیلئے بڑی محنتیں کیں آج ان کی محنت اور ان کے خلوص کے ثمرات ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں مدارس عربیہ کا نظام دن بدن بڑھتا جا رہا ہے اور آنے والی نسلوں سے جہالت تقریباً نکل چکی ہے یہ ان حضرات کے خلوص کا ثمرہ ہے۔

خود حق تعالیٰ کا تعلیم کا اہتمام فرمانا

اسی لیے حق تعالیٰ سُبحانہٗ نے اگر کسی چیز کا سب سے پہلے اہتمام فرمایا ہے تو وہ تعلیم ہی ہے۔ اس پر عہد اَلَستُ کا واقعہ شاہد ہے تخلیق انسان سے پہلے جتنے انسانوں کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کرنے کا فیصلہ فرمایا ان سب کو ذرّات کی شکل میں پیدا فرمایا ساری مخلوق ایک ہی جگہ جمع تھی یہ مخلوق مثل باریک چونٹیوں کی شکل میں تھی ان کے اندر صف بندی کی ترتیب نہیں تھی بلکہ ایسا تھا کہ جیسے کسی جگہ پر مخلوق کی بھیڑ ہو حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ دنیا میں جس کا جس سے نکاح ہونے والا تھا اللہ تعالیٰ نے واپس میں جوڑا بنا کر وہاں پر ایک جگہ کھڑا کر دیا اسی لیے مثل مشہور ہے کہ

جب کسی کی شادی ہوتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ جوڑی بنی بنائی رکھی اس لیے وہاں پر واپسی میں ملنا ملانا بھی تھا اس کی کیفیت کیا تھی یہ حق تعالیٰ کو معلوم ہے جس طرح چھوٹی چونٹی ہوتی ہیں ہم کو ان کے متعلق کچھ معلوم نہیں مگر وہ ایک دوسرے کو پہچانتی ہیں یہی کیفیت وہاں پر بھی رہی ہوگی حق تعالیٰ سبحانہٗ نے اس مخلوق کے سامنے فرمایا اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں اس وقت اس مجمع میں سارے انبیاء علیہم السلام بھی تھے اور سارے صحابہؓ اور امت محمدیہ صلے اللہ علیہ وسلم کے صلحا بھی موجود تھے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے اور سوچنے لگے کہ ہم اپنے رب کے اس سوال کا جواب کیا دیں۔ اس لیے سب سے پہلے ہمارے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نے حق تعالیٰ کے اس سوال کا جواب دیا کہ بَلٰی کیوں نہیں بیشک آپ ہمارے رب ہیں اس کے بعد سارے انبیاء علیہم السلام بولے بَلٰی بَلٰی پھر ساری مخلوق نے بَلٰی بَلٰی کی آواز بلند کی یعنی حق تعالیٰ سبحانہٗ کو اپنا رب ہونے کا اقرار کیا کہ بیشک آپ ہمارے رب ہیں۔

تعلیم کی شکلیں تعلیم کبھی ہوتی ہے سوال کی صورت میں اور کبھی ہوتی ہے تدریس کی صورت میں اور کبھی ہوتی ہے وعظ و تقریر کی صورت میں ممتحن یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ طالب علم کا ذہن اور اس کی صلاحیت کیسی ہے اس لیے اس سے سوال کرتا ہے اور اس کے جواب کا انتظار کرتا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے عہد الست میں اپنے بندوں کی تعلیم سوال کے ذریعہ فرمائی صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذہنِ مبارک میں اس سوال کا جواب آیا آپ کے جواب پر ساری مخلوق نے اسی طرح جواب دیا کہ کیوں نہیں بیشک آپ ہمارے رب ہیں یہ اولادِ بنی آدم علیہ السلام کی پہلی تعلیم تھی دوسری تعلیم اس وقت ہوتی ہے جب رحم مادر میں بچے کے اندر روح ڈالی جاتی ہے جو فرشتہ وہاں مقرر ہوتا ہے وہ روح پڑنے کے بعد بچے سے سوال کرتا ہے اور یہ سوال بطور تذکیر کرتا ہے کہ مَنْ رَبُّکُمْ تیرا رب کون ہے یعنی تم نے جو عہد الستُ میں اپنے رب کے

سامنے عہد کیا تھا وہ یاد بھی ہے اگر یاد ہے تو دنیا میں جاکر بھی اُسے یاد رکھنا ورنہ تمہارا دشمن شیطان تمہیں گمراہ کر دے گا جب انسان دنیا میں زندگی گذار کر آخرت کی طرف چلتا ہے اور موت آجاتی ہے تو مرنے کے بعد پھر وہی سوال کیا جاتا ہے کہ مَنْ رَبُّكُمْ تیرا رب کون ہے اور دو سوالوں کا اضافہ کیا جاتا ہے یعنی وَمَا دِيْنُكُمْ اور تیرا دین اور مذہب کیا ہے تم نے دنیا میں جاکر کس مذہب پر رہ کر اپنی زندگی گذاری ہے وَمَا نَبِيُّكُمْ اور تیرا نبی کون ہے اگر انسان نے دنیا میں آنے کے بعد اپنے عہد الست کو پورا کیا تو وہ صحیح صحیح جواب دے گا اور اگر اس نے دنیا میں آکر اپنے عہد الست کو بھلا دیا تو اب اس کو اپنا عہد یاد آئے گا اور سمجھے گا کہ میں نے اپنے عہد کی خلاف ورزی کی ہے اب ہمارے ساتھ حق تعالیٰ کا معاملہ کیا ہوگا وہ فکر و افسوس میں پڑ جاتا ہے اور فرشتے کے سوال کا جواب نہیں دے پاتا پھر اس کے اعمال کے مطابق اس کو سزا دی جاتی ہے یہ معاملہ عام انسانوں کے ساتھ ہوتا ہے اور یہ سوال عہد الست سے لیکر ما بعد الموت کیا جاتا ہے۔ اسی لیے اسلام کا طریقہ سنت یہ ہے کہ جب بچہ پیدا ہو تو دائیں کان میں اذان دو اور بائیں کان میں تکبیر کہو تا کہ بچے کے دل میں توحید و رسالت کی عظمت بیٹھ جائے۔

عقائد کی بنیاد دو چیزوں پر ہے

عقائد کی بنیاد دو چیزیں ہیں اول توحید دوم رسالت بقیہ سارے عقائد ان کے نیچے آجاتے ہیں بہترین توحید وہ ہے جو انبیاء علیہم السّلام کی تعلیم کے ذریعہ آئی ہے اذان میں حق تعالیٰ کی توحید اور کبریائی کا اعلان ہوتا ہے اس لیے پہلے اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کا اعلان کیا گیا پھر اس کے بعد وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا الرَّسُوْلُ اللّٰهِ کا اعلان کیا گیا تاکہ توحید و رسالت کا سکہ بچے کے دل میں بیٹھ جائے عقائد کے بعد پھر اعمال کی طرف بلایا گیا اور اعمال میں سب سے بہترین عمل نماز ہے اس لیے حَیَّ عَلَی الصَّلٰوةِ حَیَّ عَلَی الصَّلٰوة آؤ نماز کے لیے آؤ نماز کے لیے جب عقیدے کے بعد سب سے بہترین عمل نماز آگئی اور زکی

تعلیم ہوگئی تو پھر اس کو فلاح و بہبودی کی طرف بلایا گیا کہ حی علی الفلاح حی علی الفلاح آؤ فلاح و بہبودی کی طرف آؤ فلاح و بہبودی کی طرف اس کے بعد توحید پر اذان ختم کردی جاتی ہے یہ درحقیقت بچوں کی تعلیم ہے اب دنیا میں آنے کے بعد توحید و رسالت کا دامن پکڑ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق اپنی زندگی تم کو گذارنی ہے اور اسی میں کامیابی ہے اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ نے سب سے زیادہ اہتمام تعلیم کا فرمایا ہے اگر بچے کی تعلیم کا اہتمام نہ کیا گیا تو وہ جاہل رہے گا جوان ہونے کے بعد نہ تو وہ توحید و رسالت سے واقف ہوگا اور نہ ہی اسلامی تعلیم سے واقف ہوگا اس لیے وہ شخص جس مقصد کے لیے اس دنیا میں بھیجا گیا ہے نہ تو اس کو جان سکے گا اور نہ ہی اس پر عمل کر سکے گا۔ وہ جاہل کا جاہل ہی رہے گا اور دنیا سے خالی ہاتھ جائے گا اور اس کا انجام وہی ہوگا جو حدیثوں میں فرمایا گیا ہے صرف مسلمان کے گھر پیدا ہونے اور مسلمان نام رکھ دینے سے انسان کامیاب نہیں ہوگا بلکہ اسلامی تعلیم کے بعد اس پر عمل کرنے سے کامیاب ہوگا۔ اس لیے اس کی تعلیم ضروری ہے بغیر تعلیم کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔

تربیت کا اہتمام

تعلیم کے ساتھ بچوں کی تربیت بھی ضروری ہے اگر تعلیم ہو جائے اور تربیت نہ ہو تو محض علم سے فائدہ نہ ہوگا اس لیے بچپن ہی سے ہی ان کی تربیت بھی ہونی چاہیئے اور اس کی تربیت کا پہلا مدرسہ ماں کی گود ہے اگر ماں نے اپنے بچے کی تربیت کردی تو وہی بچہ دوسرے مدرسہ میں جا کر اچھے اخلاق کا بنے گا دوسرا مدرسہ تعلیم کا ہے اس مدرسہ میں آنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ اس بچے کے ماں باپ کیسے ہیں اور انھوں نے اس کی کیسی تربیت کی ہے اگر استاذ کو یہ معلوم ہو گیا کہ اس بچے کی تربیت ماں باپ نے نہیں کی ہے بلکہ پہلے مدرسہ میں یہ بگڑ چکا ہے تو اپنے مدرسہ تعلیمی میں استاذ تعلیم کے ساتھ اسکی تربیت بھی کرتا ہے اگر استاذ تربیت یافتہ ہے تو اپنے شاگردوں کی بھی تربیت کرتا ہے ورنہ وہ بچہ یہاں پر بھی آکر محروم رہتا ہے اگر تعلیم کے ساتھ ساتھ اس کی تربیت نہیں ہوئی تو تیسرا مدرسہ

صوفیاء اور مصلحین اُمّت کا رکھا گیا ہے کہ طالب علم فارغ ہو کر وہاں پر جائے اور اپنے ظاہر اور باطن کی اصلاح کرلے عموماً اس تیسرے مدرسہ میں آکر انسان کی تربیت ہو جاتی ہے اب تو دو ہی مدرسہ لوگوں کے سامنے ہیں تیسرے مدرسہ کی ضرورت کا احساس بہت کم رہ گیا ہے اگر بچپن ہی سے بچوں کو صحیح تربیت ہو اور مدرسہ میں ان کی نگرانی ہو اور پھر کسی مصلح اُمّت سے پڑھنے کے بعد اصلاحی تعلقات قائم کرلیں تو آج بھی اچھے اچھے صوفیاء اور صلحاء پیدا ہو سکتے ہیں اب وہ ذوق نہیں رہا اسی لیے علوم کے اثرات لوگوں کے قلوب پر نہیں پڑ رہے ہیں ہمارے بزرگوں نے جہاں پر تعلیم پر زور لگایا ہے تو وہاں پر طلباء کی تربیت اور اصلاح پر بھی محنت کی ہے۔

ایک سُوال اور اسکا جواب

اب ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ بچوں کے کان میں جو اذان اور تکبیر کہی جاتی ہے اس سے فائدہ کیا ہوتا ہے وہ تو بد ہوش اور بے شعور ہوتا ہے وہ نہ کوئی بات کچھ کہہ سکتا ہے اور نہ ہی سمجھ سکتا ہے یہاں تک کہ وہ بولنے پر بھی قدرت نہیں رکھتا ہے اس کے سامنے کچھ کہنا ایسا ہی ہے جیسا کہ بھینس کے سامنے بین بجانا اس کے سامنے کتنا ہی بین بجاؤ نہ تو اس میں عقل ہے اور نہ ہی شعور ہے وہ بین کے ترنم کو کیا جانے پھر اس سے فائدہ کیا ہے۔

اس کا جواب حجۃ الاسلام حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے دیا ہے وہ یہ ہے کہ بچوں کا قلب مثل سفید تختی کے ہوتا ہے جو کچھ اس کے کان کے ذریعہ اس کے قلب پر پہونچتا ہے وہ چھپتا رہتا ہے خواہ اس کو شعور ہو یا نہ ہو جب بچہ بڑا ہوتا ہے تو اس کے قلب پر چھپی ہوئی چیزیں اس کی زبان کے ذریعہ باہر آتی ہیں وہ وہی کہتا ہے جو اس کے قلب پر چھپا ہوتا ہے لوگ حیرت کرتے ہیں کہ اتنا چھوٹا بچہ اور ایسی ایسی باتیں کرتا ہے اور ایسی ایسی حرکتیں کرتا ہے درحقیقت اس کی یہ باتیں اور یہ حرکتیں ماں باپ کی تربیت کی ہوتی ہیں پھر وہ بچہ تربیت کے مطابق نیک نام ہوتا ہے یا بدنام ہوتا ہے۔ اسی لیے حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ عام طور پر لوگوں کا یہ ذہن ہوتا ہے کہ جب بچہ پانچ چھ سال کا ہو جائے تو اس میں کچھ

شعور ہو جاتا ہے اس وقت اس کی تربیت کرنی چاہیئے یہ ذہن بالکل غلط ہے بلکہ بچے کی تربیت پیدا ہونے کے بعد ہی سے شروع کر دینی چاہیئے وہ بچہ سمجھتا ہے یا نہیں اس کی مثال یہی ٹاپینگ رکارڈ ہے اس کے اندر کوئی عقل و شعور نہیں ہے وہ مانند بچے کے قلب سفید کے ایک خالی چیز ہے مگر بنانے والے نے ایسی حکمت سے بنائی ہے کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اپنے اندر چھاپتا چلا جا رہا ہے جب اس کو کھولو گے تو ہماری کہی ہوئی باتیں جس کو اس نے اپنے اندر چھاپ رکھا ہے وہ کھولتا چلا جائے گا اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بچوں کے قلب کو بنایا ہے جو کچھ اس کے سامنے کہو گے یا کرو گے اس کے قلب میں چھپتا چلا جائے گا اس کا تجربہ کر کے دیکھ لیجئے ایک ہوتے ہیں شہری بچے اور ایک ہوتے میں دیہاتی بچے دونوں میں عموماً آپ بہت فرق محسوس کریں گے شہر میں عموماً مرد و عورت سنجیدہ قسم کے ہیں اور تعلیم یافتہ ہیں وہ بچوں کے سامنے سنجیدگی کی باتیں اور علمی باتیں کرتے ہیں اس لیے عموماً ان کے بچے بھی سنجیدہ قسم کے ہوتے ہیں بخلاف دیہاتی بچوں کے وہ ہر وقت آپس میں گالی گلوچ کی باتیں کرتے ہیں اور ایک دوسرے سے جھگڑتے لڑتے رہتے ہیں دیہاتی بچے کے قلب میں یہ سب چیزیں چھپ جاتی ہیں۔ جب وہ بڑا ہوتا ہے تو اسی طرح لڑنا جھگڑنا اور گالی گلوچ کی باتیں کرنا شروع کر دیتا ہے اسی لئے شہروں میں عقل مند زیادہ ہوتے ہیں اور دیہاتوں میں بے وقوف زیادہ ہوتے ہیں یہ غلط تربیت کا اثر ہوتا ہے۔

آج کل کی شہری تہذیب

مگر افسوس یہ ہے کہ آج کل شہری تہذیب و تمدن میں بہت حد تک تبدیلی پیدا ہو گئی ہے بجائے اسلامی دینی تہذیب و تمدن کے عموماً غیروں کی تہذیب و تمدن ان میں کثرت سے پیدا ہو رہے ہیں چونکہ ماں باپ خود اسلامی تہذیب و تمدن کے علاوہ دنیاوی تہذیب و تمدن سے پیراستہ ہوتے ہیں وہ جیسے ہوتے ہیں ان کے اثرات ان کے بچوں کے قلوب

پر پڑتے ہیں مثال کے طور پر آج کل مال دار مسلمانوں کا زیادہ زور دنیاوی تعلیم کی طرف ہے اور انھیں کی تہذیب بھی بچوں کو سکھلاتے ہیں وہ جوان ہو کر انھیں کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں پھر ان کے بچے بھی اسی رنگ میں رنگے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ٹی وی پر سینما اور ناٹک خود دیکھتے ہیں اور اپنے بچوں کو بھی دکھلاتے ہیں اس سے شرم وحیار اور اسلامی تہذیب ان کے بچوں کے قلوب سے نکلتے جارہے ہیں اگر اسی طرح ان کے حالات رہے تو خطرہ یہ ہے کہ آنے والی نسل کہیں اسلام سے مرتد نہ ہو جائے اس لیے غیروں کے تمدن کو چھوڑ کر صرف اسلامی تمدن کو اختیار کیا جائے اسی میں خیریت اور بھلائی ہے ہماری حالت یہ ہو کہ ہماری نقل خود غیر اقوام کریں نہ کہ ہم ان کی نقل کریں پہلے زمانے میں مسلمان خواہ امیر ہوتا یا غریب ہوتا اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت کا اہتمام کرتا تھا اس لیے ان میں بڑے بڑے علمار اور صوفیار اور مجاہدین پیدا ہوتے تھے۔

ایک بزرگ کا واقعہ

ایک بزرگ کا واقعہ مشہور ہے جب ان کی اہلیہ صاحبہ حاملہ ہوئیں تو انھوں نے ان کو نصیحت کی کہ حالتِ حمل میں کوئی ایسی حرکت مت کرنا کہ جس سے بچے کے قلب پر غلط اثر پڑے بیوی صاحبہ نے بہت احتیاط کی نماز وتلاوت اور کثرتِ ذکر اور درود شریف کا وظیفہ وغیرہ کا خصوصی اہتمام فرمایا اور لڑائی جھگڑے وگالم گلوچ جو عورتوں کی عام عادت ہوتی ہے اس سے مکمل پرہیز کیا۔ بچہ پیدا ہوا اور اس کی تربیت کا اہتمام بھی کیا گیا اور اچھی دینی تعلیم کا بھی اہتمام ہوا وہ بچہ جب کھیلنے کودنے لگا تو ایک دن اس نے چوری کی یہ خبر سن کر بزرگ کو حیرت ہوئی کہ اتنی احتیاط کے بعد بچے کے اندر چوری کی صفت اور عادت کیسے آئی معلوم ہوتا ہے کہ حالتِ حمل میں اہلیہ صاحبہ نے کوئی حرکت کی ہے وہ گھر پر آئے اور تلوار لے کر بیوی کے سامنے کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے کہ سچ سچ بتاؤ بچے کے اندر یہ عادت کیسے آئی انھوں نے کہا کہ آپ پہلے تلوار نیام میں رکھیں پھر میں سوچ کر بتاؤں گی تھوڑی دیر کے بعد بیوی نے کہا کہ حالتِ حمل

میں ایک غلطی ہو گئی تھی جو خاص غلطی میں نے نہیں سمجھی تھی ممکن ہے شاید اسی کا اثر بچے میں آیا ہو اور وہ غلطی یہ تھی کہ ہمارے پڑوسی کے آنگن میں جو بیر کا درخت لگا ہوا ہے اس کی کچھ ٹہنیاں ہمارے گھر کے آنگن میں پھیلی ہوتی ہیں ایک دن میں نے ایک بیر بغیر مالک کی اجازت کے کھالیا تھا حضرت نے فرمایا کہ یہ تو نے چوری کی تھی اسی کا اثر ہمارے بچے کے اندر آیا ہے جب ایک بیر کے کھانے کا یہ اثر ہے تو بغیر اجازتِ مالک دوسری چیزوں کے کھانے کا اثر کیوں نہیں ہوگا اگر حمل کے زمانے سے ہی عورتیں احتیاط کریں اور پیدائش کے بعد ان کے سامنے نازیبا حرکتیں نہ کریں اور ان کی اسلامی طور وطریقے پر تعلیم و تربیت کریں تو آج بھی انھیں ماؤں کی گود میں اولیاء اللہ پیدا ہو سکتے ہیں۔

علمِ دین کا درجہ اوّل ہے اور معاش کا ثانوی ہے

اس لیے بھی علم سیکھیں اسلام میں علم معاش سیکھنے کی ممانعت نہیں ہے مگر اس کا درجہ ثانوی ہے اس لیے تعلیم دین مقدم ہے اور تعلیم معاش مؤخر ہے اسی لیے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعثت کی غرض وغایت جو بتلائی وہ علمِ دین اور مکارم اخلاق ہے۔ آپ نے فرمایا اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّمًا میں دنیا میں مُعلّم بنا کر بھیجا گیا ہوں تاکہ تعلیم دین سے انسانوں کو آراستہ کروں اور فرمایا اِنَّمَا بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ میں دنیا میں اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ انسانوں کو اعلیٰ ترین اخلاق سے آراستہ کروں اس سے معلوم ہوا کہ معلومات آتی ہیں تعلیم کے ذریعہ اور اخلاق آتا ہے تربیت کے ذریعہ اس سے معلوم ہوا کہ پیغمبرِ اسلام کی بعثت کی غرض وغایت دو چیزیں ہیں ایک تعلیم دوسری تربیت اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم و تربیت کو سب سے مقدم کیا ہے تاکہ ان کے ذریعہ آدمی آدمی بنے جانور نہ بنے جانوروں کو اچھے برے کی تمیز نہیں ہوتی دنا ہر کھیت میں منھ مارتا چلتا ہے اس کو یہ معلوم نہیں ہے کہ یہ کھیت ہمارے مالک کا ہے یا

غیر کا ہے اس کو تو صرف کھانے سے غرض ہوتی ہے وہ حلال وحرام جائز و ناجائز کو کیا جانے اسی طرح اگر آدمی کو تعلیم و تربیت کا سبق نہ پڑھایا گیا تو اس کو حلال و حرام کی تمیز نہیں ہوگی پھر وہ آدمی کیا ہے اچھا خاصہ جانور بیل ہے اس لیے آدمی اس وقت آدمی نہیں بنتا جب تک اس کی تعلیم و تربیت نہ ہو علم صنائع اور معاش کا تعلق علم سے نہیں ہے بلکہ محسوسات سے ہے ایک شخص بالکل علم سے کورا ہوتا ہے مگر تجارت اور صنعت اور زراعت میں ماہر ہوتا ہے بہترین کمائی کرتا ہے اور مالدار ہوجاتا ہے اگر اس کا تعلق علم سے ہوتا تو وہ مالدار نہ بنتا علم حقیقی وہی ہے کہ جس سے آدمی حق و باطل جائز و ناجائز کا امتیاز کرسکے کہ یہ جائز ہے یہ ناجائز ہے اس کو کرنا چاہیئے اور اس کو نہیں کرنا چاہیئے یہ خطا ہے یہ صواب ہے یہ وہی تعلیم ہے جس کو اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے اسی تعلیم کو دیگر انبیاء علیہم السلام بن لے کر آئے تھے اور اپنی اپنی امتوں کو دئے تھے جتنے انبیاء آئے وہ حضرات اسی تعلیم کو لیکر آئے تھے وہ صفتیں سکھلانے کی غرض سے نہیں آئے تھے کیونکہ ان کا تعلق علم شرائع سے نہیں بلکہ نفسیات اور محسوسات سے ہے جس طرح کا زمانہ آتا جائے گا اسی طرح کا تمدن بنتا چلا جائے گا۔

تعلیم وہ چیز ہے کہ جس سے انسان کے دل و دماغ کی تعمیر ہوتی ہے پھر جس قسم کی تعلیم ہوگی اسی طرح انسان کا دل ودماغ بنے گا اور اسی کے مطابق وہ کام کرے گا۔

تعلیم سے پہلے مقصدِ تعلیم ضروری ہے

تعلیم سے پہلے تعلیم کا مقصد متعین کرنا ضروری ہے تاکہ پڑھنے والوں کو یہ معلوم ہوجائے کہ ہم کو کس چیز کی تعلیم دی جارہی ہے اس لیے تعلیم کا نصاب بنانا ضروری ہے اور نصاب میں انھیں کتابوں کو داخل کرنا چاہیئے جن سے مقصد میں کامیابی ہو اگر تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ اس سے دنیاوی زندگی سنورے گی تو نصاب تعلیم میں اسی قسم کی کتابیں داخل کی جائیں گی جن سے معاشرہ اور تمدن اور ایجادات کے علوم حاصل

ہوں اور اگر تعلیم کا مقصد خداشناسی ہے تو تعلیم میں ایسی کتابیں رکھی جائیں گی جن سے اللہ اور اللہ کے رسول صلے اللہ علیہ وسلم کی معرفت حاصل ہو اور متعلم کے دل میں معرفت پیدا ہو لہٰذا نصاب تعلیم میں اسی قسم کی کتابیں داخل کی جائیں گی۔

نوٹ

اتنا بیان کرنے کے بعد حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ تھوڑی دیر کیلئے خاموش ہو گئے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ آپ آگے بیان کے لئے کچھ غور و فکر فرما رہے ہیں یا اس کے لئے مضامین فراہم کر رہے ہیں۔ گویا اتنا بیان عنوان تھا اب آگے اس پر تفصیلی دلائل کی ضرورت تھی۔

حدیث جبریل علیہ السلام پر مفصّل بیان

حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ سے حدیث جبریل پر کچھ بیان کرنے کی فرمائش کی گئی تھوڑی دیر توقف کے بعد آپ نے فرمایا کہ:

ہماری تعلیم اسلامی کا جو نصاب حق تعالیٰ نے بنایا ہے وہ سارا نصاب حدیث جبریلؑ میں موجود ہے مشکوٰۃ شریف کی جو پہلی حدیث ہے اسکو حدیث جبریلؑ کہتے ہیں اور اُمّ الاحادیث بھی کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بصورتِ بشری حضرت جبریلؑ تشریف لائے کپڑے نہایت سفید اور صاف اور بال نہایت کالے اور چمکیلے تھے صحابہ رضی اللہ عنہم ان کو دیکھ کر حیرت میں پڑ گئے کہ یہ شخص نہ تو مقامی معلوم ہوتا ہے اور نہ ہی مسافر معلوم ہوتا ہے لباس کے اعتبار سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی مقامی شخص ہے کیونکہ آپ کے کپڑوں پر گرد وغبار کے آثار بالکل نہیں تھے جب کوئی مسافر سفر سے آتاہے تو اس کے کپڑوں پر گرد وغبار کے آثار ہوتے ہیں مگر ان کا حال یہ ہے کہ جیسے ابھی ابھی نیا اور سفید کپڑے پہن کر آئے ہوں اور جب بال پر صحابہ غور کرتے تو معلوم ہوتا کہ کون مسافر اجنبی شخص ہے کیونکہ اس قسم کا سیاہ اور چمکیلے بال والا مدینہ شریف میں کوئی نہیں تھا پھر وہ آکر بیٹھے تو اس طرح بیٹھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھٹنوں سے اپنے گھٹنوں کو ملا کر بیٹھے اور اپنے دونوں ہاتھوں کو رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم کے زانوں پر رکھے صحابہ رضی اللہ عنہم سمجھے کہ آنیوالا اجنبی شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بے تکلف دوست ہے اس کے بعد حضرت جبرئیلؑ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے سوال کرنا شروع فرمایا جب آپ نے جواب دیا تو حضرت جبریلؑ نے فرمایا صَدَقْتَ آپ نے سچ فرمایا اس پر صحابہؓ کو حیرت ہوئی کہ سوال کا منشا ریہ ہے کہ ایک بات معلوم نہیں ہے وہ معلوم کرنا چاہتا ہے اور صدقت کا مقصد تصدیق ہے یعنی یہ شخص جواب جانتا ہے اسی لیے اس کی تصدیق کر رہا ہے اس لیے صحابہؓ کو حیرانی ہوئی۔

یہ حدیث چونکہ اُم الاحادیث ہے اس لیے پوری حدیث شریف نقل کر کے اس کا ترجمہ کیا جا رہا ہے تاکہ اس کے یاد کرنے اور سمجھنے میں آسانی ہو پوری حدیث شریف اسلام اور اس کے احکامات اور ایمان واحسان کا نچوڑ اور خلاصہ ہے اس لیے اس حدیث شریف کو ضرور یاد کرنی چاہیئے نقل حدیث اور ترجمہ کے بعد حضرت حکیم الاسلام نے جو اس حدیث کی تشریح فرمائی ہے۔ اس کی تفصیل پیش کی جائے گی۔

حبیب اللہ قاسمی ناقل مجالس حکیم الاسلامؒ

حدیث شریف

عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ بَیْنَنَا نَحْنُ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ذَاتَ یَوْمٍ اِذْ طَلَعَ عَلَیْنَا رَجُلٌ شَدِیْدُ بَیَاضِ الثِّیَابِ شَدِیْدُ سَوَادِ الشَّعْرِ لَا یُرٰی عَلَیْہِ اَثَرُ السَّفَرِ وَلَا یَعْرِفُہٗ مِنَّا اَحَدٌ حَتّٰی جَلَسَ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَاَسْنَدَ رُکْبَتَیْہِ اِلٰی رُکْبَتَیْہِ وَوَضَعَ کَفَّیْہِ عَلٰی فَخِذَیْہِ وَقَالَ یَا مُحَمَّدُ اَخْبِرْنِیْ عَنِ

الْاِسْلَامِ قَالَ الْاِسْلَامُ اَنْ تَشْهَدَ اَنْ لَّآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا الرَّسُوْلُ اللّٰهِ وَتُقِيْمَ الصَّلٰوةَ وَتُؤْتِيَ الزَّكٰوةَ وَتَصُوْمَ رَمَضَانَ وَتَحُجَّ الْبَيْتَ اِنِ اسْتَطَعْتَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا قَالَ قَدْ صَدَقْتَ فَعَجِبْنَا لَهٗ يَسْأَلُهٗ وَيُصَدِّقُهٗ. قَالَ اَخْبِرْنِيْ عَنِ الْاِيْمَانِ قَالَ اَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَتُؤْمِنَ بِالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ قَالَ قَدْ صَدَقْتَ قَالَ فَاَخْبِرْنِيْ عَنِ الْاِحْسَانِ قَالَ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ قَالَ اَخْبِرْنِيْ عَنِ السَّاعَةِ قَالَ مَا الْمَسْئُوْلُ عَنْهَا بِاَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ قَالَ فَاَخْبِرْ عَنْ اَمَارَاتِهَا قَالَ اَنْ تَلِدَ الْاَمَةُ رَبَّتَهَا وَاَنْ تَرَى الْحُفَاةَ الْعُرَاةَ رِعَاءَ الشَّاءِ يَتَطَاوَلُوْنَ فِي الْبُنْيَانِ قَالَ ثُمَّ انْطَلَقَ فَلَبِثْتُ مَلِيًّا ثُمَّ قَالَ يَا عُمَرُ اَتَدْرِيْ مَنِ السَّائِلِ قُلْتُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ فَاِنَّهٗ جِبْرِيْلُ اَتَاكُمْ يُعَلِّمُكُمْ دِيْنَكُمْ یہ پوری حدیث جبریلؑ ہے

ترجمہ : حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انھوں نے فرمایا کہ ایک دن ہم لوگ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے اچانک ایک نو وارد شخص ہمارے پاس آیا اس کے کپڑے بہت صاف اور سفید تھے اور اس کے بال چمکیلے کالے تھے اس پر سفر کا اثر محسوس نہیں ہوتا تھا اور ہم میں سے کوئی اس کو پہچانتا بھی نہیں تھا وہ شخص آکر اس طرح سے بیٹھا کہ اپنی رانوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ران مبارک پر رکھدیا اور اپنے ہاتھوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ران مبارک پر رکھدیا اور سوال کیا کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم

آپ یہ بتلائیں کہ اسلام کیا چیز ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسلام یہ ہے کہ تو گواہی دے کہ نہیں ہے کوئی معبود علاوہ اللہ تعالیٰ کے اور گواہی دے اس بات کی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور اسلام یہ ہے کہ تم نماز پڑھو اور زکوٰۃ دو اور رمضان کے روزے رکھو اور اگر سفر حج کی طاقت ہو تو حج کرو۔ اس پر حضرت جبریل علیہ السلام نے فرمایا کہ آپ نے سچ فرمایا حضرت عمر فاروقؓ فرماتے ہیں اس اجنبی شخص کے سوال کرنے اور تصدیق کرنے سے ہم لوگ تعجب میں پڑ گئے اس کے بعد اس نے کہا کہ آپ مجھے ایمان کے متعلق بتلائیں کہ ایمان کیا چیز ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ ایمان یہ ہے کہ آپ ایمان لائیں اللہ پر اور ان کے فرشتوں پر اور ان کی کتابوں پر اور ان کے رسولوں پر اور آخرت کے دن پر اور تقدیر پر، اس کے اچھے اور بُرے ہونے پر حضرت جبریلؑ نے فرمایا کہ آپ نے سچ فرمایا اچھا اب آپ احسان کے متعلق فرمائیں کہ احسان کیا ہے چیز ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ احسان یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح سے کرو کہ گویا اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہے ہو اور اگر ایسی عبادت نہ کر سکو تو یہ تصور جما لو کہ خود حق تعالیٰ ہم کو دیکھ رہے ہیں اس کے بعد حضرت جبریلؑ نے سوال کیا کہ اچھا اب آپ قیامت کے بارے میں خبر دیں کہ قیامت کب آئے گی اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس کے متعلق تو آپ ہم سے زیادہ جانتے ہیں پھر حضرت جبریلؑ نے سوال کیا کہ آپ کم سے کم اس کی نشانیاں ہی کچھ بتلا دیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب ماں اپنا مالکہ پیدا کرنے لگے اور جاہل کندہ تراش لوگ برسرِ اقتدار آجائیں اور بڑی بڑی بلڈنگیں بنانے لگیں اور ان میں بیٹھکر فخر کی باتیں کریں

حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ پھر جبریلؑ چلے گئے میں تھوڑی دیر بیٹھا رہا۔ رسول اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عمر کیا تم نے پہچانا سوال کرنیوالا کون تھا میں نے کہا اللہ اور اسکے رسول زیادہ جانتے ہیں۔ آپنے فرمایا کہ وہ جبریلؑ تھے تمہارے پاس اسلئے آئے تھے تاکہ تمکو تمہارا دین سکھلیں

اسلامی عقائداور اس کی بنیادیں

حضرت جبریل علیہ السلام نے پہلا سوال اسلام کے متعلق کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں فرمایا اَلْاِسْلَامُ اَنْ تَشْهَدَ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنَّ مُحَمَّدً رَّسُوْلُ اللّٰهِ سوال کے جواب میں پہلا جز کلمۂ شہادت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش فرمایا اور کلمۂ شہادت میں دو جز ہیں۔ ایک توحید۔ دوم رسالت اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی پہلی بنیاد توحید و رسالت ہے جب تک آدمی توحید و رسالت کی شہادت نہیں دے گا وہ مسلمان نہیں بنے گا۔ کلمۂ توحید و شہادت کے عنوان دو ہیں مگر مطلب اور مفہوم دونوں کے ایک ہی ہیں یعنی توحید و رسالت کا اقرار کرنا یا ان کی شہادت دینا اس لیے اسلام للنے کے لیے تین شرطیں رکھی گئی ہیں ایک تو کلمۂ توحید کا زبان سے اقرار کرنا اور دوسری شرط دل سے اس کا یقین بھی کرنا اگر آدمی کے دل نے کلمہ پڑھنے کے بعد توحید و رسالت پر یقین نہیں کیا تو وہ مسلمان نہیں بنے گا صرف زبان سے کہنے کی وجہ سے مسلمان مسلمان نہیں بنتا بلکہ اس کلمہ کا یقین کرنے سے مسلمان بنتا ہے تیری شرط عمل بِالْاَرْکَانْ ہے یعنی اس کے ارکان پر عمل کرنا اگر کلمۂ توحید زبان سے کہدیا اور اس پر یقین بھی کرلیا تو مسلمان ہوگیا مگر اس کا اسلام اس وقت تک ناقص رہے گا جب تک کہ وہ اسلام کے ارکان پر عمل نہ کرے گا ارکان اسلام پر عمل کرنے سے ہی مسلمان کا مسلمان ہونا معلوم ہوتا ہے جواب کا پہلا جز یہی دو چیزیں اسلامی عقائد کی بنیادیں ہیں اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارکان اسلام کو بتلایا کہ کلمۂ شہادت کے بعد مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ نماز بھی پڑھے اور زکوٰۃ بھی دے اور رمضان کے روزے بھی رکھے اور اگر حج کے شرائط پورے ہوجائیں تو حج بھی کرے۔ یہ چار چیزیں فرائض اسلام میں سے ہیں جن کو اسلام کی بنیاد بھی کہا جاتا ہے یعنی کلمۂ توحید کی بنیاد کے ساتھ یہ بنیادیں بھی ضروری ہیں اگر ان پانچ بنیادوں میں سے ایک کو بھی گرادیا تو فوراً اس کا اسلام ناقص اور نامکمل ہوجائے گا جب یہ فرائض اسلام ہیں تو ان کا جاننا بھی ضروری ہے اور ان پر عمل کرنا بھی ضروری ہے مثلاً قرآن کے اندر تو صرف نماز روزہ زکوٰۃ

وحج کی فرضیت بتلادی گئی مگر یہ نہیں بتلایا گیا کہ نماز کس طرح سے پڑھو روزہ کس طرح سے رکھو زکوۃ کس طرح سے دو اور حج کس طرح سے کرو یہ طریقے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی دیکھ کر معلوم ہوں گے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ کو ان اعمال کو کرتے ہوئے دیکھا اور خود ان پر عمل کر کے دکھایا اس لیے ان فرائض پر عمل کرنے کے طریقے معلوم ہوتے گئے اور علماء امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم میں فقہاء بھی پیدا ہو گئے انھوں نے قرآن و حدیث اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل پڑھ کر اور صحابہ کے حالات کو دیکھ کر اور معتبر شخصیات سے سن کر ان کے مسائل کی تدوین کی فرائض کو الگ واجبات کو الگ اور اسی طرح سنن و نوافل و مستحبات کو الگ الگ کر کے کتابیں مرتب کیں ان کا نام فقہ رکھا گیا تو اس سے معلوم ہوا کہ ہمارے نصاب اسلامی کی کتابیں تین قسم کی ہوئیں ایک قرآن کریم دوم احادیث نبوی اور تیسری ان دونوں کا مجموعہ یعنی علم فقہ۔ اسی لیے ہمارے بزرگوں نے انھیں تین قسم کی کتابوں کو نصاب تعلیم میں رکھا اور انھیں کو سمجھنے اور سمجھانے پر محنتیں کیں رہی منطق اور فلسفہ وغیرہ یہ ہمارے تعلیم اسلامی کی نصابی کتابیں نہیں ہیں ان کو تو بطور معین رکھ دیا گیا ہے کیونکہ ان کے پڑھنے سے طالب علم کا ذہن کھلتا ہے اور معلومات میں اضافہ ہوتا ہے تو زمانے کے رنگ کو دیکھ کر ان کو بھی بالغرض داخل نصاب کر دیا گیا جیسے کہ آج کل علم سائنس کا دور ہے اس علم کو اگر ہم نصاب میں رکھیں گے تو مقاصد میں ان کو داخل نہیں کریں گے بلکہ معین کے طور پر داخل کر لیں گے۔

ایمان اور اسلام

حضرت جبریل علیہ السلام نے دوسرا سوال کیا کہ یا رسول اللہ صلے اللہ علیہ السلام اَخْبِرْنِیْ عَنِ الْاِیْمَانِ آپ ایمان کے بارے میں خبر دیں کہ ایمان کیا چیز ہے تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آپ ایمان لائیں اللہ پر اور ان کے فرشتوں پر اور ان کی کتابوں پر اور ان کے رسولوں پر اور تقدیر پر اس کے اچھے اور برے ہونے پر اور آخرت کے دن پر پہلا سوال اسلام کے متعلق کیا گیا اور دوسرا سوال ایمان کے متعلق کیا گیا اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام خاص ہے جو

دین محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیا گیا وہ دین اسلام ہے اور خود اللہ تعالیٰ نے اعلان فرمادیا کہ وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ جو شخص اسلام مذہب آنے کے بعد دوسرے مذہب کی اتباع اور تلاش کرے گا اس کا مذہب ہرگز قبول نہیں کیا جائیگا اسلام آنے کے بعد سارے مذاہب کے قوانین منسوخ ہو چکے ہیں ان قوانین پر عمل کرنیوالے کامیابی حاصل نہیں کر سکتے اور نہ ہی نجات پاسکتے ہیں اگر اپنی نجات چاہتے ہو اور آخرت کی کامیابی چاہتے ہو تو اسلام کا دامن پکڑ لو اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا یہ آخری نبی اور رسول ہیں انھیں کی اطاعت میں نجات اور کامرانی ہے تو پہلے اسلام اور اس کے قوانین کو بتلایا گیا اور دوسرا سوال ایمان کے متعلق کیا گیا کہ ایمان کیا ہے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ ایمان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات بابرکت پر ایمان لاؤ کہ وہی سب کے خالق اور مالک ہیں وہی معبود حقیقی ہیں انھیں کے قبضۂ اختیار میں سارے عالم کا نظام ہے وہ جو چاہتے ہیں وہی ہوتا ہے اور وہی جو کرتے ہیں وہی ہوتا ہے وہ کسی کا محتاج نہیں ہیں سارا عالم ان کا محتاج ہے اس پر آدمی کا مکمل عقیدہ ہو تبھی انسان مومن بن سکتا ہے اور یہ ایمان عام ہے سارے انبیاء علیہم السّلام کی اُمتیں جو ان پر ایمان لائی تھیں وہ سب کے سب مومن تھے ان کو مومن کہا جائے گا مسلمان نہیں کہا جائے گا کیونکہ اسلام اور مسلمان کا لقب صرف اُمتِ محمدیہ علیہ السّلام والصلوٰۃ کو ہی ملا ہے پھر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کے بعد ان کے فرشتوں پر ایمان لاؤ کہ وہ سب کے سب معصوم ہیں وہ وہی کرتے ہیں جو خدا کا حکم ہوتا ہے ایک ذرہ بھر کوئی کام حکمِ خداوندی کے خلاف نہیں کر سکتے اس لیے ان کی صداقت پر بھی ایمان ہو اگر ان پر خیانت کا الزام لگایا گیا تو خدا کے احکامات پر انسان کو اعتماد نہیں رہے گا اس کے بعد فرمایا کہ ایمان لاؤ ان کی کتابوں پر یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف سے جتنی کتابیں اور جتنے صحیفے انبیاء علیہم السلام پر اُتاری گئیں وہ حق ہیں وہ خدا کی ہی کتابیں ہیں

وہ خداہی کے صحیفے تھے اور جو ان کے اندر احکامات دئے گئے تھے وہ سب کے سب حق ہیں اپنے اپنے دور کے وقت وہ کتابیں قابلِ اعتبار اور عمل تھیں اور ان پر عمل کرنیوالے مومن ناجی تھے اس کے بعد فرمایا ورسلہ اور ایمان لاؤ اللہ کے رسولوں پر ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء علیہم السلام دنیا میں تشریف لائے وہ سب کے سب حقانی تھے سبھی نے خدا کے حکم کے مطابق تبلیغ و دعوت کا کام کیاہے اور جو احکامات ان کے سپرد کئے تھے۔ وہ بھی حقانی تھے بڑی ذمہ داری کے ساتھ انھوں نے اپنی اپنی امتوں کے سامنے پیش کیا جو انبیاء علیہم السلام پر ایمان لائے وہ نجات پاگئے اور جو لوگ ان کی مخالفت کئے یا ان کی دعوت کو مقبول نہیں کئے وہ لوگ کافر اور مشرک کہلائے گئے اور خدا کے عذاب الیم میں پکڑ لیے گئے تو انبیاء علیہم السلام اور ان کے اوپر نازل کی گئیں کتابوں پر ایمان لانا ضروری قرار دیا گیا لیکن اس امت کو عمل کرنے کے لیے صرف مذہبِ اسلام کے قوانین ہوں گے

اب آدمی کی کامیابی اور اس کی نجات صرف مذہب اسلام کے احکامات پر عمل کرنے سے ہوگی اس کے بعد فرمایا کہ والیوم الآخر یعنی آخرت پر بھی ایمان لاؤ کہ ایک دن قیامت قائم ہوگی اور عالم آخرت سامنے ہوگا ہر انسان کو اپنے کئے ہوئے اعمال کا حساب دینا پڑے گا جیسا دنیا میں آدمی نے کیاہے اسی کے اعتبار سے آخرت میں ثمرات مرتب ہوں گے۔ اگر اس نے اپنے رسول یا نبی پر ایمان لاکر ان کے حکم کی تعمیل کی ہے تو وہ جنت میں جائے گا ورنہ دوزخ میں ڈال دیا جائے گا وہ دن فیصلہ کا دن ہوگا اس لیے اس دن پر ایمان لاؤ اور اس پر یقین کرو اگر اس پر یقین ہوگیا تو انسان دنیا سے عالم آخرت کے لئے کچھ تیاریاں کرکے جائے گا اور اگر آخرت پر ایمان ہی نہ ہو تو پھر تیاری کس چیز کی کرے گا پھر فرمایا تقدیر پر ایمان لاؤ اللہ تعالیٰ نے جو انسان کی تقدیر میں لکھ دیاہے وہ خیر ہو یا شر ہو وہی ہوکر رہے گا تو اس سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کا اصل عقیدہ توحید و رسالت کلمہ مگر اس کے ساتھ ساتھ ان باتوں پر بھی عقیدہ اور ایمان لانا ضروری قرار دیا گیا جو دوسرے سوال کے جواب

ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس لیے اسلامی عقائد میں یہ ساری چیزیں داخل ہیں ان میں سے کسی کا اگر آدمی انکار کرے گا تو وہ کافر ہو جائے گا۔

احسان تصوّف کی بنیاد ہے

حضرت جبریل علیہ السلام کا تیسرا سوال یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ مجھے احسان کے متعلق خبر دیں کہ احسان کیا چیز ہے تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ احسان یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی اس طرح سے عبادت کرو کہ گویا ان کو دیکھ رہے ہو اور اگر یہ تصور نہ ہو سکے تو کم سے کم یہ تصور کرو کہ وہ ہم کو دیکھ رہے ہیں جب انسان اس طرح سے عبادت کرے گا اور تصوّر جمائے گا کہ ہمارا مالک اور خالق اور وہ معبود جس کی ہم عبادت کر رہے ہیں وہ ہمارے سامنے ہے تو اس بندے کی عبادت کا رنگ ہی کچھ اور ہو گا اسی لیے صوفیاء حضرات نے احسان کو اپنے تصوف اور طریقت کا اہم بنیاد بنائی ہے اور اس پر اپنی ساری کوششوں اور محنتوں کو صرف کیا۔ کہ حق تعالیٰ شانہٗ کی عبادت اسی طرح سے ہو کہ عابد اُن کو اپنے سامنے ہونے کا یقین کرے خواہ عبادت بدنی ہو یا مالی ہو دونوں میں شانِ احسان ضروری ہے جب خدا تعالیٰ کو انسان حاضر اور ناظر سمجھے گا تو اس کی نماز میں جان اور روح پڑے گی اور نماز کے حقوق کو رعایت کرتے ہوئے پڑھے گا اور جب روزہ رکھے گا تو اس کے حقوق کی بھی رعایت کرے گا حضورِ معبود کے تصور سے عابد کے اندر خلوص پیدا ہو گا نام و نمود اور ریاکاری سے محفوظ رہے گا جب زکوٰۃ دے گا تو اس کے حق کی بھی رعایت کرے گا پوری پوری زکوٰۃ دے گا اور اس کے صحیح مصرف میں خرچ کرے گا کیونکہ وہ خدا کے سامنے زکوٰۃ کا حق ادا کر رہا ہے اس لئے اس میں خیانت نہیں کرے گا جب وہ حج کے فریضہ کو ادا کرے گا تو صرف رضا بر حق سامنے ہو گی وہ دنیا لے کر حج کرنے نہیں جائے گا بلکہ خدا کے حکم کو خدا ہی کے حکم کے مطابق پورا کرنے کے لیے جائے گا قدم قدم پر خوف کرے گا اور اسکے ارکان کو کامل طور پر ادا کرے گا اور اگر عبادت میں خدائے تعالیٰ کے حاضر ہونے کا تصور نہ کیا گیا

تو اس کی عبادت میں بہت سے نقائص پیدا ہوں گے بندہ عبادت کا حق ادا نہ کر سکے گا

جب انسان کسی چیز کے حاضر ہونے کا تصور جمالیتا ہے تو وہ چیز گویا اس کے سامنے حاضر ہو جاتی ہے وہ اس کا احساس بھی کرتا ہے اور اس پر یقین بھی کرتا ہے۔

میاں جی کلے کھڑوو کا واقعہ

پہلے خانقاہ محلہ دیوبند شہر سے بالکل الگ تھا دونوں کے درمیان ایک بہت بڑا گنجان باغ تھا بچپن کے زمانے میں ہم نے اس باغ کو دیکھا ہے اب تو تقریبًا دونوں مل گئے ہیں نہ وہ باغ رہا اور نہ ہی وہ نقشہ رہا ہمارے دیوبند میں ایک میاں جی تھے وہ میاں جی کلے کھڑوو کے نام سے مشہور تھے ان کا دعویٰ تھا کہ میں شاعر ہوں اور ان کی شاعری یہ تھی کہ وہ اشعار کے مصرعوں کو تاگے سے ناپتے تھے اور دونوں مصرعوں کو ناپ کر برابر کرتے تھے کس مصرعہ میں الفاظ زیادہ ہیں اور کس میں کم ہیں اس سے ان کی شاعری کی غرض نہیں تھی بلکہ تاگے کے ناپ کے مطابق ہونی چاہیئے یہ ان کی شاعری تھی اور ان کا دعویٰ یہ بھی تھا کہ میں بہادر ہوں کسی سے نہیں ڈرتا ہوں وہ باغ جو دیوبند اور محلہ خانقاہ کے بیچ میں تھا وہ گنجان باغ تھا رات کو وہاں اندھیرا رہتا تھا اس کے درمیان سے خانقاہ میں جانے کے لیے راستہ تھا رات کو ڈر لگتا تھا

میاں جی کلے کھڑوو کو محلہ خانقاہ میں جانے کا اتفاق ہو گیا رات اندھیری تھی اور آسمان پر بادل بھی تھے اس لیے اندھیرے پر اندھیرے کا منظر تھا درمیان میں گنجان باغ تھا لوگوں نے میاں جی کو سمجھایا کہ آپ اندھیری رات میں اکیلے نہ جائیں بلکہ دو تین آدمیوں کو اپنے ساتھ لیجائیں میاں جی نے کہا کہ میں کسی سے نہیں ڈرتا کسی کو اپنے ساتھ نہیں لے جاؤں گا اور ہاتھ میں لاٹھی اٹھائی اور اکیلے روانہ ہو گئے رات اندھیری تھی ہی جب وہ بیچ باغ میں پہونچے تو دیکھتے ہیں کہ سامنے ایک ڈاکو پگڑی باندھے ہوئے ہاتھ میں لاٹھی لے کر کھڑا ہے۔

میاں جی گھبرائے اور ڈرنے لگے اور سوچنے لگے کہ اگر آگے جاتا ہوں تو ڈاکو لوٹ لے گا اور اگر بھاگتا ہوں تو وہ دوڑ کر آئے گا اور ہم کو مارے گا نہ قدم آگے اٹھ رہے ہیں اور نہ پیچھے چل

رہے ہیں خوف وہراس کی وجہ سے کانپ رہے ہیں آخر میں دور ہی سے انھوں نے فرمایا کہ بھائی صاحب آپ کو معلوم نہیں ہے کہ میں کون ہوں ہمارے اور آپ کے والدین بڑے اچھے تعلقات تھے. آپس میں اٹھنا بیٹھنا تھا میں انھیں کا لڑکا ہوں آپ مجھے معاف فرمادیں اور ماریں نہ. میں غریب آدمی ہوں میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے اس طرح سے اس کے سامنے اپنی عاجزی بیان کر رہے ہیں اور اس کی منتیں کر رہے ہیں مگر وہ خاموش کھڑا ہے میاں جی کو احساس ہوا کہ ڈاکو خاموش ہے اس کا ارادہ اچھا نہیں ہے اب تو یہ مارے گا اور لوٹے گا ورنہ کچھ تو بولتا اس احساس سے ان کے اندر اور خوف پیدا ہوا کھڑے کانپ رہے ہیں۔ اور ڈر رہے ہیں رات اندھیری تھی اوپر بادلوں کا گھراؤ تھا ادھر خطرناک ڈاکو کا منظر سامنے تھا اس وقت میاں جی کا کیا حال رہا ہوگا میاں جی اسی فکر وغم میں کھڑے تھے کہ اچانک بادل سے ایک بجلی چمکی اور پورا باغ جو اندھیروں سے ڈھنکا ہوا تھا وہ روشن ہوگیا میاں جی کی آنکھیں کھل گئیں انھوں نے دیکھا کہ یہ تو نہ کوئی ڈاکو ہے نہ ہی کوئی چور ہے بلکہ کٹا ہوا ایک درخت ہے ایک ٹہنی لٹکی ہوئی ہے وہ لاٹھی کی شکل میں دکھائی دیتی تھی اوپر کا حصہ پگڑی کی شکل میں دکھائی دیتا تھا اور ان کو یقین ہوگیا تھا کہ یہ کوئی بڑا خطرناک ڈاکو ہے جب میاں جی نے دیکھا کہ یہ تو ایک کٹا ہوا درخت ہے تو اب تو وہ نڈر ہوگئے اور بالکل پاس جاکر اس کو گالی دے کر چند لاٹھی ماری یہ تھی ان کی بہادری بہر حال میاں جی کے اندر ایک تصور جما کہ یہ ڈاکو ہے لیکن وہ حقیقت میں کٹا ہوا درخت تھا جب انسان کے تصور سے کٹا ہوا درخت ڈاکو محسوس ہونے لگے جس کی حقیقت کچھ بھی نہیں تھی تو پھر حق تعالیٰ کا تصور اگر اس طرح سے عابد کے دل میں جم جائے جو معبود حقیقی ہے جس کے سامنے ساری کائنات کا ہر ہر ذرہ ہر ہر وقت موجود رہتا ہے اور واقعی وہ ہر وقت ہمارے سامنے ہی رہتے ہیں تو اس کی عبادت کی شان کیسی ہوگی اور کس طرح عبادت میں اس کو لطف آئے گا۔

شریعت اور طریقت

علم تصوف کے اندر غالی صوفیوں نے اس قدر بدعات کو ملا دیا کہ علماء ظاہر نے ان کو اور ان کے اعمال کو دیکھ کر یہ فیصلہ کر دیا کہ تصوف اور صوفیاء یہ تو بدعات کی جڑیں ہیں یہ شریعت اسلام کے بالکل خلاف ہیں اور یہ وہم کر لیا کہ طریقت کچھ اور چیز ہے اور شریعت کچھ اور چیز ہے جس کی وجہ سے عوام میں ایک قسم کا خلجان پیدا ہو گیا ہمارے اسلاف دیوبند جہاں وہ صاحب نسبت تھے وہاں وہ صاحب وجد و حال بھی تھے مگر انتظام شریعت کی وجہ سے وجدانی کیفیات کو دبا دیتے تھے عشق الٰہی اور عشق رسول صلے اللہ علیہ وسلم سے ان کے قلوب مجروح تھے مگر ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے یہ ان کا کمال تھا کہ وجدانی کیفیات کو مغلوب کر لیتے تھے بعض علماء کو غلط فہمی ہو گئی کہ ان کو طریقت سے کوئی لگاؤ نہیں ہے اولیاء اللہ کے طریق پر یہ لوگ نہیں ہیں اس لیے ہمارے اسلاف نے اس مسئلے کو بھی صاف کر دیا اور یہ ثابت کر دیا کہ طریقت شریعت سے کوئی الگ چیز نہیں ہے بلکہ اسلام کے ظاہر کو شریعت کہتے ہیں اور اس کے باطن کو طریقت کہتے ہیں جس طرح ظاہری شریعت کا ثبوت قرآن و احادیث سے ملتا ہے اسی طرح باطنِ اسلام جس کو تصوف اور طریقت کہتے ہیں اس کا ثبوت بھی قرآن و حدیث میں موجود ہے ہمارے بزرگوں میں خصوصاً حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس موضوع پر تجدیدی خدمات انجام دیں ہیں آپ نے التشرف فی احادیث التصوف کی تصنیف فرمائی اور التکشف عن مہمات التصوف کی بھی تصنیف فرمائی اس کے علاوہ اپنے مواعظ و ملفوظات کے ذریعہ بھی اسکی وضاحت فرمائی اور بدعات کو طریقت اور تصوف سے نکال کر پھینک دیا اور خالص طریقت پیش فرمایا اور صوفیاء حضرات کے ہر عمل کا مدلول قرآن و حدیث سے ثابت فرما کر اس مسئلے کو صاف کر دیا یہ عنوان تفصیل طلب ہے لیکن چند باتیں بطور نمونہ ہم پیش کر رہے ہیں۔

جس طرح ظاہر شریعت کے اندر

تصوّف اور طریقت کا ثبوت قرآن وحدیث سے

حلال وحرام جائز و ناجائز ہیں اسی طرح طریقت کے اندر یعنی باطن شریعت میں بھی حلال وحرام جائز و ناجائز ہیں مثلاً خلوص ہے یہ محمود اور مطلوب ہے اور اس کا مقابل ریاء یہ مذموم اور مردود ہے۔

مگر یہ وہ اعمال ہیں جو انسان کے قلب میں ہوتے ہیں عام طور پر پتہ نہیں چلتا کہ یہ شخص یہ عمل خالص اللہ کے لیے کر رہا ہے یا نام ونمود وشہرت کے لیے کر رہا ہے شریعتِ ظاہرہ تو فوراً عامل کے عمل کو دیکھ کر جائز اور ناجائز تبلادے گی۔

مثلاً ایک شخص نماز پڑھ رہا ہے یا روزہ رکھ رہا ہے یا زکوٰۃ دے رہا ہے تو شریعت فیصلہ کر دے گی کہ یہ شخص اچھے کام کر رہا ہے اور اگر آدمی شراب پیتا ہے اور زنا و چوری کرتا ہے تو شریعت ظاہرہ اس کے حرام ہونے کا فتویٰ دے دیگی مگر باطن شریعت میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا کہ اس عمل سے اس کا مقصد کیا ہے خلوص ہے یا ریاکاری ہے یہ قلبی اعمال ہیں انسان کا قلب ہی اس کو جانتا ہے یا وہ حضرات ان امراض کو پہچانتے ہیں جو اس کے ماہر حکیم ہیں اور وہ صوفیاء حضرات ہیں ان کی ساری کوشش باطنی امراض کے اصلاح کرنے کرانے میں ہوتی ہے اور انھیں اعمال کو درست کرنے کے لیے مجاہدہ کراتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے منافقین آتے تھے وہ کلمۂ اسلام بھی پڑھتے تھے اور آپ کی رسالت کی شہادت بھی دیتے تھے اور وہ سارے اعمال بھی کرتے تھے جو عام مسلمان کرتے تھے اس لیے ظاہری شریعت ان کے مسلمان ہونے کا فیصلہ کرتی ہے مگر باطن شریعت ان کے کفر کا فیصلہ کرتی ہے قرآن حکیم اس کی دلیل ہے اللہ تعالیٰ نے سورۂ منافقین میں فرمایا اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ ۔ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ. وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ

لَكَاذِبُوْنَ۔

ترجمہ: جب منافقین آپ کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ بیشک آپ اللہ کے رسول ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے کہ آپ بیشک اللہ کے رسول ہیں اور اللہ گواہی بھی دیتا ہے اس بات کی کہ منافقین اپنے قول میں جھوٹے ہیں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے قلوب کو خوب جانتے ہیں کہ اس کے قلب کے اندر کیا ہے اس لیے انھوں نے ان کے ظاہری عمل کے خلاف شہادت پیش کردی کہ یہ زبان سے کلمہ پڑھتے ہیں اور توحید و رسالت کا اقرار بھی کرتے ہیں مگر ان کے قلوب میں توحید و رسالت کا کلمہ داخل ہی نہیں ہوا ہے ان کے قلوب خدا و رسول کے منکر ہیں اسی لیے وہ آپ کے سامنے میٹھی میٹھی باتیں کرتے ہیں اور اسلام کا راز معلوم کرتے ہیں مگر جب اپنے ساتھیوں میں جاتے ہیں تو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرتے ہیں۔ اور مسلمانوں کے خلاف لوگوں کو بھڑکاتے ہیں ان کے قلوب اسلام سے خالی ہیں وہ لوگ ریاکار ہیں اس سے معلوم ہوا کہ وہ اعمال جن کے اندر ریا شامل ہو خلوص سے خالی ہو وہ دربار خداوندی میں مردود ہے اسی لیے حدیث میں آتا ہے کہ قیامت کے دن ریاکار عالم حافظ اور سخی و شہید بلائے جائیں گے ظاہری طور پر تو انھوں نے بڑے اچھے اچھے کام کیے ہوں گے مگر ان کے اعمال خلوص سے خالی ہوں گے وہ ریاکاری سے بھرے ہوئے ہوں گے اللہ تعالیٰ ان کے سارے اعمال کو مردود کرکے ان کو دوزخ میں ڈال کر اس کا ایندھن بنا کر سخت عذاب میں مبتلا کردیں گے۔

اسی طرح تواضع ہے اس کا مقابل کبر ہے تواضع مطلوب اور محمود ہے اور کبر حرام اور مذموم ہے تواضع کے بارے میں حدیث میں فرمایا گیا۔ مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰہِ رَفَعَہُ اللّٰہُ (جس نے اللہ کے لیے انکساری اور تواضع اختیار کی اللہ تعالیٰ اس کو بلند مقامات سے نوازیں گے)، بخلاف تکبر کے یہ شانِ کبریائی ہے صرف ذات حق تعالیٰ کے ساتھ خاص

ہے جس نے بھی اس میں کسی قسم کا دخل دیا فوراً اس کو مردود فرما دیا ابلیس اپنی عبادت اور ریاضت کی وجہ سے اعلیٰ مقام پر پہونچ گیا اور فرشتوں کا سردار بھی بن گیا لیکن جب اس نے تکبر اختیار کیا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے دربار سے نکال کر پھینک دیا اور اس کی ساری عبادات و ریاضات کو مردود کر دیا اور لعنت کی زنجیر اس کے گلے میں باندھ دی قرآن و حدیث میں جا بجا تکبر کی مذمت اور تواضع کی مدحت آئی ہے اسی طرح عبادت میں اللہ تعالیٰ کے حاضر اور ناظر ہونے کا تصور جمانا ہے جیسا کہ احسان سے معلوم ہوا حدیث میں آتا ہے کہ بہت سے نمازیوں کی نمازیں اس کے منہ پر اُلٹے مار دی جاتی ہیں یعنی اسکی نمازیں مردود ہو جاتی ہیں۔

ظاہر ہے جب اللہ تعالیٰ کو اپنے سامنے حاضر ناظر نہیں سمجھے گا تو دنیا کی چیزیں اس کے سامنے آئیں گی جب نمازی اپنے دل کو دنیا میں لٹکا دے گا اور جو نماز پڑھنے کے اصول اور قواعد بتلائے گئے ان کے مطابق نماز نہیں پڑھے گا تو اس کی نماز کا وہی حال ہوگا اسی لیے صوفیاء حضرات نے سب سے پہلے قلبی کیفیات کی گرفت کی ہے کہ اگر اس کا قلب درست نہ ہوا تو اس کا کوئی عمل مقبول نہیں ہوگا اس لیے ظاہری شریعت کے ساتھ اس کے باطن کی اصلاح کی ضرورت تھی اس کو مصلحین امت جن کو اولیاء اللہ کہتے ہیں انھوں نے اس کی اصلاح کی اور ان اعمال کی اصلاح کے لیے کچھ قواعد اور اصول مرتب کیے اس میں مجاہدہ بھی ہے ریاضت بھی ہے مراقبہ بھی ہے اور اس میں کسی مصلح سے بیعت ہونا بھی ہے ان کے علاوہ جس جس طریقے سے انسان کے قلب کی اصلاح ممکن تھی انھوں نے فن تصوف میں شامل فرمایا۔

صوفیاء کا اتباع سُنّت

سارے اولیاء کرام کا اس مسئلے پر اتفاق ہے کہ غیر متبع سُنّت ولی ہو ہی نہیں سکتا ہے ولایت کے لیے اتباعِ سُنّت شرط ہے اس لیے کسی بزرگ یا ولی کے متعلق یہ کہدینا کہ وہ بدعتی ہیں جرم ہے اگر وہ

ولی ہے تو بدعتی نہیں ہوگا اور اگر بدعتی ہے تو وہ ولی ہو ہی نہیں سکتا چنانچہ اولیا ر چشتیہ کے متعلق بعض ظاہر پرست علمار کو ان کے بعض اعمال کو دیکھ کر بدعت کا وہم ہو گیا ہے صاحب حال اولیار اللہ کے یہاں وجد و سماع کا معاملہ صرف علاج کے طور پر تھا اعمال کے طور پر نہیں تھا عمل ان کا اتباع سُنت ہی پر تھا وہ حضرات عاشق ہوتے تھے کبھی ان پر عشق کا غلبہ ہو جاتا تھا تو وجدانی کیفیت ان پر طاری ہوتی تھی مگر اس کے باوجود مریدین کو تنبیہ کرتے تھے کہ جب ہمارے اوپر ایسی کیفیت طاری ہو جائے تو نماز کے وقت بیدار کر دینا چنانچہ حضرت عبدالحق ردولوی رحمۃ اللہ علیہ پر جب وجدانی کیفیت طاری ہوتی تھی تو باقاعدہ نماز کے وقت ان کے سامنے الصلوٰۃ الصلوٰۃ کی آواز لگائی جاتی تھی ۔ یہ حضرات غلبہ کے وقت بھی ظاہری شریعت سے غافل نہیں ہوتے تھے ۔

حضرت مولانا عبدالقدوس رحمۃ اللہ علیہ گنگوہی کا واقعہ

ایک مرتبہ حضرت مولانا عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ پر وجدانی کیفیت طاری ہوئی تو کئی دن تک رہی وہ اسی حالت میں نماز پڑھتے تھے مگر اس حالت کی نماز بظاہر شریعت کے خلاف تھی جب افاقہ ہوا تو شہر کے قاضی صاحب کو بلایا کہ ہمارے اوپر یہ کیفیت طاری ہو گئی تھی ہم نے نمازیں بھی پڑھیں کیا ساری نمازوں کو لوٹالوں تو حضرت قاضی صاحب نے فرمایا کہ حضرت اصل نماز تو وہی ہے جو آپ نے وجدانی کیفیت کی حالت میں پڑھی ہے لیکن ظاہری شریعت کے خلاف تھیں اس لیے اگر دوبارہ اعادہ کر لیا جائے تو بہتر ہے حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے ساری نمازوں کو دوبارہ ادا فرمایا اس سے معلوم ہوا کہ اہل اللہ ظاہری شریعت کی بھی پابندی فرماتے تھے وہ سب کے سب متبع سُنت تھے اگر ان کی ایک سُنت بھول کر چھوٹ جاتی تھی تو زندگی بھر اپنے نفس کو ملامت کرتے تھے جب ایک سُنت بھول کر چھوٹنے پر ان کا حال یہ تھا تو قصداً سُنت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کس طرح چھوڑ سکتے تھے پھر جب وہ لوگ سُنّت نہیں چھوڑ سکتے تھے تو فرائض و واجبات کس طرح چھوڑ سکتے تھے اسی لیے حضرت حکیم الامت تھانوی ؒ نے ایک کتاب تالیف فرمائی اس کا نام السنتہ الجلیہ رکھا اور مشائخ چشتیہ حضرات کو متبع سنت ثابت کیا۔

حضرت جبریل علیہ السلام نے چوتھا سوال فرمایا اخبرنی عن الساعۃ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ قیامت کے بارے میں فرمائیں کہ وہ کب آئے گی اس پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے عدم علمی کا اظہار فرمایا اس سوال کا جواب خود سائل یعنی حضرت جبریل ؑ کو بھی معلوم نہیں تھا کیونکہ یہ وہ علم ہے کہ جس کا علم صرف خدا ہی کو ہے کہ قیامت کب آئے گی پھر سوال ہی کیوں کیا گیا اس کی وجہ یہی تھی کہ تاکہ اس کا بھی علم ہوجائے کہ قیامت کب آئے گی اس کا علم کسی کو نہیں ہے یہ صرف حق تعالیٰ ہی جانتے ہیں۔

پھر حضرت جبریل علیہ السلام نے سوال فرمایا کہ اخبرنی عن اماراتھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پھر تو آپ اس کی کچھ نشانیاں ہی بتلا دیں اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب عورتیں اپنے پیٹ سے مالکہ پیدا کرنے لگیں اور جاہل لوگ کندہ تراش بداخلاق برسراقتدار آجائیں اور بڑی بڑی بلڈنگوں کو بنا کر سرداری کا دعویٰ کریں اور عقلمند لوگ جوتیاں چٹکاتے پھریں جب ایسا وقت آجائے تو سمجھ لو کہ اب قیامت قریب ہے۔

مجاہدہ مشاہدہ مراقبہ

یہ پوری حدیث ہے اس کو حدیث جبریل ؑ کہا جاتا ہے اور اُم الاحادیث بھی اس کو کہتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اَنْ تَعْبُدَ اس سے اشارہ مجاہدہ کی طرف

ہے یعنی نماز میں مجاہدہ ہو اغیار سے مقابلہ ہو کہ نماز کے اندر صرف حق تعالیٰ شانہ کی ذات بابرکات سامنے ہے بقیہ ساری چیزیں نگاہوں سے بھی اور دل سے بھی نکل جائیں مجاہدہ میں غیروں کو نکال کر ایک کو دل و دماغ میں بیٹھایا جاتا ہے۔ اور کانک تراہ سے اشارہ ہے مشاہدہ کی طرف یعنی حق تعالیٰ کی ذات کا اس طرح سے تصور باندھو کہ وہ تصور میں حاضر اور ناظر معلوم ہوں جب خدا کی ذات عابد کے سامنے ہو گی تو عبادت کر رہا ہے وہ سامنے ہو گی تو دل ادھر اُدھر بھٹکے گا نہیں اور بندگی میں لطف آئے گا بندہ اپنی عاجزی اور نیازی پیش کرے گا اور دل میں خلوص پیدا ہو گا نام و نمود اور ریاکاری سے قلب پاک ہو جائے گا۔ اور فانہ یراك سے اشارہ ہے مراقبہ کی طرف یعنی نماز کے اندر یہ مراقبہ ہو کہ اگرچہ ہم ان کو نہیں دیکھ رہے ہیں ہماری آنکھوں میں ان کے دیکھنے کی طاقت پیدا نہیں ہوئی لیکن دل ہی دل میں ہم تصور جما لیں کہ وہ ہمارے سامنے ہیں۔

تصوف کی بنیادوں میں یہ تین بنیادیں اہم ہیں یعنی مجاہدہ و مشاہدہ و مراقبہ ـــ یہاں پر جائز و ناجائز کی بحث نہیں ہے بلکہ ان کے ذریعہ قلبی کیفیات درست ہوتی ہیں یعنی قلب کے اتار و چڑھاؤ اور اس کے خطرات ان سے نکل جاتے ہیں اسی لیے صوفیا حضرات نے ان کو اپنایا ہے اور ان پر کافی محنتیں خود کی ہیں۔ اور اپنے مریدین کو کرائے ہیں یہی حدیث ان بنیادوں کی دلیل ہے ان حضرات کا کوئی عمل بھی حدیث و سنت کے خلاف نہیں ہوتا ان کی نظریں قرآن و حدیث کے حقائق و معارف کی طرف پہونچتی ہیں وہ حضرات اس کے فن کار ہیں بخلاف ظاہر علماء کے وہ ادھر کی باتیں نہ سمجھ سکتے ہیں نہ سوچ سکتے ہیں کیونکہ وہ اس کے فن کار نہیں ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی پہلی بنیاد عقائد ہے کہ انسان کا عقیدہ اس سے درست ہوتا ہے اور دوسری بنیاد علم فقہ ہے اس سے احکاماتِ شریعت معلوم ہوتے ہیں اور تیسری بنیاد فنِ تصوف ہے جس سے شریعت کے حقائق و معارف کھلتے ہیں انھیں بنیادوں کی وجہ سے انسان کا ظاہر اور باطن درست ہوتا ہے اور انسان

انسان بنتا ہے اگر ان میں سے ایک بھی نہ ہو تو وہ ناقص رہے گا۔

موت کے معنی انتقال کے ہیں

موت کے معنی فنا اور معدوم کے نہیں ہیں بلکہ اس کے معنی انتقال کے ہے کہا جاتا ہے کہ انسان مرگیا اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ فنا اور معدوم ہوگیا بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ منتقل ہوگیا انسان ایک عالم سے دوسرے عالم کی طرف منتقل ہوتا رہتا ہے مثال کے طور پر عہد اَلَسْتُ جس کو عالم ارواح کہا جاتا ہے انسان وہاں سے منتقل ہوا تو عالم رحم مادر میں آیا اور جب یہاں سے منتقل ہوا تو عالم دنیا میں آیا اور جب یہاں سے منتقل ہوا تو عالم برزخ میں پہونچ گیا اور جب وہاں سے منتقل ہوگا تو عالم آخرت میں پہونچ جائے گا یہاں تک کا انتقال سب کا یکساں ہے لیکن عالم آخرت سے جب منتقل ہوگا تو اس کا یہ آخری انتقال ہوگا اگر اس کے اعمال اچھے ہیں تو جنت کی طرف منتقل ہوگا اور بُرے ہیں تو دوزخ کی طرف منتقل ہو جائے گا۔ تین انتقالوں کو تو سبھی مانتے ہیں یعنی عالم ارواح سے لیکر عالم دنیا تک مگر اس کے بعد مرنے کے بعد اُٹھنے اور زندہ ہونے اور زندگی کے حساب کو اپنے رب کے سامنے دینے کا عقیدہ صرف مسلمان رکھتے ہیں کفار ومشرکین کو شک ہے کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ جب ہمارا گوشت سڑ جائے گا اور ہڈیاں مٹی میں مل کر گل جائیں گی تو دوبارہ زندہ کس طرح ہوسکتے ہیں جب یہ عقیدہ ہوگیا کہ جو کچھ ہے یہی دنیا ہے اس کے بعد معاملہ ختم ہے تو وہ دنیا ہی کے بنانے اور سنوارنے میں اپنے اوقات کو صرف کرے گا اور اگر انسان کا عقیدہ یہ بن گیا کہ نہیں مرنے کے بعد اٹھنا ہے اور حسابات زندگی اپنے رب کے سامنے دینا ہے تو یقیناً وہ وہاں کے لیے تیاری کرے گا اسی لیے آخرت والی زندگی پر ایمان لانا ضروری قرار دیا گیا بغیر اس کے آدمی ایمان والا نہیں بنتا۔

قرب قیامت کا مطلب

یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ قیامت کی یہ نشانیاں جو حدیث جبریل میں بتلائی گئی ہیں اس قسم

کی نشانیاں پہلے بھی آچکی ہیں نا اہلوں اور جاہلوں کے ہاتھ میں حکومت رہی انھوں نے بڑے بڑے محل بھی بناتے اور ایسے والدین کے نافرمان بچے بھی پیدا ہوتے رہتے ہیں پھر قیامت کیوں نہیں آتی اس کا جواب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت کی بہت سی نشانیاں بتلائی ہیں مثلاً دجال کا نکلنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نازل ہونا اور حکومت راشدہ کا قائم ہونا امام مہدی علیہ السلام کا پیدا ہونا یاجوج ماجوج کا نکلنا پھر دابۃ الارض کا نکلنا سُرخ آندھیوں کا چلنا سورج کا مغرب کی طرف نکلنا پھر قرآن اور ایمان کا اُٹھ جانا خانہ کعبہ کا گرنا۔ شرار الخلق کا پیدا ہونا یہ سب قرب قیامت کی علامتیں ہیں یکے بعد دیگرے ظاہر ہوتی رہیں گی ان سب کے ظاہر ہونے کے بعد ہی قیامت قائم ہوں گی گزرے ہوئے زمانے کے اعتبار سے آنے والے زمانے کو قریب بتلایا گیا مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ انھیں نشانیوں کے بعد فوراً قیامت قائم ہو جائے گی ہاں اس وقت قیامت قریب ہوگی اس کو اس طرح سمجھو کہ ایک شخص کو سو سال کی زندگی دی گئی ۹۹ سال گزر گئے صرف ایک سال باقی ہے تو کہا جاتا ہے کہ اب اس کے مرنے کا وقت قریب آگیا حالانکہ ابھی ایک سال باقی ہے لیکن ۹۹ سال کے مقابلے میں ایک سال کچھ بھی نہیں ہے اس لیے یہاں پر گزرے ہوئے زمانے کو سامنے رکھتے ہوئے آنے والے زمانے کو قریب کہدیا گیا اور یہاں پر دو باتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

ایک ہے معیشت منزلی اور ایک ہے معیشت تمدنی۔

معیشتِ منزلی یہ ہے کہ گھریلو زندگی میں فتنے پیدا ہو جائیں جس سے گھریلو زندگی تباہ ہو جائے مائیں مالکہ پیدا کرنے لگیں لڑکے عموماً شریر اور شوخ ہوتے ہیں مگر لڑکیاں عموماً ماں باپ کی فرمانبردار ہوتی ہیں اور حیا دار ہوتی ہیں لیکن جب ایسی لڑکیاں پیدا ہونے لگیں جو ماں باپ کی اطاعت کے بجائے ان کی نافرمانی کرنے لگیں اور ماں باپ کے قبضے سے باہر ہو جائیں تو سمجھو قیامت قریب آگئی ہے ظاہر ہے آج کل عموماً

لڑکیاں ماں باپ کے قبضے سے باہر ہوتی جارہی ہیں عموماً لڑکیاں آزاد مزاج کی ہوتی جارہی ہیں ہوٹلوں میں اور کمپنیوں میں ملازمت کرتی ہیں یہ سب کچھ تعلیم جدید جس کو تعلیم دنیا کہنا چاہئے اس کا اثر ہے دینی اسلامی تعلیم و تربیت سے کوری ہیں۔ ٹی وی اور ویڈیو اور سینما میں مبتلا ہیں عموماً اسلامی تہذیب و تمدن سے نفرت ہے عوام تو عوام علماء کی بچیوں میں یہ مرض کثرت سے پایا جارہا ہے ماں باپ بچوں کو دینی اسلامی تعلیم اور اس کی تہذیب اور تربیت سے ان کو محروم کر رہے ہیں اس کا نتیجہ یہی ہونے والا ہے جو آج کل ہو رہا ہے ان کی عام شکایتیں سامنے آرہی ہیں معیشت تمدنی اسی طرح جو یہ فرمایا گیا کہ نااہل کندہ تراش جاہل بداخلاق لوگ برسرِ اقتدار آجائیں گے۔ آج کل کے حکمراں کا یہی حال ہے خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم ہوں ایسے ہی لوگ برسرِ اقتدار ہیں۔ یہ دونوں نشانیاں سامنے آچکی ہیں اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان نشانیوں کے ظاہر ہوتے ہی قیامت آجائے گی اسی لیے جبریل کے اس سوال پر کہ قیامت کب قائم ہوگی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے صاف صاف فرمادیا کہ ہم کو اس کا علم نہیں ہے لیکن جب قرب قیامت کی نشانیوں کے متعلق حضرت جبریل علیہ السلام نے سوال فرمایا تو آپ نے یہ جواب دیا کہ جب ایسا زمانا آجائے تو سمجھو قیامت قریب ہے۔

قیامت کی تین قسمیں ہیں

دوسرا جواب یہ ہے کہ قیامت کی تین قسمیں ہیں ایک قیامت شخصی دوم قیامت قرنی سوم قیامت کلی۔ قیامت شخصی یہ ہے قَدْمَاتَ فَقَدْ قَامَ لَہُ الْقِيَامَةُ۔ جو شخص مرگیا اس کی قیامت قائم ہوگئی۔

قیامت قرنی یہ ہے کہ ہر ایک سو سال کا ایک قرن ہوتا ہے۔ جب ایک قرن ختم ہوتا ہے اور دوسرا قرن شروع ہوتا ہے تو ہر قرن کے بعد ایک عام تباہی اور بربادی ہوتی ہے عقائد اور اعمال میں خرابی پیدا ہوجاتی ہے اور فتنے عام ہوجاتے ہیں جس کی وجہ سے

خدا کی طرف سے بلائیں نازل ہوتی ہیں کتنے لوگ تباہ اور برباد ہو جاتے ہیں تو کہتے ہیں کہ قیامت قائم ہو گئی اور قیامت کلی یہ ہے کہ وہ ساری نشانیاں جن کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نشاندہی کی ہیں وہ ظاہر ہو جائیں گی تو قیامت کلی قائم ہو جاتے گی سور پھونک دیا جائے گا اور ساری مخلوقات فنا ہو جائے گی اور دوبارہ اللہ تعالیٰ میدان محشر قائم فرما کر سب کو زندہ کریں گے اس سے معلوم ہوا کہ ہمارے یہاں کل چار فنون ہیں پہلا فن عقائد دوم فن فقہ سوم فن تصوف چہارم فن تذکیر۔ اللہ تعالیٰ نے ہماری کامیابی کا نصاب مقرر فرمادیا اب جو کتابیں ان مقاصد کو نمایاں کریں گی انھیں کو نصاب میں رکھا جائے گا پہلی کتاب قرآن حکیم دوسری کتب احادیث اور تیسری کتب عقائد اور چوتھے کتب فقہ یہ ہمارے نصاب کی بنیادی کتابیں ہیں ان کے علاوہ علوم زائدہ ہیں مثلاً کتب فنون و منطق و فلسفہ اور سائنس وغیرہ یہ مقاصد میں داخل نہیں ہیں۔ بلکہ مقاصد کے لیے معین و مددگار ہیں آج کل ہم نے سائنس کو بھی نصاب میں داخل کر لیا ہے تاکہ طالب علم بے خبر نہ رہے۔ دینی معلومات کے ساتھ دنیاوی معلومات بھی حاصل ہوتی رہیں۔

نوٹ:

حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی اس مجلس کو بار بار مطالعہ کریں۔ انشاء اللہ اس کے مطالعہ سے علماء دیوبند کا مسلک اور ان کے دینی اصلاحی خدمات کا اندازہ ہوگا اور بہت سی غلط فہمیوں کا علم ہوگا۔ وہ یادگار اسلاف دیوبند تھے انھوں نے اسلاف دیوبند کی صحبت میں رہ کر ان کو اور ان کے مسلک کو خوب سمجھا اور سمجھایا ہے۔

حبیب اللہ قاسمی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مجلس ۳۷

دعوت الی اللہ کی اہمیت اور اس کی ضرورت

امابعد: الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید المرسلین محمد وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین امابعد:

دعوت الی اللہ کے سلسلے میں حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ سے یہ دوسرا سوال کیا گیا تھا۔ پہلا سوال اور اس کا جواب مجلس ۹ میں قارئین نے ملاحظہ فرمالیا اب دوسرا سوال اور اس کا جواب ملاحظہ فرمائیں۔

حضرتؒ سے سوال کیا گیا کہ جس طرح تبلیغ احکام کی دعوت ضروری ہے کیا تبلیغ اسلام کی دعوت بھی ضروری ہے اس کی حیثیت اسلام میں کیا ہے؟ احکامات اسلام کی دعوت مسلمانوں کو دی جارہی ہے اور اس پر محنت بھی کی جارہی ہے اور مسلمانوں میں اس کے لیے مختلف جماعتیں بھی بنی ہوئی ہیں مگر تبلیغ اسلام کے سلسلے میں کوئی ایسی جماعت نہیں ہے جو اس خدمت کا بھی انجام دے۔ سوال یہ ہے کہ جس طرح احکام اسلام کی دعوت مسلمانوں پر فرض ہے کیا اسلام کی دعوت بھی فرض ہے اور اس کو نہ کرنے کی شکل میں کیا مسلمانوں سے مواخذہ ہو سکتا ہے؟ کیا کفار اور مشرکین قیامت کے دن مسلمانوں پر یہ دعویٰ دائر کر سکتے ہیں کہ مسلمانوں نے ہم کو اسلام کی دعوت نہیں دی ورنہ ہم بھی مسلمان ہو جاتے کیا اس پر مسلمانوں کی پکڑ ہو سکتی ہے۔ حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جہاں تک تبلیغ احکام کا معاملہ ہے اس پر جتنی تبلیغ آج کل ہو رہی ہے شاید اس سے پہلے اتنی نہ ہوئی ہو اشتہارات اور رسائل اور اخبار کے ذریعہ وعظ و تقریر کے ذریعہ مدارس عربیہ کے ذریعہ تبلیغ کے ذریعہ اسلام کے احکامات کو مسلمانوں تک پہونچانے کے لیے ہر ممکن کوشش کی جارہی ہے تاکہ

مسلمان اسلام کو جانے اور اس کو سمجھے اور اپنے مذہب اسلام پر قائم رہے ان کے بعض پروگراموں میں غیر مسلم بھی شامل ہوتے ہیں اور ان پر کچھ اثر بھی پڑتا ہے یہ خدمات فرائض میں سے ہیں مسلمان ان خدمات کو انجام دے رہا ہے بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ ایک فریضہ کو بہت حد تک ادا کر رہے ہیں۔ اس کی ضرورت اور اہمیت سے کوئی انکار نہیں بہتر ہے ان کو کرنا چاہئے اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ تبلیغ اسلام کا کام تقریباً بند ہے واقعی اس کا حق ادا نہیں ہو رہا ہے نہ تو اس کے لیے کوئی جماعت بنائی گئی اور نہ ہی اس کے لیے کوئی پروگرام چلایا جا رہا ہے اور یہ کام اتنا اہم اور ضروری ہے کہ سارے انبیاء علیہم السلام اسی غرض سے دنیا میں تشریف لائے تھے کہ وہ بندے جو اللہ تعالیٰ سے کٹ گئے ہیں اور شیطان جو دشمن انسان ہے اس کی دعوت کا اثر قبول کر کے دوزخ کی طرف جا رہے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے جڑ جائیں اور جنت کا راستہ اختیار کر کے جنتی بنیں۔ نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے تشریف لے جانے کے بعد یہ کام امت کے حوالہ کر دیا گیا آپ کی امت کے لوگ صحابہؓ اور تابعین پھر تبع تابعین اور اولیاء کرام نے اس خدمت کو انجام دیا اور اس کی ذمہ داری کا احساس بھی کیا۔ تبلیغ احکام کے ساتھ انھوں نے تبلیغ اسلام کی بھی خوب خدمت کی تبلیغ احکام کی طرح تبلیغ اسلام بھی فرائض میں سے ہے مگر مسلمانوں نے اس فریضہ کو چھوڑ دیا ہے۔

دعوت الی اللہ کا انداز اور طریقہ صوفیانہ ہو

دعوتِ الی اللہ کی خدمت یہ بھی فرائض میں سے ہے اس کو ضرور کرنا چاہئے مگر اس کے کرنے کا وہی طریقہ اختیار کرنا پڑے گا جس طریقے سے صوفیا حضرات نے اس فریضہ کو انجام دیا ہے اس لیے اس کام کو اگر صوفیانہ انداز سے کیا جائے تو آج بھی ایمانی انقلاب آسکتا ہے۔ صوفیاء حضرات کی شکل بنا کر اگر غیر اقوام کے سامنے اسلام کی دعوت دی جائے تو یقیناً ان کے قلوب پر دعوتِ اسلام کا اثر پڑے گا اس کے لیے پہلی شرط یہ ہے

کہ وہ اسلام کا نمونہ ہو اس کو دیکھ کر اس کے مذہب اسلام کو آسانی سے لوگ سمجھ جائیں۔ تیسری شرط یہ ہے کہ داعی کے اندر حسن اخلاق حسن سلوک اور ضرورتمندوں کی حاجت روائی کی صفات اولیاء اللہ جیسی ہوں اگر ایسا داعی کہیں بیٹھ جائے تو کم سے کم غیر مسلموں کا ایک حلقہ مذہب اسلام کی ایمانی دولت سے فیض یاب ہو سکتا ہے وہ مبلغ ایسا ہو کہ نہ کسی سے سوال کرے اور نہ ہی اس کے سامنے دنیاوی اغراض ہوں بے لوث ہو کر یہ کام کرے سب سے پہلے لوگوں کے دلوں میں اسلام کا اُنس پیدا کرے جب اسلام کا اُنس ان کے دلوں میں پیدا ہو گی تو وہ اسلام کے قریب ہو جائیں گے آج کل غیر اقوام کے دلوں میں ایک قسم کا اسلام سے بُغض پیدا ہو چکا ہے وہ اُنس ہی کے ذریعہ دور ہو سکتا ہے آج غیر اقوام کے دلوں میں جو اسلام سے بُغض ہوتا جا رہا ہے اس کے سبب ہمارے مسلمان بھائی ہیں اُن کے اعمال ایسے ہیں کہ ان کو دیکھ کر غیر مسلم اسلام کے قریب ہونے کے بجائے اس سے دُور ہوتے جا رہے ہیں اس لیے آج ان کے دلوں میں اُنس پیدا کرنے کی ضرورت ہے جب ان کو اسلام اور اسلام کے داعی سے اُنس ہو جائے گا تو وہ لوگ داعی کی بات بھی سُنیں گے اور اس کو قبول بھی کریں گے صوفیاء حضرات میں تبلیغ اسلام کا احسن طریقہ یہی تھا مگر آج کل نہ تو وہ طریقہ رہا اور نہ ہی ایسے داعی ہی رہے۔

حضراتِ صحابہؓ کی تبلیغِ اسلام

حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اپنا وطن چھوڑ کر پوری دنیا میں پھیل گئے اور وہ حضرات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نمونہ بن کر گئے اور جہاں بھی گئے ان کو دیکھ کر دنیا حیرت میں پڑ گئی ان کے حالات اور اعمال کو دیکھ کر ایسا اندازہ ہوتا تھا کہ یہ لوگ انسان نہیں ہیں بلکہ فرشتے ہیں ان حضرات کو دیکھ کر اسلام کی حقانیت کھل کر لوگوں کے سامنے آ گئی اور گاؤں کے گاؤں شہر کے شہر لوگ اسلام کے حلقہ میں آتے گئے ظاہر ہے صحابہ رضی اللہ عنہم اسلام کا داعی اور مبلغ

بن کر اقوام عالم کے سامنے گئے وہ تو صرف عربی زبان سے واقف تھے پھر ایسے علاقوں میں انھوں نے اسلام کی دعوت کس طرح دی جہاں کے لوگ ان کی زبان سے واقف نہیں تھے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات نے تقریر و وعظ کے ذریعہ یہ کام نہیں کیا ہے بلکہ اسلام کا نمونہ بن کر کیا ہے ان کا حُسنِ اخلاق سلوک اور معاملات و عبادات اور حالات کو دیکھ کر اُن سے لوگ متاثر ہوتے گئے اور اسلام کے قریب آتے گئے اور پھر مسلمان ہوتے گئے اس طرح سے ان حضرات نے دعوتِ اسلام کا کام کیا ہے وہ سمجھتے تھے کہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قیامت تک کے لیے آخری نبی بنا کر بھیجے گئے ہیں اور پوری دنیا کی ہدایت کے لیے بھیجے گئے ہیں مگر پوری دنیا میں وہ تشریف نہیں لیجا سکے اور ہم کو بتلا کر چلے گئے کہ جہاں تک میرا کام تھا میں نے کر دیا اب میں تم کو اپنی جگہ پر چھوڑ کر جا رہا ہوں بقیہ کام تم کو کرنا ہے اس لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اندر تبلیغ اسلام کا جذبہ تھا اور اس کی ذمہ داری کا احساس بھی تھا صحابہؓ کے بعد اس خدمت کا انجام اولیاء کرام نے دی وہ حضرات بھی اسلام کے نمونے تھے باوجود زبان نہ جاننے کے پھر بھی وہ حضرات اپنے مشن میں کامیاب رہے۔

حضرت خواجہ غریب نوازؒ اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کی تبلیغ و دعوت

مثال کے طور پر حضرت خواجہ غریب نواز اجمیری رحمۃ اللہ علیہ یہ عاشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم تھے اور عاشق الٰہی بھی تھے عشق رسول صلے اللہ علیہ وسلم میں مست رہتے تھے انھوں نے یہی سوچا کہ ساری زندگی اپنے معشوق کے دیار مدینہ میں گزر جائے تو بہتر ہے یہاں ہی پر موت ہو یہاں ہی پر حشر ہو وہ مدینہ پاک میں تشریف لے گئے لیکن ان سے تبلیغ اسلام کی ایک انقلابی خدمت لینی تھی اس لیے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کو ہندوستان جانے کا حکم فرمایا اور ان کے شیخ عثمان ہارونی رحمۃ اللہ علیہ کو بھی یہی حکم فرمایا کہ ان کو ہندوستان میں تبلیغ اسلام کے لیے بھیجو، اصل عاشق جو ہوتا ہے وہ اپنے معشوق کی مرضی تلاش کرتا ہے

اسی طرح سارے ہی صحابہؓ عاشقینِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم تھے لیکن حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی خواہش یہ تھی کہ تم لوگ مدینے کو چھوڑ کر دنیا میں پھیل جاؤ اور جس نظام کو میں لیکر آیا ہوں اسکو پھیلاؤ اس لیے صحابہؓ مدینۃ الرسول کو چھوڑ کر دعوتِ اسلام کے لیے نکل پڑے اسی طرح حضرت خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ بھی مدینۃ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر نکل پڑے اور لاہور ہوتے ہوئے دہلی تشریف لائے تقریباً بارہ سال تک مہرولی میں قیام پذیر رہے ایک چھوٹی سی مسجد جس کو مسجدِ اولیاء کہا جاتا ہے اس کو ریاضت اور مجاہدہ کے لیے انتخاب فرمایا اور قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ اور بابا فرید گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ اور سلطان التمش رحمۃ اللہ علیہ جیسے خدا جانے کتنے داعیٔ اسلام پیدا فرماکر خود بحکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اجمیر شریف تشریف لے گئے ایک ایسا علاقہ تبلیغ اسلام کے لیے آپکو دیا گیا کہ نہ تو آپ ان کی زبان سمجھیں اور نہ ہی وہ لوگ آپ کی زبان سمجھیں۔ پھر آپ کے مقابل میں پرتھوی راج جیسا متعصب اور دشمن اسلام کا سامنا، اُدھر ہندوستان کے سب سے بڑے جادوگر جے پال جوگی کا مقابلہ۔ جے پال جوگی بڑا خطرناک جادوگر تھا پہاڑوں پر نگاہ ڈالتا تو بڑی بڑی چٹان اڑنے لگتی تھی۔ اگر نگاہ کو تیز کر دیتا تو پہاڑ میں بھی آگ لگ جاتی تھی صرف ایک فقیر اور ان کا ایک خادم ان لوگوں کا کیا مقابلہ کر سکتے تھے لیکن جب خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کا داعی کوئی بن کر چلتا ہے تو قدم قدم پر خدا کی طرف سے نصرت اور مدد اترتی ہے۔ اور ہر ہر قدم پر کامیابی اس کے قدموں کو چومتی ہے وہ پہاڑ جیسی چٹان جو ان کے سامنے حائل ہوئی وہ ٹلتی گئی۔

حضرت خواجہ غریب نوازؒ کی پہلی کرامت

داعیٔ اسلام حضرت خواجہ معین الدین چشتی سنجری رحمۃ اللہ علیہ اجمیر پہونچکر انا ساگر پر تشریف لے گئے اور ایک کنارے پر چٹائی بچھاکر ذکر اللہ میں مصروف ہو گئے وہاں کے سادھوؤں

نے بہت ہٹانے کی کوشش کی، مگر وہ نہیں ہٹے یہاں تک کہ یہ بات پرتھوی راج تک پہونچی اس نے ان کو زبردستی اپنی طاقت سے ہٹانے کی کوشش کی مگر وہ جمے رہے خادم کو حکم دیا کہ جاؤ ساگر سے ایک لوٹا پانی بھر لاؤ حضرت خواجہؒ کی یہ پہلی کرامت تھی کہ سارا پانی سمٹ کر لوٹے کے اندر آگیا اجمیر کے انسانوں اور وہاں کے جانوروں کو پریشانی ہوئی بڑی سفارش کے بعد حضرتؒ نے پانی واپس کیا پورے علاقے میں شہرت ہوگئی کہ اجمیر میں ایک فقیر آیا ہوا ہے وہ اناساگر کے پاس چٹائی بچھا کر بیٹھا ہوا ہے اس فقیر نے ساگر کا سارا پانی ایک ہی لوٹے میں بھر لیا اور بڑی سفارش کے بعد واپس کیا۔ اب لوگ ان کے دیکھنے کے لیے آرہے ہیں۔ ان کو دیکھ کر متاثر ہو رہے ہیں ان کی عظمت لوگوں کے قلوب میں بیٹھتی جارہی ہے چاروں طرف انکی شہرت بڑھتی جارہی ہے ادھر جے پال جوگی اور پرتھوی راج سخت برہم ہیں ان کے ہٹانے کے لیے مختلف کوشش کر رہے ہیں۔

حضرت خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کی دوسری کرامت

پرتھوی راج نے جے پال جوگی کو حکم دیا کہ جس طرح ہوسکے اس فقیر کا مقابلہ کرو اور یہاں سے بہت دُور جلد ہٹادو۔ جے پال جوگی ان کے پیچھے پڑگیا اور مختلف طریقوں سے ہٹانے کی کوشش کی مگر اس کی کوئی تدبیر کامیاب نہیں ہوئی اس نے حضرت خواجہؒ سے ملاقات کی اور انکو غور سے دیکھا، وہ محسوس کر رہا تھا کہ یہ فقیر کوئی جادوگر نہیں ہے اگر یہ جادوگر ہوتا تو میرے سامنے جم نہیں سکتا تھا۔ یہ تو کوئی پہونچا ہوا ولی ہے اس لیے اب ان کے سامنے ہم کو اپنی گردن جھکا دینا چاہئے چنانچہ وہ مسلمان ہوگیا اور حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی غلامی میں اپنے آپ کو پیش کر دیا یہ خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی دوسری کرامت تھی جے پال جوگی کے ماننے والا ایک بہت بڑا حلقہ تھا جب ان لوگوں نے دیکھا کہ ہمارا سب سے بڑا جوگی اور سادھو نے جس دھرم کو خواجہ صاحب لیکر آئے ہیں اس کو قبول کر لیا تو ہم کو بھی ان کے سامنے جھک جانا

چاہئے وہ بھی مسلمان ہو گئے مگر پرتھوی راج کی خوف سے کھُل کر سامنے نہیں آرہے تھے۔

خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کی تیسری کرامت

پرتھوی راج کے مقدر میں ہدایت نہیں تھی وہ اپنی طاقت اور زور سے خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو ہٹانے اور بھگانے کی کوشش میں لگا ہوا تھا مگر وہ ایک جنگ میں مارا گیا اب لوگوں کا راستہ صاف ہو گیا لوگ اِدھر اُدھر سے آتے گئے اور حضرت خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے دست پر اسلام قبول کرتے گئے ان کرامات کے علاوہ بہت سی کرامتیں ان سے صادر ہوتی رہتی تھیں پھر بھی کرامت تو ایک وقتی چیز ہوتی ہے اس سے یقیناً لوگوں کے قلوب میں صاحب کرامت کی عظمت پیدا ہوتی ہے لیکن ایمانی انقلاب جو غیر اقوام کے قلوب میں آیا ہے وہ ان کا حُسنِ سلوک، حُسنِ اخلاق اور حاجت روائی اور اسلام کا نمونہ اور پیکر بن کر لوگوں کے سامنے پیش ہوتا تھا لوگ ان کو دیکھ کر خود ہی اسلام قبول کرتے گئے اور یہ کہتے گئے کہ اگر کوئی دھرم اور مذہب بہتر اور قابلِ قبول ہے تو وہ مذہب ہے جس مذہب پر خواجہ غریب نواز ہیں۔ حضرت خواجہ غریب نوازؒ کی مجلس کا کیا اندازہ ہوتا تھا وہ تو خدا جانے لیکن ان کی زبان فارسی اور عربی تھی وہ فارسی میں جو کچھ بیان فرماتے تھے راجستھانی زبان جاننے والے اس کا ترجمہ کر کے لوگوں کو سُنا دیتے تھے۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی دعوت اور اسکے اثرات

مسٹر کارنل یورپین نے لکھا ہے کہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ کی دعوتِ اسلام سے ننانوے لاکھ غیر مسلم حلقۂ اسلام میں داخل ہوئے ہیں چونکہ عیسائی مبلغین ہمیشہ اس پر غور کرتے تھے کہ ہندوستان میں تو صرف ہندو قوم بستی تھی اور وہ پکے مشرک اور بت پرست تھی پھر اتنے مسلمان کہاں سے آئے انھوں نے ہندوستان کے حالات کا جائزہ لیکر یہ فیصلہ کیا کہ ہندوستان کا مسلمان کہیں باہر سے نہیں آیا ہے بلکہ یہ ہندوستان ہی کے باشندے ہیں

اسلامی مبلغین کی تبلیغ پر یہ لوگ مسلمان ہوئے ہیں ان کو یہ امید ہو گئی کہ اگر یہاں کی عوام پر محنت کی جائے تو کثرت سے لوگ عیسائی مذہب کو قبول کر سکتے ہیں اس لیے انھوں نے یہاں کی عوام پر محنت کی اور لاکھوں مسلمانوں کو مرتد کر دیا مگر مرتد ہونے والے وہی مسلمان تھے جو اسلام سے ناواقف تھے جن کو جہلا کہنا چاہیئے صرف نام ہی نام کے مسلمان تھے۔

عیسائیوں نے اپنے مذہب عیسائی کی جو تبلیغ کی ہے وہ سرکاری طور پر جماعت بنا کر کی ہے انگریز سرکار باقاعدہ ان مبلغین کو تنخواہیں دیتی تھی اور ان کے لیے مکمل انتظام کرنا یہ سرکار کے ذمہ تھا مگر ان کی تبلیغ کا دارومدار دولت اور عورت پر تھا مسلمان ایک تو جاہل تھے دوسرے غریب تھے اس لیے ان کو دولت اور عورت دکھا کر اسلام سے پھیر دیتے تھے مگر ہمارے اولیاء کرام نے عورت اور دولت نہیں دکھائی تھی بلکہ اسلام کی صورت اور اس کا نمونہ دکھایا تھا اس نمونے کو دیکھ کر لوگوں نے اسلام قبول کیا ہے سارے مذاہب مردہ ہو چکے ہیں اسلام مذہب زندہ مذہب ہے اس لیے اس کے لیے دولت اور عورت کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس کے حقائق کھل کر لوگوں کے سامنے آجائیں اور وہ اس کے نمونے ہی کے دیکھنے سے کھلتے ہیں بغیر نمونہ کے محض وعظ تقریر سے مسلمانوں کا تو فائدہ ہو جاتا ہے مگر غیر اقوام کا فائدہ نہیں ہوتا وقتی طور پر سننے سے کچھ اثر پڑ جائے تو وہ الگ بات ہے ایک اللہ کے ولی اور داعی کے یہ کارنامے ہیں۔ ایک ہی شخص کی دعوت سے ننانوے لاکھ انسان جو دوزخ میں جانے والے تھے وہ جنتی ہو گئے مگر آج بیس کروڑ مسلمان ایک غیر مسلم کو بھی دوزخ سے بچا کر جنت کی طرف نہیں لے جا رہے ہیں کیونکہ آج کل اس پیغام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا جذبہ لوگوں کے دلوں سے نکل چکا ہے اب مسلمانوں کے اندر بھی دعوت کے بجائے دولت سمائی ہے جس تنظیم کو لے کر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تھے صحابہ کرام اور اولیاء امت محمدیہ علیہ الصلوٰۃ والسلام بڑی ذمہ داری سے چلائے اس کو مسلمانوں نے تقریباً چھوڑ دیا ہے آج تنظیم خواجہ غریب نواز کے بجائے ان کے مزار مبارک سے دولت کمائی جا رہی ہے جو دربار

ہدایت اور ایمان کا مرکز تھا آج وہ شرک و بدعت کا مرکز بنا ہوا ہے کل قیامت کے دن یہ لوگ خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کو کیا جواب دیں گے اگر حضرتؒ کے مزار کو تبلیغ اسلام کا مرکز بناتے اور غیر اقوام کو خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ کا نمونہ بن کر لوگوں کو دکھاتے اور حکمت عملی سے ایمان کی دعوت دیتے تو ان کی غلامی کا شرف ان کو بھی مل جاتا ہے یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم غلامانِ خواجہ ہیں مگر ان کے اعمال دشمنانِ خواجہؒ جیسے ہیں خواجہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا غلام کہلانے کا وہی شخص حقدار ہے جو ان کی تنظیم کو چلائے اور ان کا نمونہ بن کر اقوام عالم کے سامنے پیش ہو مگر آج کل یہ نہیں ہو رہا ہے آج کل ہر شخص اپنی تنظیم کو چلانے کے فکر میں لگا ہوا ہے۔

اسلام کی دعوت نہ دینے پر پکڑ

حالات اور واقعات سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ قیامت کے دن کفار و مشرکین یہ سوال اٹھائیں گے کہ ہم کو مسلمانوں نے اسلام کی دعوت نہیں دی اس لیے ہم اسلام سے محروم رہے اگر یہ لوگ ہم کو سمجھاتے اور اسلام کی دعوت دیتے تو ہم بھی اسلام کو قبول کر لیتے مسلمانوں کو اس پر غور و فکر کرنا چاہیئے کہ اگر قیامت کے دن ہمارے گاؤں یا شہر کے غیر مسلم خدا کے سامنے ہمارے اوپر یہ مقدمہ قائم کر دیں تو اس مقدمہ سے چھوٹنے کی کون سی حکمت اور تدبیر ہم کریں گے کہ جس سے چھوٹ جائیں ان کے اس سوال کا ہم کیا جواب دیں گے اور کیا عذر پیش کریں گے اور ہمارا یہ عذر دربار خداوندی میں قبول ہوگا یا نہیں وقت آنے سے پہلے ہی تیاری کر لینی چاہیئے۔ ورنہ اس دن بڑی ندامت ہوگی۔ کفار و مشرکین خدا کے سامنے جھگڑیں گے اور اپنا حق طلب کریں گے ان کے اس جھگڑنے سے ان کا کچھ فائدہ ہوگا یا نہیں یہ الگ بات ہے لیکن مسلمانوں کی گردنیں نپ سکتی ہیں مثال کے طور پر حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو ساڑھے نو سو برس تک دعوت دی اور اللہ تعالیٰ کی طرف بلایا مگر ان لوگوں نے ان کی دعوت کو ٹھکرا دیا۔ نوح علیہ السلام نے حقیقۃً ان کو دعوت دی تھی مگر ان کی قوم ان سے قیامت کے دن

جھگڑے گی اور صاف صاف انکار کرے گی۔ اب سوچنا یہ ہے کہ جب نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو دعوت دی اور انھوں نے انکار بھی کیا مگر ان کی قوم اس کے باوجود جھگڑ سکتی ہے تو دیگر کفار و مشرکین کا کیا حال ہوگا جن کو واقعی مسلمانوں نے اسلام کی دعوت نہیں دی۔ قومِ نوحؑ کا جھگڑنا تو غلط ہوگا کیونکہ انھوں نے قوم کو اللہ تعالیٰ کی طرف بلایا تھا مگر یہاں پر مسلمانوں نے اپنے گاؤں یا شہر کے غیر اقوام کو دعوت ہی نہیں دی ان کا مقدمہ تو درست ہوگا اور مطالبہ بھی حق ہوگا وہ وقت بہت کٹھن ہوگا اللہ تعالیٰ ان کی پکڑ سے ہماری حفاظت فرمائے اور تبلیغ اسلام کا داعیہ اور جذبہ ہمارے دلوں میں پیدا فرمائے۔

قومِ نوح علیہ السلام کا مُقدمہ

حضرت نوح علیہ السلام کی قوم قیامت کے دن حق تعالیٰ شانہ کے سامنے پیش ہوگی حق تعالیٰ شانہٗ فرمائیں گے کہ میں نے اپنے نبی نوحؑ کو تمہاری ہدایت کے لیے بھیجا انھوں نے ساڑے نوسو سال تم کو دعوت دی۔ تم لوگوں نے ان کی دعوت کو قبول کرنے کے بجائے ٹھکرادیا ایسا تم لوگوں نے کیوں کیا وہ لوگ صاف صاف انکار کردیں گے اور کہیں گے کہ ہمارے پاس تو کوئی نبی نہیں آیا نہ نوح آئے اور نہ اور کوئی نبی آیا حق تعالیٰ سب کچھ جانتے ہیں کہ یہ قوم جھوٹ بول رہی ہے مگر قیامت کے دن اپنے علم پر فیصلہ نہیں فرمائیں گے بلکہ مقدمہ قائم کرکے اتمام حجت کریں گے اور مکمل شہادت کے بعد پھر فیصلہ فرمائیں گے۔ اس لیے حضرت نوح علیہ السلام کو طلب کریں گے حضرت نوح علیہ السلام تشریف لائیں گے اللہ ان سے سوال کریں گے کہ نوح ہم نے تم کو اس قوم کی ہدایت کے لیے اپنا داعی اور نبی بنا کر ان کے پاس بھیجا تھا تم نے ہمارے پیغام کی دعوت ان کو کیوں نہیں دی حضرت نوح علیہ السلام یہ سن کر حیران ہوجائیں گے اور فرمائیں گے اے اللہ تعالیٰ ہم نے تو ان کو ساڑھے نوسو سال تک دعوت دی قَالَ اِنِّیۡ دَعَوۡتُ قَوۡمِیۡ لَیۡلًا وَّنَہَارًا ۙ میں نے تو

ان کو رات بھی دعوت دی اور دن کو بھی دعوت دی دن رات کو اس لیے فرمایا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ عذر کریں کہ آپ دن میں تو آتے تھے، ہم لوگ کاروبار میں مصروف رہتے تھے ان کو آرام اور سکون کے وقت رات کو آنا چاہیئے تھا مگر یہ اس وقت آتے ہی نہیں تھے کہ ہم سکون سے ان کی باتوں کو سنتے حضرت نوح علیہ السلام نے اس شبہ کو دور فرما دیا کہ ہم رات کو بھی اور دن کو بھی ان کے پاس جاتے تھے اور آپ کی طرف بلاتے تھے فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَاءِىْٓ اِلَّا فِرَارًا • مگر ان کا حال یہ تھا کہ جب ہم ان کے پاس دن میں جاتے تو بھاگتے رہتے تھے اور جب رات کو جاتے تھے تو اس وقت بھی بھاگتے رہتے تھے انھوں نے میری کوئی بات سن کر نہیں دی وَاِنِّىْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوْٓا اَصَابِعَهُمْ فِىْٓ اٰذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا ثِيَابَهُمْ وَاَصَرُّوْا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا اور جب جب میں ان کے پاس آپ کی طرف بلانے اور دعوت دینے گیا تاکہ آپ ان کی مغفرت فرمادیں تو یہ لوگ اپنی انگلیوں کو اپنے کانوں میں ڈالا کرتے تھے اور اپنی ضد پر ہٹ دھرمی سے مُصر رہے اور بڑے تکبر اور غرور سے پیش آتے تھے ثُمَّ اِنِّىْٓ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَاَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا پھر جب یہ نہیں مانے تو ہم نے علی الاعلان ان کو دعوت دی اور چھپ چھپ کر بھی دعوت دی جس طرح حضرت نوح علیہ السلام نے ان کو دعوت دی تھی اس کی ساری کیفیت بیان فرمائیں گے اور مقصد یہ ہوگا کہ آپ کی طرف بلانے کی جتنی شکلیں ہو سکتی تھیں ہم نے ان کو اختیار کیا تھا اور دن رات ان کو دعوت ہی دینے میں لگا رہا ہم نے دعوت کی پوری ذمہ داری جو آپ نے میرے اوپر ڈالی تھی اس کو بڑی دیانت داری سے پوری کی تھی میں انکے مکان پر بھی جاتا تھا اور ان کی دکانوں پر بھی جاتا تھا اور ان کی کھیتوں میں بھی جاتا تھا اور آہستہ سے بھی اور زور سے بھی آپ کی طرف بلاتا تھا مگر یہ لوگ ہماری دعوت کو قبول کرنے کے بجائے اُلٹے ہم کو گالیاں بھی دیتے تھے اور بُرا بھلا بھی کہتے تھے اور ڈراتے بھی تھے اور دھتکارتے بھی تھے اور صاف صاف کہتے تھے کہ نوح تم ہزاروں بار ہم کو دعوت دو ہم آپ کو یہی جواب

دیں گے کہ ہم تو وہی کریں گے جو ہمارے باپ دادا کرتے تھے ہم تیری ایک بات سننے اور ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں پھر حضرت نوح علیہ السلام فرمائیں گے اے فلاں نے کیا میں تیرے گھر پر نہیں کیا گیا تھا اور اے فلاں نے کیا میں تیری دکان پر نہیں گیا تھا اور اے فلاں نے کیا میں تیرے کھیت پر نہیں گیا تھا تم لوگ ہماری دعوت کا کیا جواب دیتے تھے وہ بھی تو کہو حضرت نوح علیہ السَّلام اُن کے نام لیکر یاد دلائیں گے مگر ان کی قوم صاف صاف انکار کرے گی ہم تو آپ کو پہچانتے ہی نہیں کہ آپ کون ہیں نہ تو آپ ہمارے پاس ہی آئے اور نہ ہی دعوت دی ہم نے تو آج تک تم کو دیکھا ہی نہیں کہ تم کون ہو جب ساری قوم انکار کر دے گی تو حق تعالیٰ شانہٗ فرمائیں گے کہ اے نوح یہ قوم انکار کر رہی ہے اس لیے آپ اپنی دعوت کی شہادت پیش کریں اور اس کے لیے گواہ لائیں آپ کے پاس اس کا کیا ثبوت ہے کہ آپ نے اپنی قوم کو دعوت دیکر میری طرف بلایا ہے۔ اللہ تعالیٰ سب کچھ جانتے ہیں کہ ہمارے نبی نوح سچے ہیں اور یہ قوم جھوٹی ہے یہ نوح کا مقابلہ کر رہی ہے اور جھوٹ بول رہی ہے مگر چونکہ نوح علیہ السَّلام کو اپنی دعوت پر شہادت نہیں ملی اس لیے اپنے علم پر فیصلہ نہیں فرمائینگے۔

اُمّتِ محمّدیہ علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کی شہادت

یہ منظر دیکھ کر حضرت نوح علیہ السَّلام حیرت میں پڑ جائیں گے اور سوچیں گے کہ اب میں اپنی دعوت پر کس کو شاہد بناؤں خدا خود شاہد ہیں اور ان کو علم بھی ہے مگر آج وہ حاکم ہیں حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت پر اسّی حضرات ایمان قبول کئے تھے۔ اب سوال یہ ہے کہ ہمارے اسلام میں شہادت کے لیے تین آدمی کا ہونا کافی ہے وہاں پر تو اسّی شاہد موجود تھے مگر انہوں نے اپنے مومن امت کو شہادت کے لیے پیش نہیں کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ منکرین کی تعداد لاکھوں کی ہے اور شہادت دینے والے صرف اسّی ہیں وہ یہی کہتے کہ ایک طرف تو ایک لاکھ شاہد ہیں اور ایک طرف صرف اسّی شاہد

ہیں لہذا ایک لاکھ کے مقابلے میں صرف اسی شاہدوں کی شہادت کس طرح مقبول ہو سکتی ہے جب کہ وہ لوگ خدا کے سامنے صاف صاف انکار کر رہے ہیں اس لیے آپ کے شاہدوں کی تعداد کروڑوں ہونی چاہیے۔ اس لیے حضرت نوح علیہ السلام فرمائیں گے کہ ہماری دعوت کے شاہد اُمتِ محمدیہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے علماء حضرات ہیں اس پر امتِ محمدیہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی امت کے علماء بلائے جائیں گے اور لاکھوں کی تعداد میں وہ حضرات حاضر ہو جائیں گے اللہ تعالیٰ ان کے سامنے قوم نوحؑ کا مقدمہ پیش کریں گے اور فرمائیں گے کہ نوح کا کہنا یہ ہے کہ ہم نے اپنی قوم کو ساڑھے نو سو سال تک دعوت دی مگر ان کی قوم انکار کرتی ہے اس سلسلے میں تم لوگ کیا کہتے ہو یہ لوگ کہیں گے کہ اے اللہ نوح علیہ السلام سچے ہیں انھوں نے اپنی قوم کو ساڑھے نو سو سال تک دعوت دی اور آپ کی طرف بلایا مگر ان کی قوم نے ان کی دعوت کا انکار کر دیا یہ لوگ جھوٹے ہیں۔ اُمتِ محمدیہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سامنے اولین و آخرین کے سارے حالات تھے قرآن و حدیث میں تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔ اس لیے علماءِ اُمتِ محمدیہ علیہ الصلوٰۃ والسلام قومِ نوح کی کِذب اور نوح علیہ السلام کی صداقت کی گواہی دیں گے ان کی شہادت کے بعد حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ اے قومِ نوح اب تو تمہارے خلاف لاکھوں علماء نے شہادت پیش کر دی اب تم کیا کہتے ہو وہ قوم بھی عجیب ہوگی وہ کہے گی کہ شہادت عینی ہونی چاہیے یہ لوگ تو ہمارے بعد کئی ہزار سال کے بعد دُنیا میں آئے ہیں ان کو ہماری کیا خبر نہ یہ ہم کو جانتے اور نہ ہم ان کو جانتے اس وقت یہ لوگ موجود ہی نہیں تھے پھر یہ لوگ ہمارے متعلق کس طرح گواہی دے سکتے ہیں اور ان کی گواہی ہمارے بارے میں کس طرح قبول کی جا سکتی ہے پھر حق تعالیٰ علماء حضرات سے سوال کریں گے کہ تمہارے پاس اس کا کیا ثبوت ہے کہ نوحؑ نے ساڑھے نو سو سال تبلیغ حق کا کام کیا ہے تو علماء حضرات فرمائیں گے کہ اگر ہماری شہادت ان کے بارے میں معتبر نہیں ہے تو پھر ہمارے نبی محمد صلے اللہ علیہ وسلم سے معلوم کر لیا جائے اس کے بعد ہمارے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم نوحؑ

کی شہادت کیلئے بلائے جائیں گے حق تعالیٰ فرمائیں گے نوحؑ تو دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم نے ساڑھے نوسو سال تک اپنی قوم کو ہدایت کی طرف بلایا اور حق کی دعوت دی مگر ان کی قوم انکار کرتی ہے اسپر آپ کی اُمت کے علماء نوح کے حق میں گواہی دے رہے ہیں مگر قوم انکار کرتی ہے اور کہتی ہے کہ ہمارے زمانے میں یہ لوگ موجود ہی نہیں تھے پھر ان کی شہادت کس طرح قابلِ قبول ہوسکتی ہے اس سلسلے میں آپ کیا فرماتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیں گے کہ جتنی تبلیغ اپنی قوم کو نوحؑ نے کی ہے اتنی کسی نے نہیں کی ہے نوحؑ اپنے دعویٰ میں سچے ہیں اور ہماری امت کے علماء بھی سچے ہیں یہ قوم جھوٹ بول رہی ہے اس پر حق تعالیٰ فرمائیں گے کہ اے قوم نوح اب تو تمہارے خلاف ایسی شخصیت نے گواہی دیدی ہے کہ زمین آسمان ٹل سکتے ہیں مگر ان کی صداقت نہیں ٹل سکتی ہے یہ صادق الامین ہیں اس پر قوم کہے گی یہ نبی یعنی محمد صلے اللہ علیہ وسلم بھی تو ہمارے کئی سال کے بعد دنیا میں آئے ہیں یہ بھی تو اس وقت موجود نہیں تھے پھر ان کی شہادت کس طرح معتبر ہوسکتی ہے۔

خود ذاتِ حق شاہد بھی اور حاکم بھی

پھر حضور صلے اللہ علیہ وسلم سے مطالبہ ہوگا کہ آپ کے پاس اس کا کیا ثبوت ہے کہ نوحؑ نے اپنی قوم کو دعوت دی ہے اس پر ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیں گے کہ اس کے ثبوت کے لیے ہمارے پاس آپ کا کلام ہے آپ ہی نے تو قرآن حکیم میں اس کی خبر دی ہے آپ ہی نے تو فرمایا ہے وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖ فَلَبِثَ فِيْهِمْ اَلْفَ سَنَةٍ اِلَّا خَمْسِيْنَ عَامًا ط ترجمہ: یقیناً ہم نے نوحؑ کو ان کی قوم کی طرف بھیجا وہ ان میں ساڑھے نوسو سال ٹھہرے رہے۔ آپ حق ہیں اور آپ کا قرآن حق ہے۔ آپ خود اس کے شاہد ہیں ہم نے تو آپ ہی کے قرآن حکیم پر اعتماد کامل کر کے یہ شہادت دی آپ نے اتنی دعوت کی پوری کیفیت قرآن کریم میں نازل فرما کر شہادت دی ہے اس پر حق تعالیٰ فرمائیں گے

کہ اے بندو اب تو حجت تمام ہوگئی اب تو حق تعالیٰ خود مدعی اور شاہد ہوگئے اور یہی حاکم بھی ہیں مگر قومِ نوح کا عجیب حال ہوگا وہ کہے گی یہ فیصلہ کا کون سا طریقہ ہے کہ آپ ہی مُدعی بھی اور شاہد بھی اور حاکم بھی آپ کو اگر دوزخ میں ڈالنا ہی ہے تو آپ کو اختیار ہے مگر یہ فیصلہ کا طریقہ نہیں ہے ان کی نامعقولی کی حد ہوگئی کہ حق تعالیٰ پر بھی حجت قائم کر دیں گے۔

قومِ نوح کا اتفاق اور ان کی شکست

اس پر حق تعالیٰ ان سے فرمائیں گے کہ تمہارے فیصلہ کا کونسا طریقہ ہے کہ جس سے تمہارا جھوٹ کھل جائے اور سچ ظاہر ہو جائے وہ قوم کہے گی کہ اگر ہم خود گواہی دیں کہ نوحؑ نے ہم کو دعوت دی اور ہم نے اس کو قبول نہیں کیا پھر ہم مان لیں گے یہ کہہ کر آپس میں اتفاق قائم کر لیں گے ہم میں سے ہر ایک خاموش رہے بولے نہیں ہم کہیں گے کہ اس زمانے میں تو صرف ہم ہی ہم تھے اگر ہم خود شہادت دیں تو معتبر ہوگی جب ان کا مقابلہ خود ذاتِ حق کے ساتھ ہوگیا تو اللہ تعالیٰ ان کی زبان کو بند کر دیں گے اور ہر ہر جوڑ کے اندر بولنے کی طاقت پیدا فرمادیں گے اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ اس دن ہم مہر لگا دیں گے ان کے مُنہ پر ان کے ہاتھ ہم سے کلام کریں گے اور ان کے پیر اُن کے کئے ہوئے کارناموں کے متعلق شہادت دیں گے اس کے بعد تو ان کے ہر ہر عضو بولنا شروع کر دیں گے پیر کہیں گے کہ ہم سے اس نے یہ کام کرایا تھا اور ہاتھ کہے گا کہ ہم سے یہ کام کرایا تھا سر کہے گا کہ مجھ سے اس نے بتوں کے سامنے سجدہ کرایا تھا اور آپ کی توحید اور نُوح کی رسالت کا یہ انکار کرتا تھا نوح نے آپ کے پیغام کو پہنچانے میں کوئی خیانت نہیں کی۔ یہ جھوٹے ہیں جب ان کے سارے اعضاء ان کے خلاف گواہی دیں گے تو حدیث میں ہے کہ وہ لوگ اپنے ہاتھوں کو پیروں کو کاٹیں گے اور ان پر لعنت ملامت کریں گے کہ کمبختو ہم نے تو تمہارے ہی بچانے کی خاطر یہ سارا جھوٹ بولا تھا مگر تم ہی ہمارے خلاف

ہو گئے جاؤ جہنم میں جلو تم پر لعنت ہو اتنی حجت کے بعد پھر قوم نوح کا فیصلہ ہوگا اور سب کے سب دوزخ میں ڈال دیئے جائیں گے اللہ تعالیٰ کے علم میں سارا واقعہ تھا مگر پھر بھی انھوں نے اپنے علم پر فیصلہ نہیں فرمایا بلکہ شہادت کے بعد فیصلہ فرمایا ورنہ وہ علیم ہیں خبیر ہیں ان کے لیے کسی کی شہادت کی ضرورت نہیں ہے وہ خود شاہد ہیں۔

کُفّار و مشرکینؔ کی مخاصمتؔ پر دُوسری دلیل

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّاِنَّھُمْ مَّیِّتُوْنَ ۔ ثُمَّ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ عِنْدَ رَبِّکُمْ تَخْتَصِمُوْنَ ۔ آپ بھی وفات پانے والے ہیں اور آپ کے مخاطب بھی وفات پانے والے ہیں پھر وہ لوگ قیامت کے دن آپ کے رب کے پاس مخاصمت کریں گے اور جھگڑیں گے اور اپنے حقوق کا مطالبہ کرینگے وہ دن عدل و انصاف کا دن ہوگا اور فیصلہ کا دن ہوگا اور عدل و انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ اہل حقوق کے حقوق دلائے جائیں۔ حق العباد کا معاملہ بہت اہم اور پیچیدہ ہے اس میں کافر اور مشرک اور مسلمان کا امتیاز نہیں ہوگا کہ مسلمانوں کے حقوق کافروں سے دلائے جائیں گے اور ان کے حقوق مسلمانوں سے نہ دلائے جائیں گے؟ ایسا نہیں ہوگا بلکہ سب کو سب کا حق ملے گا۔ وہ جیسے بھی ہیں بہر حال انسان ہیں شریعتِ اسلام نے جانوروں کے حقوق بھی رکھے ہیں اور قیامت کے دن ان کے حقوق بھی دلائے جائیں گے مثلاً کسی نے بلاوجہ کسی جانور کو مار دیا یا اس کو تکلیف پہونچادی تو قیامت کے دن وہ جانور اس ظالم سے اپنا حق وصول کرے گا۔ کُتا اور خنزیر حرام اور قابلِ نفرت جانور ہیں لیکن اُن کو بلاوجہ تکلیف پہونچانے اور مارنے کی اجازت نہیں ہے جب قیامت کے دن جانوروں کے حقوق بھی دلائے جائیں گے تو کُفار و مُشرکین کے حقوق کیونکر نہیں دلائے جائیں گے۔ یہ اجازت نہیں ہے کہ کافر اور مشرک کو کوئی بلاوجہ تکلیف پہونچائے یا ان کا حق نہ ادا کرے یا اُن کو

لوٹے اور مارے کیونکہ اگر کسی نے ان کے ساتھ ایسا کیا تو وہ لوگ اپنے اپنے حقوق طلب کریں گے اور دینا پڑے گا دوزخ میں جانے کا معاملہ الگ ہے جانے والے یقیناً جائیں گے مگر اپنے حقوق لیکر جائیں گے۔

دشمن کبھی اپنے دشمن کے حقوق معاف نہیں کرتا

کفار و مشرکین یقیناً مسلمانوں کے دشمن ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ جب یہ دنیا میں دشمن ہیں تو کیا قیامت کے دن دوست ہو جائیں گے ہرگز نہیں بلکہ وہ تو اور سخت ہو جائیں گے وہ تو یہی کوشش کریں گے کہ "ہم تو ڈوبے ہیں صنم تجھ کو بھی لے ڈوبیں گے" وہ تو یہی کوشش کریں گے کہ ہم تو اپنی بد اعمالیوں کی وجہ سے دوزخ میں جا ہی رہے ہیں ان کو بھی لے چلو اس لیے وہ اپنے حقوق کا مطالبہ کریں گے اور مقدمہ قائم کریں گے اور اللہ تعالیٰ عدل و انصاف بھی کریں گے اور ان کے حقوق دلائیں گے ان واقعات اور حالات کو سامنے رکھ کر غور و فکر کرنا چاہیئے کہ اگر ہم نے ان کے حقوق کی ادائگی نہیں کی تو پھر ہمارا حال کیا ہوگا ہم حق تعالیٰ کے سامنے کیا جواب دیں گے انھیں حقوق میں سے تبلیغ اسلام کا مسئلہ بھی ہے اللہ تعالیٰ نے اس اُمت کو داعی بنا کر بھیجا ہے اور مسلمانوں کے ذمہ کر کے دعوتِ اسلام کا کام اس کے سپرد کر دیا ہے اگر یہ کام نہیں کرے گا تو پکڑا جائے گا اور قومِ نوح کی طرح وہ لوگ جھگڑ سکتے ہیں اور ان کا جھگڑنا درست بھی ہوگا کیونکہ ہم نے واقعی اسلام کی دعوت ان تک نہیں پہونچائی۔ اس لیے ان کی پکڑ سے غفلت نہیں ہونی چاہیئے ہر وقت بیدار رہنا چاہیئے دشمن سے دوستی کی توقع دھوکا ہے وہ کبھی اپنے حقوق معاف نہیں کر سکتے مسلمان ممکن ہے دنیا میں نہیں تو آخرت میں معاف کر دے مگر ان کے معاف کرنے کا وہم تک نہیں کرنا چاہیئے پھر بھی یہ کافر ہوں یا مشرک ہوں بہرحال اولاد بنی آدم ہیں اور ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے امتی ہیں اگر ہم ان کو اسلام کی دعوت نہیں دیں گے تو ان کو دعوت دینے کے لیے کون

آئے گا اب تو نبوت کا دروازہ بند ہو گیا ہے اور دعوت و تبلیغ کے لیے فرشتے نہ کبھی آئے ہیں اور نہ آئیں گے کیونکہ یہ کام ان کے ذمہ نہیں ہے بلکہ یہ کام اُمت کے ذمہ ڈالا گیا ہے انھیں کو کرنا ہے۔

قیامت کے دن اعمال کی شکلیں

بعض منکر اور مصروفیات عقلی ہوتی ہیں ہر انسان سمجھتا ہے کہ یہ کام اچھا ہے اور یہ کام بُرا ہے مثلاً یہ سارے ہی لوگ سمجھتے ہیں کہ چوری کرنا ڈاکہ مارنا کسی کو قتل کرنا کسی کا نقصان پہونچانا وغیرہ یہ سارے کام بُرے ہیں مگر پھر بھی انسان کرتا رہتا ہے اور کسی کے ساتھ احسان کرنا کسی کی مدد کر دینا اور لوگوں کے ساتھ اچھے برتاؤ سے پیش آنا ہمیشہ سچ بولنا وغیرہ سبھی لوگ ان کو اچھا سمجھتے ہیں اور بعض اعمال وہ ہوتے ہیں جن کا تعلق ایمان اور عقیدے سے ہوتا ہے اور معاملہ آخرت کا ہوتا ہے وہ جلدی عقل میں نہیں آتے۔ آدمی سوچتا ہے کہ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ جب ہمارے گوشت سڑ جائیں گے اور ہڈیاں گل جائیں گی تو ہم دوبارہ کس طرح زندہ کئے جائیں گے یہ تو لوگ یوں بہکانے کے لیے کہتے ہیں اس میں انسان دھوکا کھایا اس لیے انبیاء علیہم السلام دنیا میں تشریف لائے کہ انسانوں کو سمجھائیں کہ دنیا تو چند دن کی ہے اصل زندگی تو آخرت کی زندگی ہے اس کو بنالو اور نبی کے حکم کی تعمیل کرلو اور خدا کو ایک مان کر ان کے حکم کے مطابق زندگی گزارو۔ ورنہ دھوکا کھاؤ گے اگر وہ مان گیا تو کامیاب ہو گیا اور اگر نہ مانا تو ناکامیاب ہو گیا حدیث شریف میں آتا ہے کہ قیامت کے دن جب لوگ اپنی اپنی قبروں سے اٹھائے جائیں گے تو وہ اعمال ان کے سامنے ہوں گے جو دنیا سے کر کے گئے ہیں ان اعمال کی صورتیں بن جائیں گی وہ قطار باندھے کھڑے ہوں گے ان کو ہر شخص دیکھے گا کہ فلاں وقت فلاں مکان یا جگہ پر میں یہ کام کر رہا ہوں۔ خواہ چھپ کر کیا ہو یا لوگوں کے سامنے کیا ہو وہ سارے اعمال ہو بہو اسی طرح

اس کے سامنے ہوں گے اس لیے انسان انکار ہی نہیں کر سکتا کہ میں نے یہ کام نہیں کیا ہے وہاں پر انکار کی کوئی شکل نہیں ہے دنیا میں انسان بلا تکلف نڈر ہو کر جھوٹ بول لیتا ہے مگر وہاں پر جھوٹ نہیں چلے گی وہاں پر ہڑتال بھی نہیں چلے گی کہ سارے ہی کفار و مشرکین اور دوزخ میں جانے والے ایک طرف ہو کر ہڑتال کریں یا کسی قسم کا مقابلہ کریں وہ بے بسی کا عالم ہوگا کوئی کچھ بھی نہیں کر سکتا دنیا کے مجرم جیل خانے سے نکل بھی جاتے ہیں مگر وہاں سر بھی نہیں ہلا سکتے ادھر تو یہ حال ہوگا اور دوسری طرف جہنم سامنے ہوگی اور چیخیں مارے گی اس کی خطرناک آواز ہوگی ہر انسان خوف و ہراس سے گھبرایا ہوا ہوگا۔ احکم الحاکمین خود فیصلہ فرمائیں گے حق تعالیٰ کو معلوم ہے کہ کون سچا ہے اور کون جھوٹا ہے ان کا علم قطعی ہے مگر مگر عدل و انصاف کا یہ عالم ہوگا کہ اپنے علم پر فیصلہ نہیں فرمائیں گے بلکہ مقدمات قائم کریں گے اور اتمام حجت کریں گے اور شہادت پر فیصلہ فرما کر پھر اس کو دوزخ یا جنت میں جانے کا حکم دیں گے وہ خود ہی ہر ایک کے مقدمہ کی سماعت فرمائیں گے ایسا نہیں ہوگا کہ دوزخ میں جانے والوں کو بغیر فیصلہ کے دوزخ میں ڈال دیں گے اور دوزخ میں جانے والے یہ سمجھیں کہ ہم کو تو بغیر فیصلہ ہی کے دوزخ میں ڈال دیا گیا یہ کہاں کی انصاف ہے مقدمات اسی لیے قائم کیے جائیں گے تاکہ ان کو یقین ہو جائے کہ ہم کو بلاوجہ دوزخ میں نہیں ڈالا گیا ہے بلکہ ہمارے اعمال ہی ایسے ہیں کہ ہم دوزخ میں ڈالے جائیں۔ حق تعالیٰ نے ہمارے اوپر کوئی ظلم و ستم نہیں کیا ہے یہ ہماری ہی غلطی تھی جس کی سزا ہم کو مل رہی ہے وہ خود اپنی غلطی کا اقرار کریں گے اگر اقرار نہیں کریں گے تو خود ان کے اعمال ان کی شہادت دیں گے اسی لیے ہر اعضاء کے اندر گویائی کی قوت دی جائے گی تاکہ بندے کی کوئی بات چھپی نہ رہے اور معاملہ صاف ہو جائے۔

علماء حضرات پر دعوت الی اللہ کی ذمہ داری

بہر حال ہم کو یہ اقرار کرنا چاہیے کہ جو تبلیغ اسلام کا حق ہے وہ ہم سے ادا نہیں ہو رہا ہے

یہ علماء حضرات پر لازم ہے کہ اس خدمت کا انجام دیں عوام تو اس لیے دعوتِ الی اللہ کا کام نہیں کرتے کہ وہ دین سے کورے ہیں نہ تو ان کو دعوت کا طریقہ معلوم ہے اور نہ ہی اس کا علم ہے کہ یہ کام کس طرح سے کیا جائے اور نہ ہی ان کے اندر دعوت کا جذبہ ہے اور ماحول ایسا ہے کہ اکثر مسلمان منکرات میں مبتلا ہیں اس لیے عوام تو اس سے غافل ہیں مگر علماء حضرات کو غافل نہیں ہونا چاہیئے بلکہ اس کی ذمہ داری کا احساس کرنا چاہیئے اِسی لیے قرآن میں فرمایا گیا اُدْعُوْآ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ ● لوگوں کو اپنے رب کی طرف حکمت سے اور اچھے وعظ و تقریر سے بلاؤ ـــــ دوسری جگہ فرمایا گیا اَنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ تم بہترین امت ہو کیونکہ لوگوں کو اچھی باتوں کا حکم کرتے ہو اور بُری باتوں سے منع کرتے ہو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عُلَمَاءِ اُمَّتِیْ کَاَنْبِیَاءِ بَنِیْٓ اِسْرَائِیْلَ میری امت کے علماء مثل انبیاء بنی اسرائیل کے ہوں گے ایک آیت میں تو اللہ تعالیٰ کی راہ کی طرف لوگوں کو بُلانے کا حکم فرمایا گیا اس آیت میں دعوت کے مخاطب صرف مسلمانوں ہی کو نہیں بنایا گیا ہے کہ صرف مسلمانوں ہی کو دعوت دو اور دوسروں کو مت دو کیونکہ وہ ہمارے بندے نہیں ہیں۔ بلکہ یہاں پر عام انسان مراد ہیں حق تعالیٰ کا مقصد یہ ہے کہ ہمارے سارے ہی بندوں کو ہم سے ملاؤ اور شیطان کے پنجے سے چھڑاؤ اگر یہ کام تم لوگوں نے نہیں کیا تو شیطان اپنے دعویٰ میں کامیاب ہو جائے گا اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو پیدا فرمایا اور ان کو پالا ہے۔ ان کو سارے بندوں سے پیار ہے وہ یہ نہیں چاہتے کہ ہمارے بندے ہمارے مجرم بن کر اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے دوزخ میں جائیں یہی وجہ ہے کہ اپنے بندوں کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے انبیاء علیہم السّلام کو بھیجے تاکہ یہ لوگ ہمارے بندوں کو جو ہم سے کٹ چکے ہیں ہم سے ملادیں تو اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ہم کو مشورہ نہیں دیا ہے بلکہ حکم کیا ہے کہ میرے بندوں کو میرا راستہ دکھلا دو دوسری آیت میں اس اُمّت

کو خیر اُمت فرمایا گیا۔ خیر اُمت کی وجہ خود ہی حق تعالیٰ نے بتلا دی کہ یہ اُمت لوگوں کو اچھی باتوں کا حکم کرتی ہے اور بری باتوں سے روکتی ہے اگر یہ اُمت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام چھوڑ دے تو پھر خیر اُمت کہلانے کا مستحق نہیں رہے گی تیسرے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی کہ ہماری اُمت کے علماء انبیاء بنی اسرائیل کے ہونگے یعنی بنی اسرائیل کے نبیوں نے جو کام کیا ہے وہی کام ہماری اُمت کے علماء بھی کریں گے کیونکہ یہاں پر ایک شبہ تھا اس کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے دور فرما دیا اور وہ شبہ یہ تھا کہ اُمم سابقہ کا حال یہ تھا کہ ایک نبی کے جانے کے بعد دوسرا نبی آجاتا تھا اور بندوں کی رہنمائی ہوتی تھی اب تو نبوت کا دروازہ بند ہو گیا ہے اب بندوں کی ہدایت کا کام کون کرے گا خود آخری نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی تشریف لے جا رہے ہیں اب اللہ کے بندوں کا کیا حال ہوگا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شبہ کا جواب عنایت فرما دیا کہ اب نبی کوئی نہیں آئے گا البتہ یہ کام ہماری امت کے علماء حضرات کریں گے اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ آپ کی امت کے علماء حضرات نے آپ کے لائے ہوئے دین کی دعوت پوری دنیا میں پہونچائی خصوصًا علماء صوفیہ حضرات نے تو اس کے لیے اپنی ساری زندگی وقف کر دی اور پوری دنیا میں پھیل گئے اور کروڑوں انسانوں کو جو دوزخ میں جا رہے تھے ان کو جنتی بنا دیا اور وہ کام کر کے دکھایا جو انبیاء بنی اسرائیل کرتے تھے انبیاء بنی اسرائیل دو کام کرتے تھے۔ پہلا کام ان کا یہ تھا کہ جو بندے اللہ تعالیٰ سے کٹ گئے تھے انکو اللہ تعالیٰ سے ملاتے اس کا نام ہے ایمان کی دعوت۔ اور جب بندے اللہ تعالیٰ سے مل جاتے تھے تو ان کے حکم پر چلنے اور ان کی بندگی کا طریقہ بتلاتے تھے اس کا نام ہے احکام کی دعوت۔ اس سے معلوم ہوا کہ تبلیغ و دعوت کے دو جز ہیں ایک تبلیغ اسلام، دوسرا تبلیغ احکام، تو تبلیغ احکام پر علماء حضرات نے کافی محنتیں کیں اور کر رہے ہیں۔ مدارس عربیہ کا نظام علماء حضرات نے اتنا پھیلایا کہ تقریبًا گاؤں گاؤں میں مدارس قائم کئے اور وہ مسلمان اور اُن کے

بچے جو اسلام سے کورے تھے ان کو تعلیم کے ذریعہ دینِ اسلام کا عالِم بنایا دوسری طرف تبلیغ کا نظام بنایا اس سے مسلمان اسلام پر چلنے والے بنے۔ تیسری طرف وعظ و تقریر کے ذریعہ مسلمانوں کو اسلام پر جمے رہنے کی ترغیب دی۔ چوتھی طرف دینی اسلامی کتابوں کی طباعت اور ان کی اشاعت کی اس طرح سے تبلیغ احکام کا کام بڑے پیمانے پر ہو رہا ہے یہ سارے ہی کام اچھے ہیں اور ان کا کرنا بھی ضروری ہے بغیر ان کے مسلمان مسلمان نہیں بنتا مگر یہ سارے کام مسلمانوں کے لیے ہیں ان سے یقیناً مسلمانوں کا فائدہ ہو رہا ہے لیکن دوسرا جز جس کو دعوت الی اللہ یا ایمان کی دعوت کہتے ہیں وہ رُکا ہوا ہے جس کی وجہ سے غیر اقوام کا ایمانی فائدہ نہیں ہو رہا ہے اب دیکھنا یہ ہے کہ جب دعوت کے دو جز ہیں ہم صرف ایک کو کریں اور ایک کو نہ کریں تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی کے مطابق کَاَنْبِيَاءِ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ ہم نہیں ہو سکتے کیونکہ انبیاء بنی اسرائیل نے دو کام کیے اور ہم صرف ایک کام کرتے ہیں تو ہمارے حق میں یہ مثال جو دی گئی ہے اس کے مطابق ہم نہیں اُتریں گے۔ اس حدیث سے مقصد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ہے کہ تم دونوں کام کرو یہ کام تمہارے ذمہ ہے اس لیے میں علماء حضرات سے کہا کرتا تھا کہ جو حضرات فارغ ہو جائیں وہ اپنا نصب العین اور مقصد دعوت الی اللہ کو ٹھہرائیں۔ پڑھنا پڑھانا یہ ضروری کام ہے مگر یہ عین مقصد نہیں ہے بلکہ یہ تو عین مقصد کے لیے معین ہے اس لیے علماء حضرات کے اندر دعوت الی اللہ کا جذبہ ہونا چاہئے۔ ان کو چاہئے کہ اپنے غیر مسلم بھائیوں کو بھی حکمت عملی سے اسلام کے قریب کریں اور اس کی طرف مائل کریں۔

مگر یہ اسی وقت ہو سکتا ہے کہ دل میں دعوتِ الی اللہ کا داعیہ اور جذبہ ہو اور جس طرح دوسرے جز یعنی تبلیغ احکام کو ضروری سمجھتے ہیں اسی طرح دعوت الی اللہ کی خدمت کو بھی ضروری سمجھیں اور حکمتِ عملی سے کرتے رہیں۔

آج کل دعوتِ الی اللہ کی آسانی

آج کل دعوت الی اللہ کا کام بنسبت پہلے زمانے کے بہت آسان ہے پہلے لوگوں کے دلوں میں مذہبی تعصبات اتنے سخت تھے کہ وہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے۔ اپنے آباؤ اجداد ہی کے مذہب کو حق مذہب سمجھتے تھے اور اس پر جمے رہتے تھے دوسرا مذہب خواہ کتنا ہی اچھا ہو اور کامیابی کا ذریعہ بھی ہو اس کو پسند نہیں کرتے تھے بلکہ اپنا مذہب چھوڑ کر دوسرے مذہب کے اختیار کرنے کو بے دھرمی سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ فلاں شخص بے دھرم ہوگیا اس سے نفرت کرتے تھے اور چھوت چھات کا معاملہ کرتے تھے۔ لیکن موجودہ مشینری کے ذریعے سے آج دنیا ایک پلیٹ فارم پر آگئی ہے۔ چھوت چھات کا معاملہ تقریباً ختم ہوگیا ہے مذاہب دلوں سے نکل چکے ہیں۔ لوگ موجودہ تمدن اور معاشرے میں الجھ گئے ہیں۔ آپس میں ملنے جلنے کے مسائل زیادہ ہو گئے ہیں جس کی وجہ سے مذہبی تعصبات میں بہت کمی آگئی ہے اس لیے پہلے زمانے کے اعتبار سے اس زمانے میں دعوت الی اللہ کا کام بہت آسان ہوگیا ہے میں نے اسفار میں یہ بھی دیکھا ہے کہ غیر اقوام کے دلوں سے ان کے مذہب کی وقعت نکل چکی ہے یہ نئی نسلوں میں عام ہے اب وہ خود اس کے طالب ہو گئے ہیں کہ ہمارے سامنے کوئی ایسا مذہب آئے کہ جس سے ہمارا تمدن بھی باقی رہے اور ہم حق مذہب پر بھی آجائیں ایسی حالت میں کچھ حضرات بے لوث ہو کر اسلام کا نمونہ بن کر اگر ان کے پاس جائیں اور اپنی زندگی اس مقصد کے لیے وہاں گزاریں تو انشاء اللہ اس زمانے میں مبلغین اسلام کو بہت جلد کامیابی حاصل ہو جائے گی مگر آج افراد کی کمی ہے ایسے لوگ ملتے نہیں کہ وہ ان کی زبان سے بھی واقف ہوں اور ان کی نفسیات سے بھی واقف ہوں اور وہاں جا کر بے طمع ہو کر خالص اللہ کے لیے دعوتِ الی اللہ کا کام کریں۔

دعوت الی اللہ کیلئے فنڈ کا قیام

پہلے زمانے کے مبلغینِ اسلام عالمِ انسانیت کا فکر و غم رکھتے تھے اور سوچتے تھے کہ ہمارے نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم پورے عالم کی ہدایت اور رہنمائی کیلئے اس دنیا میں تشریف لائے تھے اور اپنی اُمتِ اجابت کو یہ حکم دیکر یعنی اس دینِ اسلام کو اور اس کے احکامات کو اللہ کے ان بندوں تک پہونچا دو جو ہمارے سامنے نہیں ہیں پھر آپ اس دنیا سے پردہ فرما گئے اب اگر ہم آپ کے اس حکم کی تعمیل نہیں کریں گے تو کون کرے گا وہ حضرات اس ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے اپنے گھر وبار کو چھوڑ کر تبلیغ دعوت کے لیے نکل گئے اور پھیل گئے اور اسلام کا نمونہ بن کر غیر اقوام کے سامنے پیش ہوئے یہ حقیقت اپنی جگہ پر ہے کہ اسلام کا داعی اور مُبلّغ جہاں بھی پہونچا وہاں کے لوگ ایمان اور اسلام کی دولت سے مالا مال ہو گئے یا جہاں جہاں کے لوگ خود اسلام کے داعی کے پاس آئے وہ بھی ایمان اور اسلام کی دولت لے کر گئے اور اپنے علاقے اور گاؤں میں جا کر اپنے متعلقین اور خاندان کے لوگوں سے اسلام مذہب کی اچھائیاں اور اس کی خوبیاں بتلائیں وہ لوگ ان کو دیکھ کر اسلام کی طرف مائل ہوئے اس طرح اسلام مذہب پھیلتا رہا اور جہاں پر کوئی اللہ کا داعی نہیں پہونچا یا پہونچا مگر وہاں کے لوگوں نے ان کی قدر نہیں کی وہ لوگ کافر اور مشرک ہی رہے اور اپنے آبا و اجداد کے دھرم پر جمے رہے اور ایک بہت بڑی ایمانی اور اسلامی دولت سے محروم ہو کر اپنے دشمن شیطان کا دامن مضبوطی سے پکڑ کر دوزخ میں جا گرے اولیاء اللہ اور مبلغین اسلام حضرات مخلصین تھے وہ اللہ والے تھے ہر ہر قدم پر ان کا رضاء حق مقصود تھا اللہ تعالیٰ کی ذات پر ان کا اعتماد کامل تھا وہ یہ نہیں سوچتے تھے کہ ہمارے بچوں کا کیا حال ہوگا ان کو روزی کون دے گا اگر ہم اللہ کے دین اسلام کی تبلیغ و دعوت کے لیے

اپنے بچوں کو چھوڑ کر نکل پڑے تو ان کا ذمہ دار کون ہوگا یہ باتیں ان کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آتی تھیں بس ان کے قلوب میں اسلام کی تبلیغ و دعوت کی لگن تھی اور ایک قسم کی تڑپ تھی اس لیے وہ لوگ اپنے گھر والوں کو اللہ کے حوالے کر کے نکل جایا کرتے تھے ان حضرات کو کسی کی مدد اور نصرت کی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی کیونکہ ان کے ساتھ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی نصرت اور مدد قائم رہتی تھی اب نہ ایسے لوگ رہے اور نہ ہی تبلیغ و دعوت کی وہ لگن اور تڑپ رہی اور نہ ہی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اُمت دعوت کا فکر و غم رہا۔

اہل علم حضرات یہ سوچتے ہیں کہ اگر ہم مدرسہ کو یا اپنی ملازمت کو چھوڑ کر دعوت الی اللہ کے لیے نکل جائیں تو ہمارے بچوں کا کیا حال ہوگا ہمارے پاس ملازمت کے علاوہ کوئی ذریعہ نہیں ہے اور بچوں کو کما کر کھلانا یہ شرعی حکم ہے اور وہ اہل علم جن کے پاس بچوں کے لیے ذریعہ معاش موجود ہے ان کو نہ اپنی فکر اور نہ ہی اپنے بچوں کی فکر پھر وہ اُمت دعوت کا فکر و غم کس طرح کر سکتے ہیں اور وہ مسلمان جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنی دولت سے نوازا ہے ان کے پاس عذر یہ ہے کہ ہم کو تبلیغ و دعوت کا کام آتا ہی نہیں یہ کام تو علماء کا ہے اور یہ ہماری کوئی ذمہ داری نہیں غیر مسلموں کو ضرورت ہو تو ایمان لا کر مسلمان بن جائیں ورنہ جہنم میں جائیں اس کے علاوہ ایک دوسرے سے نفرت اور بغض ہے پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے نظامِ اسلام کی تبلیغ و دعوت کون کرے چونکہ مسلمانوں کا عام مزاج ہی بگڑ چکا ہے اس لیے دعوت الی اللہ کے کام میں رکاوٹ پیدا ہوگئی ہے اس لیے میری رائے یہی ہے کہ دعوت الی اللہ کا مستقل فنڈ قائم کیا جائے اور مبلغین اسلام کو جمع کیا جائے اور اس فنڈ سے ان کے اخراجات پورے کیے جائیں اور ان سے کہا جائے کہ آپ اپنے بچوں کے اخراجات کا فکر نہ کریں ان کے اخراجات دعوتِ الی اللہ کے فنڈ سے پورے کیے جائیں گے آپ آزاد ہو کر حکمتِ عملی سے غیر اقوام میں دعوت الی اللہ کی خدمات کا کام انجام دیں اور جہاں جہاں جائیں نہ لوگوں سے چندہ کا

مُطالبہ کریں اور نہ ہی ان سے چندہ لیں اس سے آپ کا کوئی تعلق نہ ہو اگر اس قسم کا دعوت الی اللہ کا فنڈ قائم کر کے تبلیغ ایمان اور اسلام کا کام کیا جائے تو انشاء اللہ ہزاروں مبلغینِ اسلام اس کام کے لیے تیار ہو جائیں گے اور بے لوث ہو کر خلوص کے ساتھ اصول کے ساتھ تبلیغ و دعوت کا کام کریں گے مگر افسوس یہ ہے کہ لوگوں کی اس طرف توجہ نہیں رہی اور عام ذہن یہی بنا ہوا ہے کہ جائے کوئی جہنم میں، کیا ہم اس کے ٹھیکیدار ہیں جس طرح تبلیغ کے فضائل بیان کر کے مسلمانوں کو اس کی طرف مائل کیا جاتا ہے اور مدارسِ عربیہ کی قیام کی ضرورت اور علم دین کی عام اشاعت کی ضرورت اور اہمیت پر مسلمانوں کو ترغیب دی جاتی ہے اگر اسی طرح دعوت الی اللہ کی اہمیت اور ضرورت پر بھی بیان کر کے مُسلمانوں کو ترغیب دی جائے تو مسلمانوں کا میلان اس خدمت کی طرف بھی ہو جائے گا اور جس طرح احکاماتِ شریعت کے سمجھنے اور سمجھانے کیلئے مدارسِ عربیہ کے لیے مسلمان اربوں روپے خرچ کرتے ہیں اسی طرح دعوت الی اللہ کے لیے بھی خرچ کریں گے صرف ایک پہلو پر محنت کرنا اور دوسرے پہلو کو نظر انداز کر دینا یہ مناسب نہیں ہے خطرے کی گھنٹی بجنے سے پہلے اس کی تیاری کر لینی چاہیئے اگرچہ مسلمانوں میں عام غفلت پیدا ہو گئی ہے لیکن اگر ان کو دعوتِ الی اللہ کے لیے اُبھارا جائے تو وہ اس خدمت کو انجام دینے کے لیے بھی اپنی جانی اور مالی قربانی پیش کریں گے مُسلمان مالداروں میں کچھ ایسے اہل دل اور آخرت کے فکرمند بھی موجود ہیں کہ جہاں پر اسلام کا نام آتا ہے تو کروڑوں روپے خرچ کر ڈالتے ہیں۔ مدارسِ عربیہ کا نظام اور مساجد کا نظام اسی طرح تبلیغی خدمات کے سلسلے میں اربوں روپے ایسے مسلمان خرچ کر رہے ہیں اگر غیر اقوام تک اللہ کے دینِ اسلام کو پہونچانے کے سلسلے میں کوئی پروگرام بنایا جائے اور ان کو اسکی اطلاع کر دی جائے تو انشاء اللہ وہ لوگ اسلام کی اس دعوتی خدمات کے لیے بھی کافی تعاون کریں گے مگر شرط یہ ہے کہ صرف نام ہی نام نہ ہو بلکہ اس دعوتی تنظیم کے ذریعہ کچھ

تبلیغ دین کا کام بھی ہو، بعض لوگ اس قسم کی تنظیمیں بنا لیتے ہیں اور چندہ بھی وصول کر لیتے ہیں مگر کام کرتے نہیں اس لیے چندہ دینے والے بدظن ہو جاتے ہیں اس لیے میں نے کہا ہے کہ اس تنظیم کا مقصد چندہ نہ ہو بلکہ کام ہو کام دیکھ کر خود بخود لوگ مائل ہوتے چلے جائیں گے کام کرنے سے ہی کام ہوتا ہے محض تنظیم بنا لینے سے کام نہیں ہوتا۔

غیر مسلموں کا خود بخود دائرۂ اسلام میں آنا

حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ دعوتِ الی اللہ کی اہمیت اور ضرورت پر بیان فرماتے ہوئے رُک گئے ممکن ہے مسلمانوں کی غفلت اور بے توجہی کو دیکھ کر ان کے قلب مبارک پر کچھ بے چینی آئی ہو موقعہ دیکھ کر ایک صاحب نے کہا کہ حضرت آج کل ہندو بھائیوں کا حال یہ ہے کہ جب ہم ان کے سامنے اسلام کی اچھائیوں اور خوبیوں کو بیان کرتے ہیں تو وہ سن کر خوش ہوتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ کچھ دھرم اور مذہب کا تذکرہ بھی ہوتا رہے وہ لوگ اسلام مذہب کی باتیں سنتے بھی ہیں اور سن کر متاثر بھی ہوتے ہیں اب ہندو بھائیوں کا مزاج پہلے زمانے کی طرح نہیں رہا میں نے یہ نہیں دیکھا کہ اسلام کی باتیں سن کر وہ جھگڑتے لڑتے ہوں اور کسی قسم کی بحث و مباحثہ کرتے ہوں اور بیان کرنے والے کو برا بھلا کہہ کر گالیاں دیتے ہوں یا کسی قسم کی تکلیف پہونچانے کی کوشش کرتے ہوں اندازہ یہی ہو رہا ہے کہ اب موجودہ ہندو نسل کے اندر وہ پرانا تعصب نہیں رہا اس پر حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ آج کل جتنے غیر مسلم دائرۂ اسلام میں داخل ہو رہے ہیں وہ اپنی فطرتِ سلیمہ کی بنیاد پر داخل ہو رہے ہیں کبھی اسلامی کتابوں کو پڑھ کر یا قرآن شریف کو پڑھ کر اور اسلام سے متاثر ہو کر اسلام مذہب کو قبول کر لیتے ہیں یہ حقیقت ہے کہ ان کے لیے ہم نے کچھ کر کے نہیں دیا وہ اپنی فطرت سلیمہ سے مسلمان ہو رہے ہیں ایک غیر مسلم نے اسلام قبول کیا، اتفاق سے میری اور ان کی ملاقات ہو گئی میں نے اُن

سے سوال کیا کہ آپ نے اسلام مذہب کو کیوں قبول کیا اس کی کون سی ادا آپ کو پسند آئی انھوں نے عجیب بات بتلائی اور کہا کہ میں نے قرآن شریف کو پڑھ کر اسلام مذہب کو قبول کیا ہے میں نے قرآن میں دیکھا کہ بار بار اللہ کا نام آرہا ہے میں سمجھ گیا کہ یہ قرآن آسمانی کتاب ہے۔ اس کا کوئی نہ کوئی مرکز ضرور ہے جس کی وجہ سے اللہ کا نام آرہا ہے کوئی صفحہ اس سے خالی نہیں ہے کہ اس میں لفظ اللہ نہ ہو میں نے توحید کامل جو دیکھی ہے وہ صرف قرآن میں دیکھی اور کسی کتاب میں نہیں دیکھی اس لیے میرے دل میں اس کی عظمت پیدا ہوئی اور میں نے اسلام مذہب کو قبول کر لیا اس قسم کے بہت سے واقعات ہیں وہ لوگ خود بخود اسلام مذہب کی خوبیوں کو دیکھکر اسلام مذہب کو قبول کر لیتے ہیں اور مسلمان ہو جاتے ہیں یہ اسلام مذہب کی کشش ہے کہ فطرتِ سلیمہ والوں کو وہ اپنی طرف کھینچتا رہتا ہے اس میں ہمارا کسی قسم کا دخل نہیں ہوتا۔ جن لوگوں کے دلوں میں تلاش حق کی لگن ہے وہ لوگ کسی نہ کسی وقت اسلام کے دامن سے چمٹ ہی جاتے ہیں۔

دعوتِ الی اللہ کیلئے تعلیمی نصاب کی تجویز

سلسلۂ بیان کو جاری رکھتے ہوئے حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ دعوت الی اللہ کا فنڈ قائم کر کے پہلے اس کا کوئی مرکز بنایا جائے اور اس کے لیے ایک تعلیمی نصاب کی کتاب تیار کی جائے اور اس میں غیر مذاہب کی مذہبی کتابوں سے انکے بنیادی اصول کو لیا جائے اور اس میں اس کی پوری تفصیل درج ہو کہ ہندو دھرم یہ کہتا ہے اور اسلام مذہب یہ کہتا ہے اس کو اچھی طرح واضح کر کے ایک نصابی کتاب تیار کر لی جائے اور اس کو ہندی، اردو اور انگلش وغیرہ مختلف زبانوں میں چھپا کر دعوتِ الی اللہ کیلئے اس کو استعمال کیا جائے اور فارغ التحصیل طلباء کو اس کی مشق کرائی جائے پھر مختلف علاقوں میں ان کو بھیجا جائے اور دعوتی نصاب کے مطابق کام کرنے کی ان کو ترغیب دی جائے،

اوران سے کہا جائے کہ تمہاری ضرورت فنڈ سے پوری کی جائے گی تم کسی سے سوال مت کرنا اور نہ ہی اس کے لیے چندہ کرنا، بس تم اپنے دعوتی پراموں میں مصروف رہنا، نہ توکسی سے بحث مباحثہ کرنا، اور نہ ہی لوگوں سے لڑنا جھگڑنا اور نہ ہی مناظرہ کرنا، کیونکہ یہ ساری باتیں دعوت الی اللہ کے اندر بڑی رُکاوٹ پیدا کرتی ہیں ان کی وجہ سے اصل کام رہ جاتا ہے غیر اقوام سے حسن اخلاق سے اسلامی حسن سلوک اور برتاؤ سے ملنا اور ان کو پیار و محبت سے اسلام کی باتیں سمجھا کر ان کو اسلام کے قریب لانا کسی سے یہ مت کہنا کہ تم ہندو دھرم چھوڑ کر مُسلمان ہو جاؤ کیونکہ حکمت عملی سے اسلام کی دعوت دینا یہ تمہارا کام ہے اور ان کو ہدایت دینا یہ اللہ کا کام ہے تم ان کے کام میں دخل اندازی مت کرنا، کوئی مُسلمان از خود ہو جائے تو خوشی کی بات ہے ورنہ یہ بھی کیا کم ہے کہ اللہ تعالیٰ کے پیغام کو غیر اقوام تک پہونچا کر ایک بہت بڑے فریضے سے فارغ ہو جاؤ گے اور قیامت کے دن غیر اقوام کی پکڑ سے بچ جاؤ گے یہ بہت بڑی دینِ اسلام کی خدمت ہے اگر اس قسم کی کوئی تنظیم بنا کر چلائی جائے تو انشاء اللہ اس کے اثرات غیر اقوام کے قلوب پر ضرور پڑیں گے یہ ہمارا کام ہے اسکو پابندی کے ساتھ کرنا چاہیئے۔

دعوتِ الی اللہ کیلئے حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی کوشش

حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں نے اس کے لیے کوشش کی تھی کہ کوئی تبلیغ و دعوت کا مرکز بنا کر اس کے لیے فنڈ جمع کیا جائے اور فارغ التحصیل طلباء کو اس کی مشق کرا کر مختلف علاقوں میں بھیجا جائے لوگوں نے اس کو پسند کیا اور مجھے رائے بھی دی کہ ضرور ایسا ہونا چاہیئے۔ مگر لوگوں کی صرف رائے ہی رائے تھی چلی چلائی کچھ بھی نہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ لوگوں کے دلوں میں تبلیغ و دعوت کا جذبہ نہیں ہے اور نہ ہی اس کی ضرورت کا احساس ہے اگر اس کا ایک شعبہ قائم کر کے دعوتِ الی اللہ کی مشق کرائی جائے

جائے تو بہت حد تک کامیابی کی امید ہے مدارسِ عربیہ والے مدارس ہی کے فکر میں لگے ہوئے رہتے ہیں اس کی طرف توجہ نہیں کرتے خدا کرے ایسا کوئی شعبہ قائم ہو جائے اور یہ رُکا ہوا دین کا اہم کام بھی چل پڑے یہ کام مدارسِ عربیہ کے عُلما حضرات ہی کر سکتے ہیں۔ کیونکہ ان کے پاس اہلِ علم حضرات زیادہ ہیں اور وہ حضرات اس کی حکمتِ عملی پر غور وفکر کر کے بہتر طریقے پر اس خدمت کا انجام دے سکتے ہیں وہی حضرات اس فن کے ماہر اور فنکار ہیں اگر چار پانچ حضرات بھی اس کام کے لیے تیار ہو جائیں تو یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے اس پروگرام سے دعوتِ الی اللہ کا کام بھی ہوگا اور غیر اقوام کے سامنے اسلام کے حقائق اور صداقت واضح ہوتے چلے جائیں گے اگر کچھ حضرات اس کی ذمہ داری کا احساس کرتے ہوئے اس کام کو اُٹھائیں تو مُسلمان خود بخود ان کے ساتھ جُڑتے چلے جائیں گے اور اس دعوتی خدمات کو دیکھ کر لوگ متوجہ بھی ہوں گے اور تعاون بھی کریں گے یہ کام تو سارے ہی مسلمانوں کے ذمہ ہے اس میں عالم اور غیر عالم کی قید نہیں ہے کیونکہ دعوت کا حکم عام ہے نہ کرنے کی صورت میں پکڑ سب کی ہوگی مگر لوگوں کا مزاج یہ ہے کہ کوئی شخصیت اس خدمت کی ذمہ داری لیکر دعوت کا کام شروع کرے لوگوں کو شخصیت کا انتظار رہتا ہے اس لیے کوئی شخصیت اس دعوتی میدان میں آجائے تو مجھے امید ہے کہ مُسلمان اس کا ساتھ بھی دیں گے اور جماعتیں بنتی چلی جائیں گی مگر وہ شخصیت ایسی ہو کہ اس کے اندر دعوتِ الی اللہ کا جذبہ بھی ہو اور لگن بھی ہو اور جب کام شروع کرے تو پیچھے نہ ہٹے بلکہ اس پر ثابت قدم رہے ورنہ تجربہ یہی ہے کہ بہت سے لوگ اس قسم کی تنظیمیں بنا کر اور چندہ کر کے بیٹھ جاتے ہیں اور قوم میں بدنام ہو جاتے ہیں اگر کام کرنے والا کوئی ذمہ دار قسم کا نہ ہو تو محض چندہ کرنے اور جماعت بنانے سے کوئی فائدہ برآمد نہیں ہوتا اور اس کا اثر اُلٹا ہی ہو جاتا ہے لوگ بدظن ہو جاتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقۂ دعوت

تبلیغ و دعوت کا اصل مرکز پیغمبر اسلام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی ہے اس لیے مبلغین اسلام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتی زندگی کو سامنے رکھ کر اس کام کو کرنا پڑے گا، کیونکہ ہر تنظیم کی کامیابی اور اس کی مقبولیتِ عامہ کا راز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع ہی میں مضمر ہے اسی لیے اولیا رکرام اپنے دعوتی مشن میں سو فیصد کامیاب رہے کیونکہ وہ لوگ ہر ہر قدم پر اُسوۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے طریقۂ دعوت کو سامنے رکھتے تھے، اس لیے آپ کی دعوتی زندگی کا غور سے مطالعہ کرکے اور اس کو سمجھ کر جب کوئی تبلیغ و دعوت کی خدمت کرے گا تو انشاء اللہ اس کے اندر ثابت قدمی رہے گی اور اسکے ساتھ اللہ تعالیٰ کی مدد اور نصرت بھی شامل رہے گی خصوصی طور پر مبلغین اسلام دو باتوں کو غور سے سمجھنے کی کوشش کریں۔ پہلی بات تبلیغِ احکام ہے یعنی جو ایمان لاچکے ہیں یا مسلمانوں کے گھر پیدا ہو کر اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں ان کو نفس ایمان تو حاصل ہے۔ اس لیے ایسے لوگوں کو مومن کہا جاتا ہے یعنی ایمان والے، اب ایسے لوگوں کو اعمال کی دعوت دینا ہے اور یہ سمجھانا ہے کہ محض ایمان نجات کے لیے کافی نہیں ہے اگر اس ایمان کے ساتھ اعمال حسنہ یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ وحج وغیرہ کو شامل نہ کیا گیا اور محرمات ومنکرات سے اس کو بچایا نہ گیا تو یہ ایمان ناقص ہوگا اور ہر وقت خطرے میں رہے گا اس لیے اپنے ایمان کو اعمالِ حسنہ سے مزین کرکے اور اس کو منکرات ومحرمات سے بچاکر صاف کرلو تو کامیاب ہو جاؤگے ورنہ مرنے کے بعد ہر ہر منزل پر سخت پٹائی ہوگی اور اگر تمہارا دشمن شیطان مردود نے کہیں اس ایمان ناقص کو کو لوٹ لیا تو پھر جہنم کی دائمی سزا اور اس کے خطرناک عذاب میں پھنس جاؤگے اس وقت تم کو اللہ کے عذاب سے چھڑانے والا کوئی نہ ہوگا۔ مسلمانوں کے اندر اس تبلیغ سے بہت حد تک بیداری پیدا ہوگئی ہے اور مسلمانوں کو عذاب دائمی سے بچانے کے لیے اور جنت میں لیجانے

کے لیے وعظ و تقریر سے تعلیم و تبلیغ سے اور مختلف طریقوں سے کوشش اور محنت کیجارہی ہے اس تبلیغ کے لیے علمار حضرات متوجہ ہیں اور عام مسلمان بھی متوجہ ہیں اور مسلمانوں کو اعمال کے راستے سے جنت میں لے جارہے ہیں اس راستے میں مکمل طور پر حائل ہونے سے شیطان کچھ مایوس بھی ہے کیونکہ یہ اپنوں کی خدمت ہے اگر اپنا لڑکا شریر ہے تو انسان کو اس کے سمجھانے اور منانے اور ڈرانے کا حق ہوتا ہے اس سلسلہ میں خواہ مسلمانوں کو ایک ہی فیصد کامیابی ملی ہے لیکن ملی ضرور ہے اس کے اثرات مدارس عربیہ میں اور تبلیغی پروگراموں میں دیکھے جاسکتے ہیں الجھنیں اس تبلیغ پر بھی آتی ہیں مگر اپنوں سے آتی ہیں اس لیے مبلغین اور معلمین اور مصلحین حضرات برداشت کرلیتے ہیں اور دوسری بات تبلیغ ایمان ہے اس کو دعوت الی اللہ بھی کہا جاتا ہے یعنی اللہ کے بندے وہ جن کو شیطان مردود نے اپنے فریب کاری کے جال میں پھنسا کر اور الجھا کر اور ہدایت کے راستے سے ہٹا کر اپنا ساتھی بنا کر دوزخ میں لے جا رہا ہے ان بندوں کو شیطان کے پھندے سے چھڑانا اور اللہ سے ملا کر ہدایت کے راستے پر لاکر جنت کی طرف لے جانا یہ تبلیغ و دعوت بہت مشکل اور کٹھن ہے کیونکہ شیطان مردود اپنے ساتھیوں کے ساتھ اور اپنے چیلوں کے ساتھ ایسے لوگوں کے سامنے کھل کر آتا ہے اور بڑی بڑی مصیبتوں اور پریشانیوں میں الجھا دیتا ہے اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتی زندگی دیکھ کر صوفیانہ انداز سے غیر اقوام کے سامنے پیش ہونا پڑے گا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوتی زندگی

اعلانِ نبوت اور رسالت سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قوم میں معزز اور محترم تھے آپ کو صادق الامین کا لقب ملا تھا آپ کی حیثیت اپنی قوم میں ایسی تھی جیسے لاکھوں جانوروں میں ایک انسان ہو آپنے اپنے اخلاق سے اور اعمال سے اور حُسن

سلوک سے انسانیت کا ایک نمونہ پیش فرمایا۔ بچپن سے لیکر جوانی تک آپ کی زندگی ان لوگوں سے منفرد اور نرالی رہی ہے مگر جس وقت آپ نے کلمۂ توحید لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی آواز بلند کی اسی وقت آپ کی ساری قوم آپ کی دشمن بن گئی، آپ اپنی قوم کو ایمان اور اسلام کی دعوت دیتے رہے اور حق کی طرف بلاتے رہے اور ان کی طرف سے آنے والی مصیبتوں کو جھیلتے رہے آپ کو آپ کی قوم نے بہت ستایا اور پریشان کیا، اور دولت و عورت کا لالچ بھی دلایا مگر آپ نے ان کی دولت اور عورت پر لات ماردی اور اپنے دعوتی کام میں لگے رہے۔ دعوت الی اللہ کی خدمات پر سارے ہی انبیاء علیہم السلام پر مصیبتیں آئی ہیں اور اللہ تعالیٰ نے اپنے سارے ہی مبلغینِ ہدایت کو آزمایا ہے اور ان سے امتحان لیا ہے لیکن ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جو آزمائشیں اور مصیبتیں آئی ہیں وہ کسی داعی پر نہیں آئی ہیں۔ آپ دعوت دیتے رہے اور مصیبتوں پر صبر کرتے رہے اور دعوت الی اللہ کی خدمت پر ثابت قدم رہے چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ایمانی دعوت اپنی قوم کی بڑی اہم خدمت تھی اور اللہ کے بندوں کو شیطان مردود کے پنجے سے چھڑا کر ہدایت کے راستے پر لانے کی خدمت تھی اس لیے شیطان مردود اپنے ساتھیوں کے ساتھ اور اپنے چیلوں کے ساتھ آپ کے سامنے آیا اور مصیبتوں کا پہاڑ آپ کے سامنے لاکر حائل کردیا۔ مگر آپ اپنے کام میں ثابت قدم رہے پھر اللہ تعالیٰ کی مدد اور نصرت اس قدر نازل ہوئی کہ آپ اپنے دعوتی پروگرام میں کامیاب ہوگئے آخر وقت میں کل ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین آپ کی دعوت سے پیدا ہوئے اور آپ کے بعد اسلام کا نمونہ بن کر آنے والی انسانی نسلوں کے داعی اور معلم بنے اسی طرح اولیاء کرام نے بھی کیا ہے۔

آج کل کے ماحول میں تبلیغ و دعوت کا کام

اسی طرح آج کل کا ماحول دیکھکر بڑی چالاکی اور حکمتِ عملی سے انسانوں کے دشمن شیطان

مردود کے قبضے سے اللہ کے بندوں کو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمتِ دعوت کو اور اپنے انسانی بھائیوں کو چھڑا کر ہدایت کے راستے پر لانا ہے اب اس کام کے لیے اس ماحول میں کس حکمت اور تدبیر سے اور دعوت کے کس طریقۂ کار سے غیر اقوام کو ہدایت کے راستے پر لانا ہے یہ مسئلہ چند مخلصین اور تبلیغ و دعوت کے فکر و غم رکھنے والوں کے مشورہ سے حل کریں جو ضابطہ اور اُصول بن جائے اس کو فرض کی حیثیت نہ دیں کیونکہ دعوت الی اللہ فرض ہے مگر اُس کا طریقۂ کار فرض نہیں ہے موقع اور محل کو دیکھ کر اس میں ترمیم کرتے رہیں اور اس کا خیال کریں کہ جب یہ کام شروع ہوگا تو جس طرح انبیاء علیہم السلام کے سامنے اور اولیاء کرام کے سامنے شیطان اپنے ساتھیوں کے ساتھ حائل ہوا ہے۔ ممکن ہے وہ مردود موجودہ مبلغین کے سامنے بھی حائل ہو۔ اس لیے اُس کی ہر قسم کی مکر اور پکڑ سے بچتے رہیں اور ہر ہر قدم پر دعاؤں اور صبر و تحمل سے کام لیں اور اگر تبلیغ و دعوت کے راستے پر کوئی مصیبت اور پریشانی یا دشواری لاحق ہو تو اس کو خدا کی طرف سے امتحان اور آزمائش سمجھیں اور اپنے دعوتی کاموں میں لگے رہیں جتنے حضرات اس دعوتی تنظیم میں شامل ہوں خواہ وہ علماء ہوں یا عام مُسلمان ہوں سبھی حضرات صوفیاء کے رنگ میں ہوں باہر سے اسلامی شکل و صورت بنائیں اور اندر سے خلوص اور اسلامی اخلاق اور حُسنِ سلوک و برتاؤ سے اپنے آپ کو مضبوط اور مزین کرلیں اور اچھے اخلاق کے ساتھ اسلامی برتاؤ و سُلوک کے ساتھ غیر اقوام کے سامنے پیش ہوں اور اپنی اپنی عورتوں کو بھی دعوتی مشق کرائیں تاکہ غیر مُسلم عورتیں اُن کو دیکھ کر اور اُن سے مل کر خوش ہوں۔ اور اسلام اور غیر اسلام کے اندر نمایاں فرق محسوس کریں۔ مشکل یہ ہے کہ اسلام کے اندر فضلاء جمع ہو گئے ہیں غیر مسلموں کا زیادہ تر اُنھیں فضلاء مسلمانوں سے سابقہ پڑتا رہتا ہے اس لیے ان کے اعمال اور احوال کو دیکھ کر غیر مُسلم اسلام اور مُسلمانوں سے بدظن ہیں بجائے قُرب کے اسلام سے بُعد اور دُوری ہوتی چلی جارہی ہے اور وہی مُسلمان غیر اقوام کو حلقۂ اسلام میں آنے کے لیے رُکاوٹ بنے ہوئے

ہیں اگر یہ فضلار اسلام کے راستے سے ہٹ جائیں اور صرف اصل ہی اصل باقی رہیں تو ان کو دیکھ کر غیر اقوام اسلام مذہب کو آسانی سے مجھ بھی جائیں گے اور اس کے قریب بھی ہو جائیں گے بہر حال ان فضلار کو تو ہٹانا مشکل ہے البتہ ان سے الگ تھلگ ہو کر خالص ایک جماعت بنا لینی جو اسلام کا نمونہ ہو کوئی مشکل نہیں ہے یہ امر اختیاری ہے اس لیے خدا کرے کہ کوئی ایسی جماعت تیار ہو جائے جو اس خالی میدان کو پُر کر دے اور تبلیغ و دعوت کا رُکا ہوا کام چلا دے میری دلی تمنا اور دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے عالمِ انسانیت پر رحم وکرم فرمائے اور اُن کی ہدایت و رہنمائی کے لیے ایک ایسی جماعت تیار کر دے اور ان کے قلوب میں دعوت الی اللہ کی لگن اور تڑپ اور اس کا جذبہ اور شوق کوٹ کوٹ کر بھر دے ان کو دعوت الی اللہ کی بھرپور توفیق دے کر قبول فرمالے اور اُن کے ذریعہ اسلام کی تبلیغ و دعوت کی خدمت عالمگیر پیمانے پر لے کر اُن کے اثرات اور ثمرات کو پوری دُنیا میں پھیلا دے اور ان کی دعوتی خدمات کو قبول فرما کر ان کو مقبول بنائے صلی اللہ علیٰ خیر خلقہٖ محمدؐ و علیٰ آلہٖ و اصحابہٖ اجمعین۔

مُقدّمۃ الدُعا

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۔ حَامدًا ومُصلّیًا امابعد

جس وقت میں حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی مجالس کیلئے مختلف سوالات کی ترتیب دیرہا تھا تو اس وقت دُعا اور دُعا کی اہمیت کے سلسلے میں بھی ایک سوال مرتّب کیا اور تمنا یہ تھی کہ حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع ہوئی ہے اور دُعا پر ختم ہو مگر وہ مجلس مکمل ٹیپ نہیں ہوئی صرف چند صفحات پر مشتمل ایک مختصر مضمون سامنے آیا اس مجلس کی ترتیب حضرت حکیمُ الاسلام رحؒ کے انتقال کے بعد دی گئی اس لئے بہت افسوس ہوا۔ کاش کہ ہم ان کی زندگی ہی میں رل کو چیک کر لیتے تو بہتر تھا رل کٹ جانے کی اطلاع ہو جاتی اور دوسرا سوال کر کے وہ مکمل مجلسِ دُعا حاصل کرلی جاتی۔ مگر وقت نکل گیا اسلئے حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد کو لیکر اپنے دیگر اکابر کے ارشادات کو جمع کر کے ایک مختصر رسالہ اس کتاب میں شامل کرنے کا ارادہ کیا دُعا اور دُعا کے اثرات پر مختلف واقعات سامنے آتے گئے۔ جب تقریبًا پانچ سو صفحات کے مسودات جمع ہو گئے تو میں نے اس کو ایک مستقل کتاب بنا دی اور اس کا نام دُعا کی ایٹمی طاقت اور اس کے اثرات رکھا۔ اب یہاں پر صرف حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کے ارشادات کو سامنے رکھتے ہوئے اور اپنی طرف سے اس کی مختصر شرح کرتے ہوئے بطور برکت اس مجلس کی تکمیل کر رہا ہوں۔

اللہ تعالیٰ حضرت حکیمُ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی ساری مجالس کو پڑھنے اور ان پر عمل کرنے کی توفیق عنایت فرمائے۔ فقط

حبیبُ اللہ قاسمی

ناظم ادارۂ تالیفاتِ اولیاء دیوبند

مجلس ۳۸

دُعا اور اس کی فضیلت
اور دعا مانگنے کی صورت

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۞ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ وَالصَّلٰوۃُ وَ السَّلَامُ عَلٰی رَسُوۡلِہٖ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّمَ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ اَجۡمَعِیۡنَ ۞ قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی فِی الۡقُرۡاٰنِ الۡحَکِیۡمِ۔ وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیۡ عَنِّیۡ فَاِنِّیۡ قَرِیۡبٌ اُجِیۡبُ دَعۡوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلۡیَسۡتَجِیۡبُوۡا لِیۡ وَ لۡیُؤۡمِنُوۡا بِیۡ لَعَلَّہُمۡ یَرۡشُدُوۡنَ ۞

ترجمہ:۔ اور جب میرے بندے میرے متعلق معلوم کرتے ہیں تو میں اُن کے قریب ہوں اور جب مجھ سے دُعا مانگنے والا دُعا مانگتا ہے تو میں اس کی دُعا کو قبول کرتا ہوں لہٰذا میرے بندوں کو میرے احکام کو قبول کر کے ان پر یقین کرنا چاہئے تاکہ وہ لوگ کامیاب ہو جائیں۔

اللہ تعالیٰ ساری کائنات کے خالق اور مالک ہیں اور ان کے رب بھی ہیں سارے عالم کا ایک ایک ذرّہ ہر وقت ان کے سامنے رہتا ہے۔ اللہ کے بندے اس دُنیا میں اس وقت سے مرتے دم تک کیا کریں گے ان کو سب معلوم ہوتا ہے وہ ہر وقت اپنے بندوں کے شہ رگ سے قریب تر ہوتے ہیں لیکن ان کا بندہ بظاہر ان سے بہت دور ہوتا ہے کیونکہ وہ نہ تو ان کو دیکھتا ہی ہے اور نہ ہی براہِ راست ان کی کوئی بات سنتا ہی ہے اور نہ اپنی کوتاہیوں پر بظاہر پیٹا جاتا ہے اور نہ ہی اپنے اچھے اور نیک کاموں پر انعام پاتا ہے۔ اس لئے اس کو اپنے مالک اور خالق اور رب کا اپنے پاس موجود ہونے کا یقین نہیں آتا اور کتنے بندوں کو ان کے ہونے کا بھی یقین نہیں آتا اگر اللہ کے بندوں کو اللہ تعالیٰ کے ہونے اور سامنے موجود ہونے کا یقین بن جائے تو بھول کر بھی ان کی ایک چھوٹی

سی نافرمانی بھی نہیں کریں گے اور ہر وقت ان کی پکڑ اور سزا سے ڈرتے رہیں گے اور سارے ہی بندے ولی بن جائیں گے البتہ وہ بندے جو اُن کے ہونے کا یقین کرتے ہیں اور ان کو اپنا رب اور الٰہ بھی مانتے ہیں اور ان کے کلمۂ توحید پر ایمان بھی لاتے ہیں وہ لوگ کبھی کبھی ان سے دُعا بھی مانگ لیتے ہیں مگر مکمل طور پر ان کے سامنے ہونے اور دُعا کو قبول کرنے کا یقین نہیں آتا اس لئے اللہ تعالیٰ دُعا مانگنے والے بندوں کو یقین دلا رہے ہیں کہ جب تم مجھ سے دُعا مانگتے ہو تو میں تمہارے بالکل قریب بھی ہوتا ہوں اور تمہاری دُعاؤں کو سُن کر قبول بھی کرتا ہوں۔ اس لئے تم مایوس نہ ہو بلکہ مانگتے ہی رہو۔ حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ بعض مرتبہ اللہ تعالیٰ بندے کی دُعا فوراً قبول کر لیتے ہیں اور بعض مرتبہ اس کی دُعا قبول نہیں کرتے۔ کیونکہ بندہ جس چیز کو مانگنا چاہتا ہے وہ چیز اس کے لئے مضر اور نقصان دہ ہوتی ہے۔ اس لئے اس کا بدل عنایت فرماتے ہیں اور بعض مرتبہ قبول تو کر لیتے ہیں مگر اس کے اثرات کو دُنیا میں مرتب نہیں فرماتے بلکہ آخرت کے لئے جمع کر دیتے ہیں۔ جب دُعا مانگنے والا اللہ کا بندہ اپنی دُعاؤں کے ثمرات و برکات کو آخرت میں دیکھے گا تو خوش ہوگا۔ اور تمنا ظاہر کرے گا کہ کاش دنیا میں میری کوئی دعا قبول نہ کی جاتی اور ساری دُعائیں اور ان کے ثمرات آخرت میں ہی ملتے ہیں

دُعا کی فضیلت

حدیث شریف میں آتا ہے۔ اَلدُّعَاءُ یُرَدُّ الْقَضَاءَ دُعا تقدیر کو بھی بدل دیتی ہے ہر عمل کی فضیلت اُس کے ساتھ مخصوص ہوتی ہے اسی طرح تقدیر کے اندر تبدیلی پیدا کرنے کی فضیلت صرف دُعا کے ساتھ مخصوص ہے۔ جب بندہ کے سارے سہارے ٹوٹ جاتے ہیں اور وہ بے سہارا ہو جاتا ہے اور دُنیا کے سارے ظاہری اسباب ختم ہو جاتے ہیں تو بے سہارا اور غم کا مارا بندہ بڑی عاجزی اور انکساری کے ساتھ بے بسی کے عالم میں

اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے ہاتھوں کو اٹھا کر اور اپنی خطاؤں پر نادم ہو کر اپنے مالک اور خالق اور الٰہ العالمین اور رب العالمین کے سامنے عاجزی اور انکساری کے ساتھ رو رو کر اپنی خطاؤں سے معافی مانگتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے دُعائیں کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کا دریائے رحمت جوش میں آتا ہے اور اپنے در کے سائل اور فقیر کی دعائیں قبول فرما کر اس کے اثرات اور ثمرات کو ظاہر فرما دیتے ہیں اور اس کو بڑی بڑی مصیبتوں اور مشکلوں سے چھٹکارا دینے کا فیصلہ فرما لیتے ہیں اور اس کی قسمت اور تقدیر کے اندر بھی تبدیلی فرما دیتے ہیں دُعا کی فضیلت کے لئے یہی ایک حدیث کافی ہے مگر دُعا کی وجہ سے جو مقدرات میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے وہ تقدیر معلق میں ہوتی ہے تقدیر مبرم میں تبدیلی دعاؤں سے بھی پیدا نہیں ہوتی خواہ دُعا مانگنے والے انبیاء علیہم السّلام ہی کیوں نہ ہوں۔ جن کفّار اور مشرکین کیلئے جہنّم کا فیصلہ اٹل ہو چکا ہے ان کے حق میں ان کی ہدایت کے لئے کوئی کتنی اور کیسی دُعائیں کرے مگر وہ قبول نہیں ہونگی اسی لئے حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السّلام کی دعا ان کے والد آزر کے حق میں قبول نہیں ہوئی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعائیں ابو طالب کے حق میں قبول نہیں ہوئیں۔ قرآن حکیم میں فرمایا گیا کہ ان کے حق میں آپ ستّر مرتبہ بھی دُعائیں کریں تو ہرگز قبول نہیں کی جائیں گی اس لئے حدیث میں جو فرمایا گیا ہے کہ دُعا تقدیر کو پلٹ دیتی ہے اس سے مراد تقدیر معلق ہے تقدیر مبرم نہیں ہے

دعا کے معنیٰ تذلّل کے ہیں

حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ دُعا کے معنیٰ تذلّل کے ہیں حقیقت یہ ہے کہ بندہ کے اندر اس سے زیادہ ذلّت کی کوئی چیز نہیں ہے کہ وہ کسی کے آگے اپنے ہاتھوں کو پھیلا کر بھیک مانگے طبعی طور پر لوگ ایسے بھکاری کو ذلیل سمجھتے ہیں جو اپنے ہاتھوں کو پھیلا کر دوسروں سے بھیک مانگتے ہیں اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے اپنی امت کے فقراء اور مساکین کو ضرورت سے مانگنے کی اجازت نہیں دی۔ اور آپ نے سائل ہونے کے بجائے مسئول ہونے کی فضیلت بیان فرمائی یعنی تم لوگ زراعت اور تجارت کر کے کمائی کرو اور غریبوں و مسکینوں اور یتیموں اور بیواؤں کی مدد کرو اور ضرورت سے زیادہ مانگنے والوں کی مذمت بیان فرمائی اور مالداروں کو حکم فرمایا کہ غرباء و مساکین اور بیوہ عورتوں کی خبر گیری کرو۔ بجائے اس کے کہ وہ تمہارے پاس بھیک مانگنے آئیں تم خود ان کے پاس جاؤ اور ان کی مالی مدد کرو اگر مالدار مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی کا احترام کرتے تو غریبوں کو ان کے دَر پر جا کر ہاتھ پھیلا کر بھیک مانگنے کی ضرورت نہ پڑتی بہرحال کوتاہی مالداروں کی طرف سے بھی ہے اور غریبوں کی طرف سے بھی ہے۔ اگر غرباء و مساکین صبر و تحمل سے کام لیں اور مالداروں کے پاس بھیک مانگنے کے لئے نہ جائیں تو مالدار مسلمان مجبور ہو کر غرباء و مساکین کو تلاش کریں گے۔ اور اپنی زکوٰۃ و صدقات کے مصارف کو ان کے گھر جا کر دیا کریں گے حدیث میں غرباء و مساکین اور پریشان حال ضرورت مند بندوں کو حُمَّالُ الْاٰخِرَۃِ کہا گیا ہے اور یہ فرمایا گیا ہے کہ ان کی قدر کرو یہ تمہاری زکوٰۃ و صدقات کو دُنیا سے اٹھا کر آخرت کی طرف بھیجتے ہیں۔ وہ اگر نہ رہیں تو تمہاری زکوٰۃ کو اور مالی خیرات کو دنیا سے آخرت کی طرف کوئی پہونچانے والا نہیں ہوگا۔ اور یہ دولت دنیا ہی میں رکھی رہ جائے گی اور زکوٰۃ کا فریضہ سر پر باقی رہے گا اور آخرت میں زکوٰۃ و صدقات و خیرات کے جو ثمرات مرتب ہوں گے اور ان پر بے شمار ثواب ملے گا اس سے مالدار لوگ محروم ہو جائیں گے اس لئے مالدار مسلمانوں کو مدارس عربیہ کے سفراء کی اور غرباء و مساکین کی قدر کرنی چاہئے اور ان کا احسان ماننا چاہئے کہ مالداروں کو ان کے دَر پر جانا نہیں پڑتا بلکہ وہ خود مالداروں کے پاس آجاتے ہیں اس لئے ان لوگوں کا احترام کرتے ہوئے ان کا شکریہ بھی ادا کرنا چاہئے کیونکہ مالداروں کو انھوں نے ایک بڑی مشقت یعنی غرباء و مساکین کو

تلاش کرنے اور ان کے گھر پر جاکر دینے سے بچا دیا اور خود مالداروں کا بوجھ ان کے گھر پر آکر لے کر چلے گئے۔ مالداروں کو ان کا شکریہ ادا کرنا چاہیئے مگر زکوٰۃ وصدقات کا رنگ بدلا ہوا ہے۔ اس لئے بیچارے سفراء اور غرباء مالداروں کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ کیا کریں مجبور ہیں۔ مالدار خود سمجھتے ہیں کہ ہم نے ان پر احسان کیا ہے اس لئے یہ لوگ ہمارا شکریہ ادا کریں۔ زکوٰۃ وصدقات کے دینے کا بہتر طریقہ یہی ہے کہ خفیہ طور پر اُن کے گھر جاکر دیدیا جائے اور وہ خود آجائیں تو ان کی قدر کی جائے اور ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے رخصت کیا جائے اور ان کو اپنا شکریہ ادا کرنے کا موقع نہ دیا جائے۔ کیونکہ مالداروں کا اُن کے اوپر کوئی احسان نہیں ہے بلکہ یہ فریضۂ زکوٰۃ کی ادائیگی ہے مگر مگر کیا کہا جائے آج معاملہ الٹا ہی ہے

اللہ کے فقراء اور مساکین

دنیا والوں سے مانگنا یقیناً ذلّت کا کام ہے۔ لیکن یہی بھیک اگر خالق کائنات رب العالمین سے مانگی جائے تو اللہ کے در کے بھکاری اور فقیر کی ذلّت، عزّت سے بدل جاتی ہے کیونکہ اللہ کی وہ ذات ہے جو سب کو دولت اور عزّت دیتی ہے اور جب چاہتی ہے اور جس کو چاہتی ہے ذلیل کردیتی ہے بندہ خواہ کتنا بڑا مالدار ہوجائے اور اس کو کتنی ہی بڑی حکومت مل جائے وہ اللہ کے در کا بھکاری اور محتاج ہے اور کبھی کبھی اس کی حقیقت بڑے بڑے بادشاہوں اور مالداروں کو دکھا بھی دیتے ہیں ان کی حکومت اور دولت کو چھین کر ان کو اور ان کے بچوں کو دوسرں کے در کا گدا اور بھکاری بنا دیتے ہیں کوئی اپنی حکومت اور دولت پر ناز نہ کرے بلکہ خدا کا محتاج بن کر رہے اسی میں انسانوں کی کامیابی ہے اور یہی بندے کی عبدیت ہے کہ ہمیشہ اپنے آپ کو ان کے در کا بھکاری ہی سمجھے اور اُن سے ہی دُعائیں مانگتا رہے اُن سے مانگنے میں خواہ غریب ہو یا مالدار ہو یا بادشاہ ہو کسی قسم کی ذلّت نہیں ہوتی بلکہ اس کی عزّت بڑھتی ہے۔ انسانوں میں سب سے بڑی شخصیتیں انبیاء علیہم السلام

کی ہیں وہ حضرات اپنے آپ کو ہمیشہ خدا کے در کا بھکاری ہی سمجھتے رہے اور انھیں سے مانگتے رہے۔ اسی لئے ان کو دنیا میں عزت ملی اور آخرت میں بھی عزت سے نوازے جائیں گے۔ اکبر مرحوم نے ایک شعر میں لکھا ہے۔ ؎

خدا سے مانگ جو کچھ مانگنا ہو اے اکبر — یہی وہ در ہے جہاں آبرو نہیں جاتی

اس در سے مانگنے کی وجہ سے عزت آبرو جانے کے بجائے بڑھتی ہے۔

دُعا ایک محبوب ترین عمل ہے

دُعا اللہ تعالیٰ کی نگاہوں میں مستقل ایک محبوب عمل ہے دنیا کے مالدار اپنے در کے بھکاری سے بار بار مانگنے اور سوال کرنے سے ناخوش ہوتے ہیں اور مانگنے والوں کو ذلیل سمجھتے ہیں اور نہ مانگنے والوں سے خوش ہوتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کا معاملہ الٹا ہے وہ مانگنے والوں سے خوش ہوتے ہیں اور نہ مانگنے والوں سے ناخوش ہوتے ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ کے در کے سائل کو دُعا کا مقبول عمل زندگی بھر کرتے رہنا چاہیئے اور دُعا مانگنے والوں کی شان یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ دیں جب بھی خوش اور نہ دیں جب بھی خوش ہو اگر کسی دُعا کی مقبولیت سامنے نہ آئے تو اللہ تعالیٰ سے بدظن نہ ہو اور نہ ہی شکایت کرے بلکہ خوش رہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے دُعا مانگنے کی توفیق عنایت فرمادی ہے بھکاری کا کام تو مانگنا ہی ہے دینا اور نہ دینا ان کا کام ہے ہم ان کے کام میں کیوں دخل دیں بس اپنا کام بھیک منگائی کا کرتے ہیں اگر دُعا مانگنے والوں کے اندر یہ شان پیدا ہو جائے تو ان کی یہی سب سے بڑی کامیابی ہے اللہ تعالیٰ کا بندہ خواہ کوئی ہو جس قدر اللہ تعالیٰ سے دُعائیں مانگتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی نظروں میں معزز ہوتا چلا جاتا ہے۔ اور اپنے در کے بھکاری اور سائل کو وہ اعلیٰ سے اعلیٰ مقامات سے نواز دیتے ہیں اللہ تعالیٰ سے سب سے زیادہ دُعائیں مانگنے والے انبیاء علیہم السلام ہیں ان کے بعد اولیاء کرام ہیں یہ سب کے

سب جہاں اللہ کے دربار میں معزز رہے تو عام انسانوں کی نگاہوں میں بھی وہ محترم اور معزز رہے ہیں اس لئے اللہ تعالیٰ سے مانگنے اور ان سے دُعائیں کرنے میں ہی ہماری عزت اور آبرو ہے اور عبدیت کا اعلیٰ مقام بھی ہے۔

دُعا مانگنے کا طریقہ

حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ دُعا مطلق ہے اس لئے دُعا کے اندر اپنی طرف سے کوئی قید نہیں لگانا چاہئے مثلاً اس طرح سے دُعا نہ مانگیں کہ اے اللہ ہم کو فلاں چیز کی ضرورت ہے اس لئے ہم اس کے متعلق آپ سے دُعا کرتے ہیں اس لئے آپ فوراً عنایت فرمادیں اگر وہی چیز آپ فوراً نہیں دیتے ہیں تو پھر ہم کو ضرورت نہیں ہے اس لئے دُعا کو اپنی چاہت پر موقوف نہ کریں اور نہ کسی چیز کے ساتھ محدود کریں کیونکہ یہ بندے کی رائے ہے یا حکم ہے یہ دُعا نہیں ہے اسی لئے جب اس طرح کی بے تکی دُعائیں مانگتے ہیں تو وہ قبول نہیں کی جاتی ہیں کیونکہ دُعا کرنے والا اپنی دُعا کو خدا کے حوالے نہیں کر رہا ہے بلکہ اپنی پسند کی چیز مانگ رہا ہے اور ایک وقت مقررہ پر مانگ رہا ہے۔ ہوسکتا ہے وہ چیز اس کے حق میں مضر ہو یا اُس وقت مضر ہو۔ اشیاء کی حقیقت کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو ہے وہ جانتے ہیں کہ کون چیز کس بندے کے حق میں کس وقت مفید ہے اور کس وقت مضر ہے اسی لئے انھوں نے قرآن حکیم میں فرمایا عَسٰی اَنْ تُحِبُّ شَیْئًا وَّھُوَ شَرٌّ لَّکُمْ وَعَسٰی اَنْ تَکْرَھُوْا شَیْئًا وَّھُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ۔ تم بعض مرتبہ کسی چیز کو بہتر سمجھتے ہو حالانکہ وہ چیز تمہارے حق میں مضر ہوتی ہے اور بعض چیز کو تم بُری سمجھتے ہو۔ حالانکہ وہ چیز تمہارے حق میں مفید ہوتی ہے اب اگر اللہ تعالیٰ اس کی خواہش کے مطابق اس کی دُعا قبول فرمالیں اور وہ چیز نقصان دِہ ہو تو یہ چلانے لگے گا۔ اس لئے اپنی دُعا کے معاملے کو اللہ تعالیٰ کے حوالے کرکے مانگے مثلاً اے اللہ ہم محتاج اور ضرورت مند اور پریشان ہیں اس لئے آپ کے سامنے آپ کا بھکاری اور سائل

بن کر آپ ہی سے دُعا کرتے ہیں۔ آپ اپنے فضل و کرم سے فلاں چیز عنایت فرمادیں اگر وہ چیز ہمارے حق نقصان دہ اور مضر ہو تو اس کا بہتر سے بہتر بدل عنایت فرمائیں رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّفِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔

ترجمہ:۔ اے ہمارے رب ہم آپ سے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اچھائی کا سوال کرتے ہیں۔ جب اللہ تعالیٰ سے خیر و عافیت کی دُعا بندے نے مانگی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو اچھی ہی چیز دیں گے اگر وہ چیز اس کے حق میں مفید ہے تو جلدی ہی دیدیں گے۔ اور اگر وہی چیز کچھ دنوں کے بعد مفید بن جاتی ہے تو وہی چیز بعد میں دیتے ہیں ورنہ اس کا بدل دیدیتے ہیں اور اگر دنیا میں دینے کے قابل نہیں ہوتی ہے تو آخرت کے لئے اس کے اعمال میں جمع فرما دیتے ہیں اس لئے دُعا مانگنے والے جب دُعا مانگیں تو پہلے درُود شریف پڑھ لیں پھر دونوں ہاتھوں کو اٹھا کر اللہ تعالیٰ کو اپنے سامنے موجود ہونے کا یقین کر کے عاجزی اور انکساری کے ساتھ بچّوں کی طرح رو رو کر دعائیں کریں۔ انشاء اللہ ان کی دُعا ضرور قبول ہوگی اور اگر قبول نہ ہوئی تو اللہ تعالیٰ سے بدظن ہو کر دُعا مانگنا مت چھوڑیں اس کی قبولیت میں خداوند عالم کی مصلحت سمجھیں اور مانگتے ہی رہیں۔ اللہ تعالیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے میں ہم کو بھی اور پڑھنے والوں کو بھی صراط مستقیم پر چلنے کا فیصلہ فرما کر اور ایمان پر خاتمہ کرا کر اپنے نیک اور صالح بندوں کے ساتھ حشر فرما کر ان کے ساتھ جنت میں جانے کا فیصلہ فرمائے آمین۔ اور حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کو بھی اس کا عظیم ثواب عنایت فرما کر ان کا مقام بلند تر فرمائے آمین۔ "فقط

حبیبُ اللہ قاسمی

دارالعلوم اور حکیم الاسلامؒ

حامداً ومصلیاً

دارالعلوم دیوبند اولیاء کرام کی دعاؤں اور دلی تمناؤں اور خصوصی توجہات کا ثمرہ ہے اس ادارہ پر ہمیشہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر عنایت رہی ہے اور اب بھی ہے دارالعلوم کے علمی اور روحانی فیضان پوری دنیا میں اس قدر پھیلے ہوئے ہیں کہ کوئی اس عنوان پر جائزہ لیکر کتابی شکل میں اگر جمع کر دے تو کئی ضخیم ضخیم کتابیں تیار ہو جائیں گی ہمارے دور کے آخری بزرگ اور ولی حکیم الاسلام رحمہ اللہ اس ادارے کے مہتمم رہے۔ تقریباً ساٹھ سال تک اسلاف دارالعلوم کے طریقے پر اس کی خدمت انجام دیتے رہے۔ آپ جہاں بھی تشریف لے گئے اپنے اکابر کا نمونہ بن کر گئے لوگوں نے آپ کو دیکھکر دارالعلوم اور اسلاف دارالعلوم کا معائنہ کیا اور آپ کو اللہ کا ولی سمجھ کر آپ سے بیعت و عقیدت کا شرف حاصل کیا میں نے تذکرۂ حکیم الاسلام کے اندر حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی صفائی کے سلسلے میں ایک مفصل مضمون معتبر شہادتوں کے ساتھ لکھا تھا مگر اس کی اشاعت اس کتاب میں مناسب نہیں سمجھی اس لئے اس مضمون کو وہاں سے نکال دیا پھر بھی میں قاسمی برادری اور فرزندانِ دارالعلوم سے گذارش کرتا ہوں کہ اُن کی شخصیت بے لوث تھی اس لئے ان کی غیبت اور عیب جوئی کے بجائے اُن کے لئے دعائے مغفرت کریں۔ اللہ تعالیٰ ان کے مرتبے بلند فرماتے رہیں۔ دوسری گذارش یہ کرنی ہے کہ دارالعلوم دیوبند سارے ہی مدارس عربیہ اسلامیہ کا مرکز ہے اگر یہ آفات اور فتنوں سے محفوظ ہے تو

انشاء اللہ سارے ہی مدارس عربیہ محفوظ رہیں گے اور اگر اس پر حملہ ہو گیا خواہ وہ حملہ اپنوں کی طرف سے ہو یا غیروں کی طرف سے ہو تو اس کا اثر دیگر مدارس عربیہ پر پڑیگا اور وہ بھی خطرے میں آجائیں گے اس لئے اس کی مخالفت کرنے کے بجائے ہر ہر طرف سے جتنا ممکن ہو سکے تعاون کریں دارالعلوم کا تعاون کرنا درحقیقت سارے ہی مدارس عربیہ کا تعاون ہے۔ لوگوں کو غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہئے کیونکہ اعتراضات اور مخالفت کرنے سے نہ تو فتنے دبتے ہیں اور نہ ہی ختم ہوتے ہیں بلکہ مزید ابھرتے ہیں اور جنگ و جدال کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اگر دارالعلوم کی ہمدردی اور خیر خواہی دل میں موجود ہو تو بہتر صورت یہ ہے کہ خلوص کے ساتھ دل کی لگن اور تڑپ کے ساتھ اس کی بقا اور تحفظ کے لئے اللہ تعالیٰ سے بار بار دعائیں کریں۔ فرزندانِ دارالعلوم کے اندر کچھ حضرات ہمیشہ صاحبِ دل اور صاحبِ نسبت رہے ہیں اور اب بھی ہیں جب چاروں طرف سے دارالعلوم کے حق میں دعائیں کی جائیں گی تو یہ ناممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ سب کی ہی دعائیں رد کر دیں بلکہ ان میں سے کسی نہ کسی نیک اور صالح عالم کی دعا ضرور قبول ہوگی اور ان میں سے کسی کو اس روحانی دینی اور تعلیمی ادارہ کی خدمت کے لئے انتخاب فرمائیں گے وہ شخصیت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کے بعد اسلاف دارالعلوم کا نمونہ ہوگی اور دارالعلوم کو اسلافِ دارالعلوم کے طرز پر چلائے گی اسی لئے میں نے ترانۂ دارالعلوم بشکل دعاء لکھا ہے۔ دارالعلوم کے طلباء حضرات اپنی اپنی انجمنوں کے جلسوں میں اور خصوصی مجالس میں اس کو پڑھیں اور ہر شعر پر سننے والے حضرات آمین کہیں۔ اور اساتذہ حضرات بھی ان میں شامل رہیں اور سب مل کر دارالعلوم کے لئے دعائیں کریں۔ ہماری بے بسی اور اضطراری حالت پر اللہ تعالیٰ ضرور رحم و کرم فرمائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات ارحم الراحمین اور غافر المذنبین ہے۔

حبیب اللہ قاسمی غفرلہٗ

ترانۂ دارالعلوم بشکلِ دُعا

از سرورؔ بستوی

علومِ دین کا فیضان اس پر بے شمار آئے
ہمیشہ ہر طرف سے رحمتِ پروردگار آئے

رہے مامون یہ دارالعلوم ہر ہر بلاؤں سے
نہ فتنوں کا خدا اس پر کبھی گرد و غبار آئے

بنے گہوارۂ علم و عمل یہ پوری دُنیا کا
دُعائیں ہیں سدا اس پر بہاروں پر بہار آئے

پیاسے علم آئیں خوب پی پی کر کے وہ جائیں
یہاں آ کر خدا! اُن بے قراروں کو قرار آئے

دُعا ہے سارے خدّامِ مدرسہ کی خدا تم سے
علومِ دین کو لینے یہاں سارا دیار آئے

رہیں چلتی یہاں ہر دم ہوائیں علم و عرفاں کی
گھٹا رحمت کی بارش لے کے اس پر بار بار آئے

یہاں کے طالبانِ علم سارے نیک و صالح ہوں
خدا کو دیکھ کر کے حال اُن کا ان سے پیار آئے!

بصدقۂ رحمتِ عالم حبیبِ داورِ محشر!
سرورؔ اس پر مدینے سے ہوائے مُشکبار آئے

حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا سید علی میاں ندوی

دامت برکاتہم کی آخری ملاقات

۲۹ر جنوری ۱۹۸۹ء کو حاجی محمد بھائی بمبئی اندھرا ٹرانسپورٹ والے کے مکان پر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندوی مدظلہ العالی سے میں نے ملاقات کی اور مجالس حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کے ۱۵ صفحات جو کتابت شدہ تھے ان کی خدمت گرامی میں پیش کیا اور بتلایا کہ میں نے حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی میں ہی یہ کام کیا ہے۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندوی مدظلہٗ العالی بہت خوش ہوئے، پھر میں نے ان سے گزارش کی کہ آپ حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کو پہچانتے تھے، اور وہ آپ کو پہچانتے تھے اس لیے ان کی مجالس کے سلسلے میں آپ اپنے قلم سے کچھ تحریر فرما دیں تاکہ بطور پیش لفظ آپ کا لکھا ہوا مضمون کتاب کے شروع میں شامل کر دوں، اور یہ بھی کہا کہ اس سلسلے میں آپ کے پاس آنے کے بارے میں میرا ارادہ تھا مگر اللہ تعالےٰ نے بمبئی ہی میں ملاقات کرا دی آپ نے کتابت شدہ اوراق کو مجھ سے لے کر فرمایا کہ آپ دو دن کے بعد مجھ سے ملاقات کریں۔ میں نے ان کے حکم کے مطابق دو دن کے بعد ان سے ملاقات کی، انہوں نے مجھے اندر بلا کر فرمایا کہ میں اپنے مضامین دوسروں سے لکھایا کرتا ہوں، مگر جب حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا نام سامنے آیا تو یہ مناسب نہیں سمجھا کہ دوسروں سے لکھاؤں بلکہ میں نے خود

اپنے قلم سے لکھا ہے، یہ فرماتے ہوئے اپنا لکھا ہوا مضمون عنایت فرمایا، اسکے علاوہ آپ سے ایک موضوع پر مجھے کچھ معلومات فراہم کرنی تھی اس لیے کئی دن تک آپ کی مجلس میں حاضر ہوتا رہا۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندوی مدظلہ العالی کو میں نے دیکھا کہ تین دن تک کسی نہ کسی عنوان سے حکیم الاسلام حضرت مولانا، قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ فرماتے رہے، آپ نے یہ بھی فرمایا کہ حضرت مولانا قاری محمد طیبؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے جو میری آخری ملاقات ہوئی تھی اس میں حضرت رح نے مجھ سے فرمایا تھا کہ اب میرا جی یہی چاہتا ہے کہ رائے بریلی میں آ کر آپ کے مکان پر بقیہ زندگی گذار دوں۔

ناقل

حبیب اللہ قاسمیؔ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیش لفظ

حضرت مولانا الحاج سید ابو الحسن علی میاں صاحب ندوی دامت برکاتہم

ناظم دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

حامداً و مصلیاً!

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس دور کے اُن علمائے ربانیین میں سے تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے متعدد و متنوع کمالات سے نوازا تھا دین کا جامع و راسخ علم (جو انہوں نے اپنے عہد کے باکمال، مخلص اور علم و روحانیت کے جامع علماء و اساتذہ کبار سے حاصل کیا تھا) شیخ وقت اور مرشد و مربی کامل (جس کو اپنے زمانے کے اہل نظر نے بجا طور پر حکیم الامت کا خطاب دیا تھا) نسبت صحیحہ اور تعلق کامل، اور اس کا اعتماد (اس سے مراد حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ ہیں) زمانے سے باخبری اور طبائع انسانی سے واقفیت، شیریں گفتاری، خوش بیانی (جس میں وہ اپنے ہم عصروں میں امتیاز خاص رکھتے تھے) وجاہت و حسن صورت، و مکارم اخلاق، اور ان سب کے علاوہ نورٌ علیٰ نور نسبت قاسمی جس نے حِکَم و معارف و نکتہ دانی اور مضامین جدیدہ کے القاء و اظہار میں خاص طور پر مدد کی ہو گی۔ ان سب خصوصیات کی بناء پر بہت سے حقیقت شناسوں نے آپ کو حکیم الاسلام کا خطاب دیا جس نے اچھی خاصی شہرت حاصل کر لی، اور آپ کے نام کا ایک جز بن گیا۔

- راقم السطور کو یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہوئی کہ ادارہ تالیفات اولیاء دیوبند کے ناظم جناب مولوی حبیب اللہ قاسمی صاحب نے مولانا موصوف کی مجالس کی اشاعت کا اہتمام کیا ہے اوران کے تذکرہ کے ساتھ ان کو طبع اور شائع کرا رہے ہیں اگر ان مجالس میں براہ راست حاضری اور شخصی وجسمانی طور پر استفادہ نہ ہو سکنے کی (کسی حد تک) کوئی چیز تلافی کر سکتی ہے تو ان مجالس اوران کے افادات کا (مطبوعہ شکل میں) مطالعہ اوران سے ذوقی و ذہنی طور پر (اعتماد وعقیدت اور قدر دانی تشکر کے جذبے کے ساتھ استفادہ اور عمل کی نیت اس بناء پر مجالس کے مرتب ومنتخب کرنے والے اوران کی طباعت کا اہتمام وانتظام کرنے والے اور قارئین ومستفدین اور محبین اور مخلصین، شکریہ اور عملی تعاون وہمت افزائی کے مستحق ہیں، اور میں راقم السطور بھی اپنی طرف سے ان کو مبارک باد دیتا ہوں، اور قبولیت اور مقبولیت کی دعا کرتا ہوں۔

ابوالحسن علی ندوی وارد حال بمبئی

۳۱ جنوری سنہ ۱۹۸۹ء

۲۲ جمادی الثانی سنہ ۱۴۰۹ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب مدظلہ العالی مفتی دار العلوم دیوبند کے

ارشادات گرامی

حامداً ومصلیاً: حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی حیات ہی میں مجالس کے کچھ حصوں کو مولانا حبیب اللہ قاسمی نے طباعت کرائی تھی، میں نے ان مجالس پر نظر ثانی کی تھی۔ بحمد للہ یہ کتاب ہندوستان اور پاکستان میں کافی مقبول ہوئی۔ اب مولانا موصوف اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کر رہے ہیں، موجودہ ایڈیشن میں انہوں نے ساری مجالس کو ایک جگہ کر دیا ہے۔ اور حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی پر جو میں نے مختصر سوانح حیات لکھی تھی اس کو اس ایڈیشن سے نکال کر اسکی جگہ تذکرہ حکیم الاسلام کو شامل کر کے حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کا مختصر تعارف کرایا ہے، اور سوانح حیات کے متعلق یہ کہہ رہے ہیں کہ مستقل ایک کتاب کی شکل میں شائع ہو تاکہ حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی ساٹھ سالہ خدمات نمایاں ہو کر لوگوں کے سامنے آجائیں۔

حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی مجالس میں میری بھی حاضری ہوتی رہی، میں کسی سے سنکر نہیں لکھ رہا ہوں بلکہ حضرت رح کی مجالس میں حاضر ہونے کے بعد میں نے جو اثر لیا ہے وہ لکھ رہا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی مجالس عالمانہ اور عارفانہ ہوا کرتی تھیں، آپ کی مجالس علم وحکمت اور بزرگاں کے واقعات سے

بھرپور ہوتی تھیں یہی وجہ ہے کہ آپ کی مجالس میں علماء اور طلباء اور دیگر حضرات شرکت کرتے تھے اور سوالات بھی کرتے تھے، حضرت حکیم الاسلامؒ برجستہ لوگوں کے سوالات کے جواب دیا کرتے تھے اور مولانا حبیب اللہ قاسمی پوری مجلس کو ٹیپ رکارڈ کر لیتے تھے، جب حکیم الاسلامؒ جواب دیتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپ پر ان سوالات کا نزول ہو رہا ہے بڑی تفصیل سے جوابات دیتے اور ایک لمحہ کا توقف نہ فرماتے اور ہر سوال کے تمام پہلو پر پوری روشنی ڈالتے، اور درمیان میں اسلاف و اکابر اور اولیاء اللہ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے تاریخی حقائق بھی بیان فرماتے جس کی وجہ سے وہ سارے مسائل آئینہ ہو کر لوگوں کے ذہنوں میں نقش ہوتے چلے جاتے، اور لوگ زبان حال سے یہ کہتے ہوئے اٹھتے کہ کاش حضرتؒ کی مجلس اور لمبی ہوتی اور ہم اس سے مستفید ہوتے خاکسار کو یہ توقع ہے کہ یہ نیا ایڈیشن بھی علماء طلباء اور عوام میں مقبولیت عامہ کا شرف حاصل کرے گا اور لوگ ان مجالس کو پڑھ کر مستفید ہوں گے اور ان کے ایمان اور ایقان میں استقامت پیدا ہوگی، اور ان کے دلوں میں عمل صالح کا جذبہ ابھرے گا میں دعاء کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے بھی اور قارئین حضرات کو بھی اور مرتب کو بھی ان مجالس کے پڑھنے اور ان پر عمل کرنے کی توفیق دے۔ اور حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کا مرتبہ اللہ تعالیٰ بلند فرمائے آمین

فقط

طالب دعا محمد ظفیر الدین
مفتی دارالعلوم دیوبند

۸ ذی الحجہ ۱۴۱۳ھ

تقریظ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حضرت مولانا عبد الرحیم صاحب مدظلہ العالی بستوی

استاذ دار العلوم دیوبند کا مجالس حکیم الاسلام کے متعلق ارشاد گرامی

حامداً و مصلیاً!

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ابھی کل تک حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی علمی شخصیت ہمارے درمیان موجود تھی، اور ہم ان کی مجلسوں میں شریک ہو کر علمی پیاس بجھاتے تھے، حکیم الاسلام اسلاف اور اکابر کی لائقِ ستائش یادگار تھے، اور قاسمی علوم و معارف کے شارح، درجنوں کتاب کے مصنف اور علمی گتھیوں کو سلجھانے والے بے نظیر عالم، بڑے سے بڑا دھریہ اور ملحد بھی اگر چند ہی منٹ آپکی مجلس میں شریک ہو جاتا تو ایمان کی چاشنی اور توحید کا چٹخارہ لیکر اٹھتا، تقریر و بیان میں بڑی دلکشی تھی، اور ہر موضوع پر بے تکان بولتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہمہ جہتی کمال سے نوازا تھا۔ علم و فن کے ہر کوچہ سے آشنا ایسا عالم ہم نے کم دیکھا ہے۔ ع۔ بڑی مدت میں ساقی بھیجتا ہے ایسا مستانہ!

ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ آپکے دولت کدہ پر ہر روز عصر کے بعد علمی مجلس ہوتی تھی۔ دار العلوم کے ممتاز اساتذہ اور باذوق طلبہ اسمیں شریک ہو کر اپنے علمی اشکالات پیش کرتے تھے حکیم الاسلامؒ انکو حل فرماتے ہوئے ایسے نکات بھی بیان کرتے کہ سوال اور اشکال کی ہر گرہ خود کھلتی چلی جاتی تھی، ملک اور بیرون ملک کے اسفار میں بھی اس طرح کی مجلسیں ہوتی تھیں۔ آپکی مجلسی گفتگو اہل علم اور عوام کیلئے یکساں مفید ہوتی تھی۔ میں مولانا حبیب اللہ صاحب قاسمی بستوی کو مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ انھوں نے حکیم الاسلامؒ کی علمی مجلسوں کے علوم و معارف اور نکات و اسرار کو یکجا کر دیا ہے، خدا کرے یہ سلسلہ جاری رہے، موصوف کو اکابر کے فرمودات اور ملفوظات کو عام کرنے کا خاص ذوق ہے، اللہ تعالیٰ انکی مخلصانہ سعی کو قبول فرمائے۔ آمین

عبد الرحیم بستوی

خادم تدریس دار العلوم دیوبند۔ ۲۶ ربیع الثانی ۱۴۱۳ھ

پیش لفظ

حضرت مولانا قاضی محمد اطہر صاحب مبارک پوری دامت برکاتہم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

ابھی کل کی بات ہے کہ حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند رحمۃ اللہ علیہ اپنی مجالس و مواعظ میں شریعت کے اسرار و حکم اور دین کے رموز کے یواقیت و جواہر بکھیر رہے تھے اور برصغیر ہی نہیں بلکہ عالم اسلام ان کے علمی و دینی فیوض و برکات سے مستفیض ہو رہا تھا اور ان کے ایمانی و احسانی بیانات سے مسلمانوں کے قلوب منور ہو رہے تھے۔ ان کی ذات ہمارے تعارف کی محتاج نہیں ہے

ارباب علم و فضل اور بزرگوں کے فیوض و برکات کا سلسلہ ان کے بعد بھی جاری رہتا ہے اور ان کی تصانیف یا ان کے مواعظ و ملفوظات سے دُنیا استفادہ کرتی ہے۔ چنانچہ حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف اور اُن کی مجالس کے ذریعہ ان کا عرفانی و احسانی فیض جاری ہے، اسی سلسلۂ زریں کی ایک کڑی "مجالس حکیم الاسلام" بھی ہے۔ جس کو مولانا حبیب اللہ صاحب قاسمی نے تحقیق و تلاش کے بعد مدوّن و مرتب کیا ہے، ان مجالس میں حضرت قاری صاحبؒ کے انداز بیان کا عکس یوں پایا جاتا ہے جیسے وہ خود اپنی زبان فیض ترجمان سے خطاب فرما رہے ہیں اور پڑھنے والے کے دل میں ان کی باتیں اترتی جا رہی ہیں۔ اس کے مرتب شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ان جواہر ریزوں کو مختلف طریقوں سے یکجا کر کے شائع کر دیا ہے۔

قاضی اطہر مبارکپوری

۴ رجمادی الاولیٰ ۱۴۱۱ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمۃ الکتاب

حضرت مولانا حبیب اللہ قاسمی ؒ کے قلم سے

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَعَلٰٓی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَھْلِ بَیْتِہٖ اَجْمَعِیْنَ۔

اَمَّا بَعْدُ: طالب علمی کے زمانے ہی سے مجھے طبعی طور پر اپنے بزرگوں کی مجالس میں شرکت کرنے کا ذوق اور شوق رہا۔ جس وقت میں مظاہر العلوم سہارنپور میں پڑھتا تھا اس وقت الحاج شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب مہاجر مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں بعد نماز عصر مجلس ہوا کرتی تھی، اس مجلس میں خصوصی طور پر حکیم الامت حضرت تھانوی ؒ کی اصلاحی کتابوں کی تعلیم ہوتی تھی، مجھے بھی اس میں شرکت کرنے کی سعادت ملی تھی، حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ خلیفہ حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ بالالتزام اس میں شرکت فرمایا کرتے تھے اور بہت سے اساتذہ اور طلباء بھی اسمیں شرکت کرتے تھے، پھر میں جب دارالعلوم دیوبند پڑھنے کی غرض سے حاضر ہوا تو حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہتمم دارالعلوم دیوبند کی مجالس میں بعد نماز عصر شرکت کرنے کا مجھے شرف حاصل ہوتا رہا، حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب ؒ کی مجالس میں بھی اساتذہ اور طلباء کی حاضری ہوتی رہی، اس وقت اساتذہ اور طلبا کا ایک حلقہ تھا جن کے قلوب میں یہ جذبہ ہوتا تھا کہ اپنے کسی بڑے کی مجلس میں شرکت کرنی چاہیئے، ان حضرات کو حضرت حکیم الاسلام ؒ کی علمی اور اصلاحی مجالس کا فائدہ پہونچتا تھا، اسی لئے

بعض حضرات بالالتزام شرکت کرتے تھے، اس وقت میں یہ بھی سوچتا رہتا تھا کہ یہ دونوں بزرگ ہمارے اکابرین کی یادگار ہیں، اگر کسی کو اسلافِ دیوبند کو سمجھنا ہو تو یہ دو نمونے موجود ہیں، ان کی صحبت میں رہ کر اور ان کی مجالس میں شرکت کر کے ان کو بخوبی سمجھ سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ میں یہ بھی غور کرتا رہا کہ ان حضرات کے چلے جانے کے بعد یہ دونوں جگہیں پُر رہیں گی یا خالی ہو جائیں گی، ان حضرات کے بعد ان کا بدل کون لوگ ہوں گے، بہت غور وفکر کے بعد یہ بات ذہن میں آتی تھی کہ اکابر کا بَدَل ہونے کے لئے ان کی نقل ضروری ہے اگر ان کی نقل باقی رہی تو انشاء اللہ ان کے بدل بھی موجود رہیں گے، جہاں تک میں نے سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ پہلے زمانے کے جو اکابر ہوتے تھے ان کے خلفاء اور مُریدین کے اندر اپنے شیخ کی نقل کا ذَوق اور شوق ہوتا تھا، اپنے شیخ کی حالاتِ زندگی سامنے رکھ کر ان کی نقل اُتارنے کی کوشش کرتے تھے۔ جب شیخ کا اِنتقال ہو جاتا تھا تو طبعی طور پر ان کی جُدائی کا رَنج اور غم ان کو ضرور ہوتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک شمع جل رہی تھی جس سے ہمارے قلوب منوّر تھے اب وہ بُجھ گئی ہے جس کی وجہ سے پوری فضا میں اندھیری محسوس ہو رہی ہے مگر وہ حضرات مایوس ہو کر بیٹھ نہیں جاتے تھے بلکہ فوراً ان کا بَدَل تلاش کرتے تھے اور اپنے سامنے ان کا بَدَل موجود پاتے تھے، وہ حضرات اپنے شیخ کے بدل کی طرف رجوع کرتے تھے اور ان کی صحبت میں رہ کر اور ان کی مجالس میں شرکت کر کے راہِ سلوک طے کرتے تھے حضرت حکیمُ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے اَسلاف کی ایسی نقل اتاری کہ وہ نقل کرتے کرتے اَصل بن گئے تھے، ہم ان کو دیکھ کر سوچتے رہتے تھے کہ ہمارے اَسلاف کی نقل کرنیوالے بزرگ کا جب یہ حال ہے تو خود ہمارے اَسلاف کیسے رہے ہونگے۔

وجہ تالیف و ترتیب

اسی لئے میں حضرت حکیم الاسلامؒ کی مجالس میں بار بار حاضری دیتا رہا۔ آپ کی علوم و معرفت سے بھرپور حکیمانہ باتیں سن کر دل میں ایک قسم کی تڑپ پیدا ہوتی رہی اور وہ بڑھتی گئی کہ حضرت حکیم الاسلام کی ان قیمتی مجالس کو قلمبند کرنا چاہیئے۔ اگر یہ مجالس قلمبند کرلی جائیں تو خود ہمارے لئے اور آنے والے مسلمانوں کے لئے اور اس زمانے کے علماء اور مشائخ کے لئے۔۔ یہ مجالس مشعلِ ہدایت بنیں گی اور صدیوں تک آنے والی مسلم نسل ان سے علمی، اصلاحی فائدہ اٹھاتی رہے گی، اور اگر یہ مجالس قلمبند نہ کی گئیں تو حضرت حکیم الاسلامؒ ان کو اپنے ساتھ لے کر چلے جائیں گے اور ہم ایک بہت بڑے علمی ذخیرے سے محروم ہو جائیں گے ادھر یہ بھی دیکھتا تھا کہ آپ کی مجالس میں حاضر ہونے والے اور آپ کی علوم و معرفت سے بھرپور باتیں سننے والے بہت سے حضرات موجود ہیں مگر قلمبند کرنے والا کوئی نظر نہیں آرہا ہے اس لئے یہ کام مجھے خود کرنا چاہیئے۔ یہ اللہ تعالےٰ کی نوازش اور ان کا کرم ہے کہ جو اس کے اہل تھے جب انھوں نے اس کی طرف توجہ نہیں کی تو اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے اس نا اہل کے اندر ان مجالس کی نقل و ترتیب کے سلسلے میں ایک قسم کا فکر پیدا فرما کر پھر اس کی توفیق عنایت فرمادی، یہ اللہ تعالیٰ کی خصوصی عنایت ہے ورنہ یہ نا اہل اس کا اہل نہ تھا۔

نقلِ مجالس کے سلسلے میں حضرتؒ سے مشورہ اور انکی رائے گرامی

اسی جذبہ اور فکر کو لے کر میں حضرت حکیم الاسلامؒ کی خدمت میں حاضر ہوا آپ اکیلے بیٹھے ہوئے تھے، میں نے سلام مسنون عرض کیا اور آپ کے سامنے

بیٹھ گیا، آپ کسی فکر اور سوچ میں محو تھے، میں نے عرض کیا کہ حضرت میں ایک ضروری کام سے حاضر ہوا ہوں، اس سلسلے میں آپ سے کچھ مشورہ کرنا ہے، آپ نے ہمہ تن میری طرف متوجہ ہو کر فرمایا کہ کیا مشورہ ہے؟ میں نے کہا کہ میری تمنا اور خواہش ہے کہ آپ کی مجالس قلمبند کر لوں تاکہ آپ کے بعد آنے والی مسلم نسل آپ کی مجالس سے علمی اور اصلاحی فائدہ اُٹھائے آپ نے بڑی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ کے جذبات بڑے اچھے ہیں، اگر آپ نے ایسا کر لیا تو یہ ہمارا ہی کام ہوگا اور اس سے ہمارا ہی فائدہ ہوگا۔ اس جملے سے اس طرف اشارہ تھا کہ جب اکابرین دنیا سے چلے جاتے ہیں تو لوگ ان کی مجالس اور دیگر تصانیف سے علمی فائدہ اُٹھاتے ہیں اور وہی چیزیں انکی صحبت کا بدل بنتی ہیں اور ان کا ثواب ان کی رُوح کو پہونچتا رہتا ہے اور ان کا فیض ان کی مجالس اور دیگر تصنیفات کے ذریعہ جاری رہتا ہے اور صدیوں تک لوگ ان سے فائدہ اُٹھاتے ہیں میں نے عرض کیا کہ حضرت بمبئی سے اسی غرض سے ٹیپ ریکارڈ لے کر آیا ہوں میں آپ سے سوال کیا کروں گا آپ اس کا جواب عنایت فرما دیا کریں، میں سوال و جواب کو ٹیپ کر کے پھر رجسٹر میں نقل کر کے انشاء اللہ اس کی کتابی شکل دیدونگا۔ یہ سُن کر حضرت حکیمُ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ بہت خوش ہوئے اور فرمایا بہتر ہے۔

مجالس کی کیفیتِ نقل

اس کے بعد میں نے اپنے سوالات کو ترتیب سے ایک کاپی میں لکھ لیا وہ کاپی اور ٹیپ ریکارڈ لے کر حضرت حکیمُ الاسلام رحؒ کی مجلس میں حاضر ہوتا اور حضرت رحؒ سے سوال کرتا حضرت رحؒ اس کا جواب عنایت فرماتے، میں اس کو ٹیپ کر لیا کرتا تھا مجلس میں شرکت کرنے والے علماء، اور طلباء، اور عوام ہر قسم کے لوگ

ہوتے تھے میں ان حضرات سے گذارش کرتا تھا کہ آپ لوگ سوالات لکھ کر لائیں اور میری کاپی میں لکھادیں تاکہ میں آپ لوگوں کی طرف سے حضرت حکیم الاسلامؒ سے سوال کرلیا کروں، یہ بڑا اچھا موقع ہے اپنے شکوک وشبہات کو حل کرالو، مگر اتنی گذارش کے بعد بھی مجھے یہ یاد نہیں ہے کہ کسی نے ایک سوال بھی لاکر میری کاپی میں لکھایا ہو، سوال کی ابتدا میں ہی کرتا تھا، البتہ اگر کسی نے کبھی سوال کی ابتدا کی یا درمیان مجلس میں سوال کیا ہے تو میں نے اس کی نشان دہی ان کے نام کے ساتھ مجلس میں کردی ہے۔ یہ اس وقت کی باتیں ہیں جب عام طور پر ٹیپ ریکارڈ دستیاب نہیں تھا، ریلیں بھی بہت مشکل سے ملتی تھیں، چار پانچ ریلیں میں نے حاصل کرلی تھیں، رمضان شریف کا مہینہ تھا، نماز تراویح کے بعد حضرت حکیم الاسلامؒ مجلس میں بیٹھ جاتے پہلے مجلس والوں کو فنجانی چائے پلائی جاتی اس کے بعد مجلس کا پروگرام شروع ہوتا، آپ ہر سوال کا مکمل جواب عنایت فرماتے، جب ہم لوگ خود سوال کرنے سے خاموش ہوجاتے تو آپ مجلس سے اٹھ کر اندر تشریف لے جاتے تھے، اِدھر میں ادارۂ تالیفاتِ اولیاء میں آتا اور آپ کے بیان کو رجسٹر میں نقل کرکے کل کی مجلس کے لئے رِم کو خالی کرتا، پوری رات اسی میں گذر جاتی تھی، جس قدر میں نے حضرت حکیم الاسلامؒ کی مجالس کی ترتیب وتالیف میں الحمد للہ محنتیں کی ہیں اس کو میں ہی جانتا ہوں، پہلے ایک رجسٹر میں نقل کرتا تھا پھر حضرت حکیم الاسلامؒ کے مشورہ کے مطابق دوسرے رجسٹر میں مکررات کو حذف کرکے اس طرح نقل کرتا کہ جس سے پڑھنے میں روانگی باقی رہے۔ رمضان بعد بھی میں نے نقلِ مجالس کا سلسلہ باقی رکھا جب بھی حضرتؒ باہر سے تشریف لاتے تو بعد نمازِ عصر میں سوالات کی کاپی

اور ٹیپ ریکارڈ لے کر مجلس میں حاضر ہوجایا کرتا تھا اور سوال کرکے آپکی مجلس کو ٹیپ کرلیا کرتا تھا اور یہ سوچتا رہتا تھا کہ اس سال آنے والے رمضان میں انشاء اللہ حضرتؒ کی مجالس کا ایک بڑا ذخیرہ حاصل کرلوں گا۔

نقلِ مجالسِ میں کچھ رُوکاوٹیں

دل میں بڑی ہی اُمنگ تھی یہانتک کہ مجالس کی نقل و ترتیب کے سلسلے میں اِدارۂ تالیفاتِ اَولیا، دیوبند کا ضروری کام بھی میں نے چھوڑ دیا جس قدر رمضان قریب آتا گیا ہمارے جَذبات بڑھتے گئے، اَچانک یہ خبر مِلتی ہے کہ اس سال حضرت حکیم الاسلامؒ ماہِ رمضان بمبئی میں گذاریں گے یہ خبر سُن کر ہمارے سارے جَذبات ٹھنڈے پڑ گئے پھر بھی میں نے آپ کی مجالس حاصل کرنے کے لئے رمضان شریف میں بمبئی تک کا سفر کیا مگر وہاں پر کوئی بس نہیں چلا، بڑی ندامت کے ساتھ واپس آنا پڑا۔ دیوبند کی وہ مجالس جن میں ہملوگ سوال کرتے تھے اور حضرتؒ ان کے جوابات عنایت فرماتے تھے وہ مجالس مَواعظ کی شکل میں بدل گئیں۔ عام طور پر لوگ بزرگوں کی خدمت کردینا اور انؒ سے وعظ سُن لینا یہ دین کی بہت بڑی خدمت سمجھتے ہیں۔ اکابر کے مواعظ عوامی سطح پر یقیناً مفید ہوتے ہیں لیکن ان کی مجالس مَواعظ سے زیادہ مفید ثابت ہوتی ہیں، مجالس میں ایک مخصوص حلقہ شیخ کے سامنے ہوتا ہے، ہر شخص مریض بن کر ان کے سامنے بیٹھ جاتا ہے اور اپنی رُوحانی بیماریوں کی اصلاح کے لئے ان کو اپنا نبض دکھاتا ہے اور ان کے متعلق ان سے سوال کرتا ہے، مُصلحین اُمت حضرات رُوحانی بیماریوں کو بتلا کر ان کی دَوا بھی دیتے ہیں اور علاج بھی کرتے ہیں، ان کی مجلس میں کوئی مریض بن کر بیٹھے یا تندرست بن کر بیٹھے دونوں کا علاج ہوتا ہے بخلاف

وعظ کے، واعظ صرف مرض اور دوا بتلا دیتا ہے مگر علاج کا کوئی اہتمام نہیں کرتا، اس لئے میرے نزدیک مجالس کی اہمیت مواعظ سے بہت زیادہ ہے البتہ اگر مواعظ کے ساتھ ساتھ مجالس کا سلسلہ بھی جاری رہے تو نورٌ علیٰ نور ہمارے اسلاف کا یہی طریقہ رہا ہے، وہ حضرات مواعظ کے ساتھ ساتھ مجالس کا بھی اہتمام فرماتے تھے۔

اس کا پہلا نمونہ ملاحظہ فرمائیں

حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ اپنے اکابر کو اس کے لئے نمونہ بنا کر پیش فرمایا کرتے تھے، میں خود حضرت حکیم الاسلام رح کو اس کے لئے نمونہ میں پیش کرتا ہوں، یہی حالت حکیمُ الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تھی، دیوبند میں تو نماز عصر کے بعد آپ کی برابر مجلس ہوا کرتی تھی، دیوبند کے علاوہ جہاں پر بھی آپ تشریف لے جاتے تھے آپ کے یہاں مستقل مجالس کا سلسلہ جاری رہتا تھا، مواعظ کا پروگرام الگ ہوتا تھا اور کبھی ہوتا تھا اور کبھی نہیں بھی ہوتا تھا مگر مجالس کا پروگرام مستقل چلتا رہتا تھا، ہمارے اکابر کے مُریدین کا طریقہ یہی رہا، وہ حضرات اپنے شیخ کی مجلس میں حاضر ہوتے تھے اور اپنے شکوک وشبہات کے متعلق ان سے سوال کرتے تھے وہ حضرات ہر سوال کا تشفی بخش جواب عنایت فرماتے، اور قلمبند کرنے والے حضرات اس کو قلمبند کرلیا کرلیتے تھے، اس کا اہتمام حضرت حکیمُ الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلقین نے کیا تھا، آپ کا ہر وعظ، ہر ملفوظ وارشاد اور آپ کی ہر مجلس قلمبند کرنے والے پابندی کے ساتھ قلمبند کرلیا کرتے تھے اور ان کی کتابی شکل دے دیا کرتے تھے، آج ہزاروں مسلمان حضرت حکیمُ الامت رح کے مَواعظ وملفوظات اور ارشادات اور اُن

کی مجالس سے علمی، اِصلاحی اور رُوحانی فائدہ اُٹھا رہے ہیں اور آئندہ بھی اُٹھاتے رہیں گے، آج یہی چیزیں حضرت حکیم الاُمت کی صحبت کا بدل بنی ہوئی ہیں۔

حضرت حکیم الامت تھانویؒ کے مواعظ و ملفوظات وغیرہ سے لوگوں کے قلوب میں کیسے کیسے انقلابات آئے ہیں، یہ ایک لمبی داستان ہے، میری زندگی اسی میں گذر رہی ہے، حضرت حکیم الامتؒ کے مواعظ وغیرہ کے اثرات لوگوں کے قلوب پر کس قدر پڑ رہے ہیں اور ان سے لوگوں کو کتنا فائدہ پہونچ رہا ہے اس قسم کے بہت سے واقعات ہمارے سامنے ہیں لیکن یہ ان کا محل نہیں۔ ہم کو یہ بتلانا ہے کہ اگر حضرت حکیم الاسلامؒ کے خدام اور محبّین بھی وہی طریقہ اختیار کرتے جو حضرت حکیم الامتؒ کے خُدّاموں نے اختیار کیا تھا، تو آج اس یگانۂ روزگار حکیم کی ہزاروں مجالس کا ایک بہت بڑا علمی اور اصلاحی ذخیرہ مسلمانوں کے ہاتھ میں ہوتا اور صدیوں تک آنے والی مُسلم نسل ان سے فائدہ اٹھاتی مگر یہاں پر اس کا اہتمام ہی نہیں کیا گیا۔ یہ اپنی جگہ پر حقیقت ہے کہ ایک بہت بڑا علمی ذخیرہ ہماری غفلتوں سے ہمارے ہاتھ سے نکل گیا۔ بہرحال جو کچھ ہوا اس کے تذکرے سے اب کوئی فائدہ نہیں ہے۔

مجھے تو اپنے متعلق عرض کرنا ہے کہ میں اسی کوشش میں لگا رہا کہ حضرتؒ کی جتنی مجالس حاصل ہو جائیں وہ بھی غنیمت ہیں ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ چراغ سحری بزرگ دُنیا کو خیرآباد کہہ کر آخرت کے لئے روانہ ہو جائیں اور ہم دیکھتے رہیں اگرچہ ہمیشہ کے لئے رمضان شریف کی مجالس ہاتھ سے نکل گئیں لیکن رمضان شریف کے علاوہ جو بعد نمازِ عصر دیوبند میں آپ کی مجلس ہوتی تھی، میں اس کو حاصل کرنے کی کوشش میں لگا رہا اور حاصل کرتا رہا۔

آخر عمر میں بھی اہتمام سے گھبراہٹ

حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اب دارالعلوم کے اہتمام کی ذمہ داری میرے اُوپر بہت گِراں معلوم ہو رہی ہے، اگر ذمہ دارانِ دارالعلوم مجھے چھٹی دیدیں اور یہ عہدہ کسی اور کو سپرد کر دیں تو بہت بہتر ہوتا، اب میں اہتمام کے لائق نہیں رہا، کمزوری بہت بڑھ چکی ہے، آپ نے فرمایا کہ میں نے بعض مرتبہ اپنی کمزوری بیان کر کے ان حضرات سے گذارش بھی کی مگر وہ حضرات پیچھا نہیں چھوڑتے کیا کروں، مجبور ہوں، اگر دارالعلوم والے مجھے چھٹی دیدیتے تو پھر میں آپ لوگوں کی خدمت کے لئے فارغ ہو جاتا جس طرح آپ کو شروع میں اہتمامِ دارالعلوم سے گھبراہٹ تھی اسی طرح آخر عمر میں بھی ہو گئی تھی، اس کی تفصیل تذکرہ حکیم الاسلام میں ملاحظہ فرمائیں۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندوی مدظلہ العالی سے آخری ملاقات میں آپ نے جو اپنی طبعی تمنا اور خواہش ظاہر فرمائی تھی اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس فکر اور کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ دیوبند چھوڑ کر کسی ایسی جگہ پر چلے جائیں کہ لوگوں کو پتہ بھی نہ چلے اور ساری زندگی وہیں پر گذار دیں۔ مجھے معتبر ذرائع سے یہ خبر ملی ہے کہ آپ کے متعلق ایسا پروگرام بن چکا تھا اور کچھ حضرات آپ کو لینے کی غرض سے آنے والے بھی تھے مگر انتقال کی خبر سُنکر رُک گئے۔

اکابرینِ دیوبند کی مجالس کا رنگ اور اس کا دوسرا نمونہ

میں نے مجالس کی اہمیت مواعظ کی اہمیت سے زیادہ مفید ہونا بلا وجہ نہیں لکھا ہے بلکہ میں نے اس کے متعلق حضرت حکیم الاسلام رحؒ سے سوال کیا، انھوں

نے اس کا جواب عنایت فرمایا، وہ سوال وجواب ملاحظہ فرمائیں:

میں نے حضرت حکیم الاسلامؒ سے سوال کیا کہ حضرت ہمارے اکابر کے یہاں ان کی مجالس کی کیا نوعیت ہوتی تھی؟

حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ ہم نے طالب علمی کے زمانے میں اپنے اکابرین کا رنگ دیکھا ہے، بعد نمازِ عصر حضرت شیخ الہندؒ کے یہاں برابر مجلس ہوا کرتی تھی، اس میں اَساتذہ اور طلباء کثرت سے شرکت کرتے تھے، ہمارے والد ماجد یعنی حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں بھی مجلس ہوا کرتی تھی، اُدھر تھانہ بھون جاؤ تو حضرت حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں مجالس کا مستقل اہتمام ہوتا تھا، پھر وہاں سے سہارنپور جاؤ تو حضرت مولانا خلیل احمد صاحبؒ کے یہاں مجالس کا سلسلہ جاری رہتا تھا، یہ حضرات ہمارے اَسلاف سے منسلک تھے، ان حضرات کی مجالس سے ہزاروں علماء اور عوام کی اصلاح ہوتی تھی، یہ حضرات دارالعلوم دیوبند کے ممبرانِ شوریٰ تھے، جب کبھی دارالعلوم میں مجلس شوریٰ منعقد ہوتی تو یہ حضرات دارالعلوم میں تشریف لاتے تھے، ان کے ساتھ ان کے مریدین کا ایک مجمع بھی ہوتا تھا، اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دارالعلوم میں نورانیت کی بارش ہو رہی ہے، پورا دارالعلوم ذکر اللہ کی صداؤں سے گونج اُٹھتا تھا۔ اس وقت ایسا محسوس ہوتا تھا کہ دارالعلوم کی در و دیوار سے اَللّٰہُ ھُوْ کی صدائیں بلند ہو رہی ہیں۔ اس وقت دارالعلوم کا عجیب منظر ہوتا تھا، اب وہ رنگ نہیں رہا، ہمارے اکابر کی ان مجالس کے اثرات اساتذہ اور طلباء کے قلوب پر بڑے اچھے پڑتے تھے، طلباء حضرات طالبعلمی ہی کے زمانے سے اپنی اصلاح کے فکر میں پڑ جاتے تھے اور فراغت کے بعد

ان بزرگوں میں سے کسی سے منسلک ہو جاتے تھے پھر وہ حضرات جہاں بھی جاتے تھے اپنے اکابر... کا رنگ لے کر جاتے تھے اور ان حضرات سے اصلاحی تعلق قائم رکھتے تھے، وہ حضرات جہاں بھی ہوتے اپنے اکابرین کے رنگ میں رنگے ہوئے ہوتے تھے اور ان کا نمونہ بھی ہوتے تھے اور اپنے اپنے علاقے میں تعلیم و تبلیغ اور تزکیۂ نفس کی خدمت انجام بھی دیتے تھے، اس طرح ہمارے اکابر کے خدّاموں کے ذریعہ تعلیم و تبلیغ و تذکیر کے بڑے بڑے کام انجام پائے ہیں، اپنے اکابر کے وہ مُریدین خود اپنے زمانے کے شیخ کامل بن جاتے تھے اور ان کے ذریعہ ہزاروں کی اصلاح ہوتی تھی مگر اب اس کا اہتمام نہیں رہا، وہ خلوص اور حُسنِ اِخلاق اور تعلق مع اللہ جو ہمارے اسلاف میں پائے جاتے تھے وہ اب ناپید ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

مجالِس کا اہتمام کوئی نئی چیز نہیں ہے

حضرت حکیم الاسلامؒ نے اپنے اکابرؒ کو اس کے لئے ایک نمونہ بنا کر پیش فرمایا، اکابرینِ دیوبند نے اپنی طرف سے یہ کوئی نیا طریقہ ایجاد نہیں فرمایا تھا بلکہ یہ سلسلہ تو سرچشمۂ ہدایت سیّد المرسلین وخاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے ہی چلا آرہا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب تشریف لاتے اور مسجدِ نبوی میں بیٹھ جاتے یا کبھی نماز بعد بیٹھ جاتے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ کے سامنے مِل کر بیٹھ جاتے پھر صحابہ کرامؓ کو آپ دین کی ضروری باتیں بتلاتے، کبھی کبھی بعض صحابہ حضرات آپ سے سوال کرتے اور کبھی آپ خود صحابہؓ سے سوال کرتے تھے، جب صحابہ کرامؓ جواب نہ دے پاتے تو فرماتے اَللہُ وَرَسُوْلُہٗ اَعْلَمُ، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود ہی اس کی تشریح فرماتے تھے، آپ کی مجالسِ حَسَنہ سے علوم و معرفت کا دریا

نکلا آپ کے صحابہ کرامؓ کو سیراب کرتا ہوا پورے عالم میں پھیل گیا۔ صحابہ کرامؓ کا حافظہ قوی تھا، وہ حضرات آپ کی ہر بات یاد کرلیا کرتے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لے جانے کے بعد پھر وہی صحابہ حضرات آنے والی امت کے معلم اور مربی بنے، ان کے یہاں بھی مجالس کا سلسلہ جاری رہتا تھا، پھر تبع تابعین اور ائمہ اور علماء ربانیین اور اولیاء کرام نے بھی اس طریقہ کو اپنایا اور مجالس کا سلسلہ باقی رکھا، حضرت خواجہ غریب نواز رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر اولیاء کرام کی حالات زندگی کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات واضح طور پر معلوم ہو جاتی ہے کہ ان حضرات کے یہاں مجالس کا بہت اہتمام ہوتا تھا، ان حضرات کے خلفاء حضرات ان کے فرمودات اور ان کی مجالس کو پابندی کے ساتھ قلمبند فرماتے تھے چنانچہ اس سلسلے میں ان اولیاء کرام کے ملفوظات اور فرمودات کی ضخیم ضخیم کتابوں کا تذکرہ ملتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ یہ مجالس کا سلسلہ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے ہی سے چلا آرہا ہے اور ہمیشہ یہ سلسلہ مفید رہا ہے اس لئے اس کو اسلافِ دیوبند نے اپنایا تھا۔ آج بھی ہمارے اکابر کے جو نمونے رہ گئے ہیں وہ حضرات بھی اس کو اپنائے ہوئے ہیں، چونکہ اپنے اکابرین کی مجالس سے مجھے خود بھی فائدہ محسوس ہوتا رہا۔ اس لئے حضرت حکیم الاسلامؒ کی مجالس کو قلمبند کرنے کی فکر میں لگا رہا، مگر حضرت حکیم الاسلامؒ پر ایک ایسا وقت آیا کہ وہ مجالس جو بعد نمازِ عصر ہوا کرتی تھیں وہ بھی ختم ہونے لگیں، رمضان شریف کے خواب وخیال میں یہ مجالس بھی ہاتھ سے جانے لگیں۔ آپ پر چاروں طرح سے فکر وغم کا حملہ ہوا پھر بھی یہ کمزور حکیم صبر وتحمل کا نسخہ استعمال کرتا رہا، آخر کار اسی فکر وغم

کی حالت میں دنیا سے آخرت کی طرف روانہ ہوگئے،
انتقال کی کیفیت تذکرہ حکیم الاسلام میں ملاحظہ فرمائیں۔
میرے کئی اہم اہم سوالات رہ گئے تھے، دل کی تمنا دل میں ہی رہ گئی۔
حضرت حکیم الاسلام رحؒ کی شخصیت کو پہچاننے والے ان کے ایک دوست بزرگ سے میں نے اس کا تذکرہ کیا اور گذارش کی کہ چند سوالات رہ گئے ہیں جن کے متعلق میں حضرت رحؒ سے سوال نہ کر سکا، اگر آپ اجازت دیں تو آپ کے پاس کچھ دن قیام کر کے آپ سے وہ سوالات کر کے ان کے جوابات نوٹ کر لوں مگر انھوں نے فرمایا کہ میں حکیم الاسلام نہیں ہوں، اس طرح تمھارے سوالات کا جوابات دینا یہ انھیں کا کام تھا۔ بہر حال جتنی مجالس کی تالیف و ترتیب کا کام مجھ سے ہو سکا وہ ناظرین حضرات کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں، جس طرح اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے اس مختصر سی خدمت کی توفیق عنایت فرمائی ہے اسی طرح اس کو قبول فرما کر مقبول بنائیں اور مجھے خود اور پڑھنے والوں کو بھی اس پر عمل کرنے کی ہمت اور اور توفیق دیں اور اس کا ثواب حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحؒ مہتمم دارالعلوم دیوبند کی روح مبارک کو پہونچا کر ان کے درجات کو بلند تر فرمائیں آمین ثم آمین۔

فقط حبیب اللہ قاسمی

ناظم ادارہ تالیفاتِ اولیاء دیوبند۔ یوپی

مختصر تذکرہ حکیم الاسلام رحمہ اللہ

حامداً و مصلیاً۔ اما بعد! حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمہ اللہ بانی دارالعلوم دیوبند کے صاحبزادے حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمہ اللہ کے تین بچے پیدا ہوئے، دو لڑکے اور ایک لڑکی، ان تینوں کا انتقال بچپن ہی میں ہو گیا، اکابرینِ دیوبند خصوصاً حضرت مولانا محمود حسن صاحب شیخ الہند رحمہ اللہ اس سلسلے میں بہت متفکر تھے اور ان کی دلی خواہش اور تمنا تھی کہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی نسل چلے مگر کافی دنوں تک حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا، اس لئے ان کے تفکرات میں اضافہ ہوتا رہا۔ حضرت مولانا عبدالسمیع صاحب رحمہ اللہ استاذ دارالعلوم دیوبند نے یہ واقعہ بیان فرمایا کہ ایک دن مجھے حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے بلایا اور فرمایا کہ حافظ محمد احمد صاحب رحمہ اللہ کے کئی سال سے اولاد نہیں ہو رہی ہے اور ہماری تمنا یہ ہے کہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کی نسل باقی رہے اور چلتی رہے۔ میں نے سنا ہے کہ فتح پور ہسوا میں ایک بزرگ رہتے ہیں وہ اولاد کے سلسلے میں مستجاب الدعوات ہیں تم وہاں پر ان کی خدمت میں جاؤ اور میری طرف سے یہ درخواست کرو کہ یہ صورتِ حال ہے وہ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ حافظ محمد احمد صاحب رحمہ اللہ کو اولاد کی دولت سے نوازیں، چنانچہ میں حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کے حکم کے مطابق فتح پور ہسوہ گیا اور ان بزرگ

کی خدمت میں حاضر ہوا اور واقعہ بیان کر کے دعا کی درخواست کی، ان بزرگ صاحب نے فرمایا کہ انشاء اللہ اس کا جواب ہم آپ کو کل دیں گے ان بزرگ کے حکم کے مطابق میں دوسرے دن ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے ملاقات کی، انھوں نے فرمایا کہ میں نے اللہ تعالےٰ سے حافظ احمد کی اولاد کے سلسلے میں دعا کی، اللہ تعالےٰ نے میری دُعا قبول فرمالی اور مجھے یہ بشارت دی گئی ہے کہ حافظ محمد احمد صاحبؒ کے یہاں لڑکا پیدا ہوگا، وہ لڑکا حافظ بھی ہوگا اور قاری بھی ہوگا اور عالم بھی ہوگا اور حاجی بھی ہوگا۔ حضرت مولانا عبدالسمیع صاحبؒ دیوبند تشریف لائے اور حضرت شیخ الہندؒ کو پورا واقعہ بتایا۔ حضرت شیخ الہندؒ یہ بشارت سن کر بہت خوش ہوئے، ان بزرگ صاحب کی بشارت کے مطابق لڑکا پیدا ہوا اور وہ حافظ وقاری وعالم جب ہوگیا تو ان کی بتلائی ہوئی تین باتیں پوری ہوگئیں، جب چوتھی بات یعنی وہ حاجی بھی ہوگا اس کے ظہور کا وقت آیا تو حضرت مولانا عبدالسمیع صاحبؒ نے حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب سے یہ واقعہ اس وقت بیان فرمایا جب ۱۳۴۶ھ میں حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ حج کے لئے روانہ ہوئے، روانگی کے وقت یہ دونوں بزرگ ایک ہی ٹانگہ میں بیٹھے، حضرت مولا عبدالسمیع صاحبؒ نے حضرت حکیم الاسلامؒ کو پورا واقعہ سنا کر فرمایا کہ جب تم پیدا ہوئے تو میں نے کہا الحمدللہ ان بزرگ کی کہی ہوئی پہلی بات پوری ہوئی اور جب تم حافظ ہوگئے تو اکابر میں بڑی خوشی منائی گئی تو میں نے کہا الحمدللہ یہ دوسری بات بھی پوری ہوگئی، اور جب تم قاری ہوگئے تو میں نے کہا الحمدللہ یہ تیسری بات بھی پوری ہوگئی اور جب تم نے درس نظامیہ سے فراغت حاصل کر لی تو

میں نے کہا الحمدللہ ان بزرگ کی کہی ہوئی چوتھی بات بھی پوری ہوگئی اور تم جب حج کے لئے روانہ ہوئے تو میں نے کہا الحمدللہ اب ان کی کہی ہوئی پانچویں بات بھی پوری ہوگئی۔

ولادتِ حکیم الاسلامؒ جمادی الثانی ۱۳۱۵ھ مطابق جون ۱۸۹۷ء بروز اتوار آپ کی پیدائش ہوئی، آپکی پیدائش کا مہینہ اور دن تو معلوم ہوگیا لیکن وہ کونسی تاریخ تھی اس کے جاننے کیلئے حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب مدظلہ العالی نے بڑی کوشش کی مگر تاریخِ پیدائش معلوم نہ ہوسکی، آپ کی پیدائش پر اکابرینِ دیوبند کو بڑی خوشی حاصل ہوئی، سارے اکابرین نے ان کے حق میں دعائیں دیں اور جب آپ سات سال کے ہوئے تو اکابرینِ دارالعلوم کو بلاکر ان کی بسم اللہ کی ابتداء کرائی گئی، یہاں پر بھی سارے اکابرین نے ان کے حق میں دعائیں کیں۔

آپ ابتدائی تعلیم سے فارغ ہوکر حفظ وقرآت اور فارسی وعربی اور دیگر علوم وفنون سے گذرتے ہوئے ۱۳۳۷ھ میں دارالعلوم دیوبند کی درسگاہ عالیہ سے فارغ ہوگئے اور دارالعُلوم کے اساتذہ اور اکابرین کی نگاہوں میں مقبولیت کا شرف حاصل فرمالئے۔

حکیم الاسلامؒ کے دو خواب حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ اپنے زمانۂ طالب علمی کے دو خواب بیان فرماتے ہیں۔

پہلا خواب:- آپ نے فرمایا کہ جس سال میں نے عربی پڑھنا شروع کیا اس سال میں نے رات کو خواب میں دیکھا کہ ہاپوڑ سے جو ریلوے لائن مرادآباد جاتی ہے اس لائن پر ایک ٹرین ہے، میں نے دیکھا کہ اس ٹرین میں

ہمارے سارے اکابر موجود ہیں، اس میں حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بھی موجود ہیں، امروہہ سے پہلے گنگا کا پل آتا ہے، گاڑی اس پر آکر ٹھہر گئی، رات کا وقت ہے، میں چھوٹا بچہ تھا کھیلتے ہوئے گاڑی سے اُتر گیا، میں نے دیکھا کہ گنگا کے اندر سینکڑوں دیواریں ہیں، وہ ساری دیواریں پانی میں پھیلی ہوئی ہیں، کوئی دیوار اِدھر جارہی ہے اور کوئی اُدھر جارہی ہے۔ ان دیواروں کے نیچے پانی بہ رہا ہے، میں ان دیواروں پر ٹہلتے ٹہلتے دور نکل گیا، اس وقت میری عمر دس گیارہ سال کی تھی، میں میزان و منشعب شروع کرچکا تھا، حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ جب مجھے اپنے پاس موجود نہیں پائے تو انھوں نے لوگوں سے پوچھا کہ طیب کہاں گیا ہے کہیں باہر تو نہیں نکل گیا، رات کا وقت ہے اور نیچے بڑا دریا ہے جاؤ اسے تلاش کرکے لاؤ، کچھ حضرات میری تلاش میں نکلے اور میرے پاس پہونچ کر کہنے لگے کہ تم کہاں چلے آئے، حضرت خفا ہورہے ہیں اور تم پانی میں دیواروں میں دیواروں پر گھوم رہے ہو، پھر ان حضرات کے ساتھ ریل کے ڈبہ میں آیا، میں نے دیکھا کہ پورا ڈبہ اکابرین سے بھرا ہوا ہے اور حضرت نانوتوی رح بھی تشریف فرما ہیں اور آپ کے سامنے حضرت مولانا احمد حسن امروہوی اور حضرت شیخ الہند رح دونوں مخصوص تلامذہ باادب بیٹھے ہوئے ہیں، حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ نے مجھ سے فرمایا کہ کہاں گیا تھا، میں نے کہا کہ دریا کا سیر کرنے گیا تھا، پھر حضرت رح نے فرمایا کہ کیا یہ دریا کے سیر کا وقت ہے پھر آپ نے فرمایا کہ جو کچھ پڑھا ہے وہ یاد بھی ہے میں نے کہا کہ خوب یاد ہے، پھر حضرت رح نے میرا امتحان لینا شروع کردیا مگر آپ کے ہر سوال کا جواب میں پورے طور پر نہیں دے سکا آپ نے فرمایا کہ یاد اسی کو کہتے ہیں

اس کے بعد حضرتؒ نے محبت سے مجھے اپنے سینے سے لگایا اور زور سے دبایا اور فرمایا اچھا امکانِ نظیر پر تقریر کرو، میں بہت تیزی سے فرفر تقریر کرنے لگا، حضرتؒ اس وقت اپنا ہاتھ میرے کندھے پر رکھے ہوئے تھے۔ جب اس موضوع پر تقریر پوری ہوگئی تو آپ نے فرمایا کہ اب امکانِ کذب پر تقریر کرو میں نے اس موضوع پر بھی بڑی تیزی سے تقریر کی، پھر اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے اپنے اکابرین سے جب یہ خواب بیان کیا تو انھوں نے اس کی یہی تعبیر دی کہ خواب بہت مبارک ہے۔ اللہ تعالیٰ تم کو علمِ دین عنایت فرمائے گا اور حضرت نانوتویؒ کی طرف سے علمِ دین کا فیضان ہوگا۔

دوسرا خواب :۔ حضرت حکیمُ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جس سال میں دورۂ حدیث پڑھ رہا تھا میں نے ایک رات خواب میں دیکھا کہ دارالعلوم میں بڑی ہمہ ہمی ہے اور ایک جشن کی صورت ہے، میں نے طلبا سے دریافت کیا کہ آج کیا بات ہے کہ جس کی یہ دھوم دھام ہے اور جشن کی تیاری ہو رہی ہے، طلباء حضرات نے بتلایا کہ آج بخاری شریف کا ختم ہے اور حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بخاری شریف ختم کرانے کیلئے تشریف لا رہے ہیں میں یہ خبر سُن کر بہت خوش ہوا اور حضرتؒ کی زیارت کے لئے میں بھی چلا میں نے دیکھا کہ حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ دارالحدیث کے شمالی زینے سے نیچے کی طرف اتر رہے ہیں اور تشریف لا رہے ہیں، ایک چھوٹا سا عمامہ باندھے ہوئے ہیں اور عمامہ کے اُوپر ایک سفید چادر اس طرح اُوڑھے ہوئے ہیں کہ تھوڑا سا چہرہ کھلا ہوا ہے اور داڑھی کے کچھ بال نظر آرہے ہیں اور بڑی تیزی کے ساتھ مولسری کے درخت کی طرف تشریف

لارہے ہیں۔ اس موقع پر حضرت نانوتوی رح کی زیارت ہوئی، اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی۔

درس وتدریس فراغت کے بعد آپ دارالعلوم میں ایک مدرس کی حیثیت سے رکھے گئے۔ ۱۳۳۷ھ سے ۱۳۴۲ھ تک آپ نے دارالعلوم میں درس وتدریس کی خدمت انجام دی، آپ نے دارالعلوم سے اپنی تعلیم پر کوئی معاوضہ قبول نہیں فرمایا اور فی سبیل اللہ درس دیتے رہے، آپ نے میزان سے لے کر فقہ وحدیث اور تفسیر کی کتابیں بھی پڑھائیں، طلباء میں آپ کا درس مقبول رہا، تعلیم وتعلم کے ساتھ اس زمانے کے مشائخ اور مصلحین امت سے بھی آپ کا طبعی لگاؤ رہا، اس زمانے کے اکابرین کے مشورہ کے مطابق حضرت حکیم الامت تھانوی رح سے بیعت ہوئے اور آخر عمر تک حضرت حکیم الامت رح سے منسلک رہے اور انکے مواعظ وملفوظات اور ارشادات کا کثرت سے مطالعہ بھی فرماتے رہے، پھر حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے ان کی صلاحیت دیکھ کر خلافت کی دولت سے بھی ان کو نواز دیا اس طرح آپ کا ظاہر اور باطن دونوں پاکیزہ بن گیا۔

عہدۂ اہتمام ۱۳۴۳ھ کے اساتذہ اور اکابرین دارالعلوم کی متفقہ رائے یہ ہوئی کہ مولانا قاری محمد طیب صاحب رح کو مسند اہتمام پر بیٹھایا جائے اور اس کی صورت یہ تجویز ہوئی کہ تعلیمی مشغلہ جاری رکھتے ہوئے ان کو پہلے نیابتِ اہتمام پر لایا جائے اور ان کو کام کرنے کا موقع دیا جائے تاکہ ان کی انتظامی صلاحیت ابھر کر سامنے آئے، اِدھر یہ طے ہو رہا تھا اُدھر حکیم الاسلام رح کا حال یہ تھا کہ ان ذمہ داریوں کے سر آنے کا

ان کے دل میں وہم بھی نہ تھا۔ آپ کی طبیعت درس وتدریس سے مانوس ہو چکی تھی، اس لئے رات دن تعلیمی مشاغل میں مشغول رہتے تھے، جب اہتمام کا مسئلہ ان کے سامنے آیا تو آپ نے بڑے ادب سے اس خدمت سے معذرت پیش کردی اور عہدہ اہتمام کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ میری طبیعت طالب علمانہ ہے، یہ اہتمام کے جھگڑے مجھ سے برداشت نہیں ہوں گے۔

حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ حضرت مولانا سعیدالدین مرحوم اور حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی مرحوم نے میرے والد صاحب مرحوم کے سامنے جب میرے اہتمام کے متعلق بات کی تو میں نے اپنے والد مرحوم کو حیدرآباد کی نصیحت یاد دلائی کہ آپ نے خود مجھ سے فرمایا تھا کہ دارالعلوم کے اہتمام کے جھگڑے ہم نے چالیس سال برداشت کئے مگر تم اس سے بچنا اور اپنی جدی میراث سنبھالنا اور وہ میراث علم ہے ان انتظامی جھگڑوں میں نہ پڑنا، میں نے اپنے والد مرحوم کو یہ وصیت یاد دلا کر ان سے عرض کیا کہ جب آپ کی یہ خود نصیحت ہے تو اب آپ کے سامنے مجھے ان جھگڑوں میں پڑنے کے لئے کیوں کہا جا رہا ہے، یہ سن کر حضرت والد مرحوم نے فرمایا کہ میری نصیحت اب بھی وہی ہے جو پہلے تھی، مگر اس وقت حالات مجبور کن پیدا ہو گئے ہیں اور تمام بزرگوں کا یہی فیصلہ ہے، اس وقت ان حضرات کی بات مان لو آگے ہر وقت تم کو اختیار ہے اس اختیار والی شکل کو پیش نظر رکھتے ہوئے میں نے ان کے فیصلے کو مجبوراً ان کی دباؤ میں آ کر مان لیا۔

عُہدۂ اہتمام سے عدمِ مُناسبت

مگر چونکہ آپ کو اہتمام کے کاموں سے طبعی مناسبت نہیں تھی اس لئے تقرر کے باوجود اہتمام سے کوئی دلچسپی نہیں رہی، برائے نام اس خدمت کو انجام دیتے تھے، بقیہ اوقات تعلیم و تعلم میں صرف کرتے تھے، اور بار بار یہ درخواست کرتے تھے کہ مجھے اس خدمت سے معاف فرمایا جائے مگر اکابرین ان کی درخواست منظور نہیں کرتے تھے، ایک مرتبہ حضرت حکیم الاسلام رح سارا کام چھوڑ کر تھانہ بھون چلے گئے اور یہ تحریر لکھ دیئے کہ اہتمام کا کام مجھ سے نہیں ہو سکے گا، یہ خدمت کسی دوسرے کے سپرد کر دی جائے، حضرت حکیم الاسلام رح کے اس طریقے سے اکابرین دار العلوم بہت پریشان ہوئے، حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا علّامہ محمد ابراہیم صاحب بلیاوی رح اور حضرت مولانا اعزاز علی صاحب رح اور حضرت مولانا عبد السمیع صاحب رح یہ چاروں حضرات تھانہ بھون پہونچے اور حضرت تھانوی رح سے ملاقات کر کے فرمائے کہ حضرت آپ کے یہاں ہمارا ایک چور آیا ہے اور آپ نے اسے پناہ دے رکھی ہے حضرت تھانوی رح کو اس واقعہ کی کوئی خبر نہیں تھی اس لئے انھوں نے پوچھا کہ کیسا چور، اس کا کیا مطلب ہے؟ پھر ان حضرات نے ان کا نام لیکر پورا واقعہ سنایا اور فرمایا کہ یہ تھانہ بھون چلے آئے ہیں اور یہ لکھ کر آئے ہیں کہ مجھ سے اہتمام کے جھگڑے برداشت نہیں ہوں گے لہٰذا یہ عہدہ کسی اور کے سپرد کر دیا جائے، ان حضرات نے حضرت حکیم الامت رح سے فرمایا کہ حضرت ہم لوگ مدرسہ کس کے سپرد کریں؟ اس پر حضرت تھانوی رح نے فرمایا کہ مجھے اس کی کچھ خبر نہیں ہے، پھر حضرت تھانوی رح نے ان کو

طلب فرمایا اور مخاطب کر کے کہا کہ تم نے یہ کیسی حرکت کی ہے، سارے کام چھوڑ کر تم یہاں پر آگئے، اس پر حضرت حکیم الاسلام رح نے فرمایا کہ یہ کام مجھ سے نہیں چل سکتا، اس پر ان حضرات نے کہا کہ کیسے نہیں چلے گا جو بھی کچھ ہو ہم لوگ تم کو زبردستی لے جائیں گے، غرضیکہ کسی طرح یہ حضرات حضرت حکیم الاسلام رح کو تھانہ بھون سے دیوبند لے آئے، حضرت حکیم الاسلام رح فرماتے ہیں کہ اس وقت میرا عجیب حال تھا، میں اہتمام چاہتا نہیں تھا اور یہ حضرات مانتے نہیں تھے۔

ناگواری کے باوجود عہدۂ اہتمام پر کیوں رہے؟

ایک مجلس میں حضرت حکیم الاسلام نے فرمایا کہ اہتمام کے معاملے میں بہت دنوں تک اُلجھنوں میں مبتلا رہا اور میرا جی اہتمام میں نہیں لگتا تھا، وجہ یہی تھی جب کسی چیز سے طبعی مناسبت نہ ہو اور لوگ زبردستی اس چیز کو دینا چاہیں تو اس سے آدمی کی طبیعت گھبرائی رہتی ہے، حضرت رح نے فرمایا کہ میں نے اس گھبراہٹ کی حالت میں دو خواب دیکھے، اس کے بعد تھوڑا سا اطمینان ہو گیا، ان دو خوابوں کے بعد حضرت حکیم الاسلام کو سکون ضرور ہوا مگر عدم مناسبت کا سلسلہ آخر عمر تک رہا جیسا کہ میں نے وجہ تالیف و ترتیب میں ایک جگہ آخری عمر میں اہتمام سے گھبراہٹ کا واقعہ لکھا ہے۔

حکیم الاسلام رح کا پہلا خواب

حضرت حکیم الاسلام رح نے ایک مجلس میں فرمایا کہ میں نے ایک خواب دیکھا کہ میں خود اور میرے موجودہ اکابرین مدینہ منورہ میں حاضر ہیں اور ایک ہوٹل میں بیٹھے ہوئے ہیں اس میں حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ

اور مولانا عبد السمیع صاحبؒ اور دیگر اکابرین موجود ہیں، حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی رحمہ اللہ نے چائے منگائی، میں نے ان حضرات سے عرض کیا کہ ہم لوگ زیارت کے لئے آئے ہیں اس لئے ہمارا خیال یہ ہے کہ پہلے ہم لوگ زیارت سے فارغ ہو جائیں پھر چائے پیتے رہیں گے، چنانچہ ہماری رائے کو اکابرین نے پسند فرمایا اور سب حضرات ہوٹل سے اُٹھ گئے اور حرم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں پہونچ گئے، میں نے دیکھا کہ نیچے حرم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے اور اوپر دار العلوم دیوبند ہے۔ اس منظر کو دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ دار العلوم دیوبند تو ہندوستان میں ہے مگر میں اس کو حرم نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر دیکھ رہا ہوں، میں نے سوچا کہ یہ دار العلوم ہے اس میں میرا حجرہ بھی تو ہوگا اور دفتر اہتمام بھی ہوگا، میں نے جا کر دیکھا تو اس میں میرا حجرہ بھی اور دفتر اہتمام بھی ہے، پہلے میں اپنے حجرہ میں گیا اس کے بعد دفتر اہتمام میں گیا، میں نے دیکھا کہ دفتر اہتمام میں ہمارے سارے بزرگ موجود ہیں، حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی رحمہ اللہ کے بھائی سید احمد صاحب مرحوم بھی موجود ہیں اور پلاؤ کا ایک دیگچہ بھی تیار رکھا ہوا ہے، حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ نے فرمایا کہ میں بہت دیر سے تمھارا انتظار کر رہا ہوں کھانا کھا لو ورنہ ٹھنڈا ہو جائے گا، پلاؤ نکل کر سامنے بھی آگیا اور سارے حضرات کھانے پر بیٹھ گئے، یہاں پر پھر میں نے سارے حضرات سے گذارش کی کہ ہمارا مقصد زیارت ہے، کھانا مقصد نہیں ہے، اسلئے میری رائے یہ ہے کہ پہلے ہم لوگ زیارت کرلیں پھر بعد میں اطمینان سے کھانا کھائیں گے، یہ سن کر سارے حضرات نے فرمایا کہ یہ ٹھیک کہتے ہیں، کھانا چھوڑ دو۔

پہلے زیارت کر لو، وہاں سے ہم لوگ نیچے حرمِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں آئے، میں نے دیکھا کہ حرمِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر چوڑا ہے کہ اس میں ہزاروں ستون ہیں اور آخر میں بالکل اندھیرا ہو گیا ہے، نہ تو وہاں پر کوئی روشنی ہے اور نہ کوئی چیز نظر آ رہی ہے، ہم لوگ حرمِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں داخل ہو گئے اور جس طرح ہم لوگ بڑھتے جاتے تھے اسی قدر اندھیرا بھی بڑھتا گیا، میں نے دیکھا کہ اندھیری کی وجہ سے کچھ لوگ واپس ہو گئے، آخر میں صرف اکیلا میں رہ گیا، میں نے کہا کہ جو بھی کچھ ہو میں تو زیارت کر کے ہی واپس ہوں گا پھر ٹٹول ٹٹول کر آگے بڑھتا گیا، کافی دور پہونچنے کے بعد اُدھر سے کچھ روشنی محسوس ہونے لگی، میں نے روضۂ اقدس کو دیکھا کہ وہ بارہ دری ہے، ہر طرف تین تین دروازے ہیں اور ان کے درمیان ایک چارپائی بچھی ہوئی ہے اس پر سرورِ کائنات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آرام فرما ہیں اور سر سے پیر تک آپ کے اوپر ایک سفید چادر پڑی ہوئی ہے، اس وقت میری کیفیت یہ تھی کہ مجھ پر گریہ وزاری طاری تھی اور اس کی وجہ سے آنکھیں تر تھیں، ہیبت کی وجہ سے میرے پیر حرکت نہیں کرتے تھے مگر ہمارے اندر کا جذبہ یہ تھا کہ جو بھی کچھ ہو روضۂ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر پہونچ کر ہی رہوں گا، آنکھوں سے آنسو جاری تھے، پیر حرکت نہیں کرتے تھے مگر پھر بھی میں آہستہ آہستہ آگے کی طرف چل رہا ہوں یہانتک کہ روضۂ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم میں داخل ہو گیا اور جس چارپائی پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آرام فرما تھے اس سے میرے گھٹنے لگ گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا دستِ مبارک چادر سے باہر نکالا، میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے آپ کا دستِ مبارک

مضبوطی سے تھام لیا اور اسی حالت میں میری آنکھ کھل گئی، آنکھ کھلنے کے بعد میں نے دیکھا کہ میرے ہاتھ اسی طرح تھے جس طرح میں نے حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم کا دستِ مبارک مضبوطی سے خواب میں تھام لیا تھا، اس خواب کے بعد طبیعت میں اہتمام کے سلسلے میں جو گرانی تھی وہ جاتی رہی اور میں نے سمجھا کہ جو اہتمام کی خدمت میرے سپرد کی گئی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے سپرد کی گئی ہے اس لئے اب اہتمام سے مقابلہ مناسب نہیں ہے کہیں اس کی وجہ سے میرے اوپر وبال نہ آجائے اس کے بعد میں نے اہتمام سے استعفا دینا چھوڑ دیا۔

حضرت حکیم الاسلامؒ کا دوسرا خواب

حضرت حکیم الاسلامؒ نے فرمایا کہ اگرچہ میں نے استعفا دینا چھوڑ دیا لیکن اہتمام کی گرانی پھر بھی میرے اوپر باقی رہی، اسی حالت میں میں نے ایک مرتبہ خواب میں دیکھا کہ اہتمام کے اوپر جو کمرہ ہے اور اس زمانے میں یکسوئی کے ساتھ میں اہتمام دارالعلوم کی خدمت انجام اس میں دیا کرتا تھا، میں نے دیکھا کہ وہ کمرہ جنت میں آگیا ہے یا وہ جنت ہی کا ایک حجرہ ہے، جس وقت میں اس حجرہ میں پہونچا تو میں نے سُنا کہ کوئی ہاتفِ غیبی کہہ رہا ہے سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ ٥ میں آواز سُن رہا ہوں اس کی مگر کوئی صورت نظر نہیں آرہی ہے کہ یہ کون شخص ہے جو آواز دے رہا ہے اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی پھر اس کے بعد مجھے بہت سکون ہو گیا اور بار بار جو اہتمامِ دارالعلوم سے استعفا کا خیال دل میں آتا رہا اس کو میں نے نکال دیا۔

اس کے بعد حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ بڑی ذمہ داری اور امانت داری سے دارالعلوم کی ساٹھ سال تک خدمت کرتے رہے۔

اس عالمگیر شخصیت نے دارالعلوم کی عالمگیر خدمت کی، دارالعلوم اور دارالعلوم کی دینی اور تعلیمی خدمات اور علماء، دارالعلوم کا تعارف پوری دنیا میں جو کرانے والی شخصیت ہے وہ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ مہتمم دارالعلوم کی ذات گرامی ہے مگر اللہ تعالیٰ کا فیصلہ کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ ذائل ہے اس سے کسی کو مفر نہیں، جب دنیا سے آخرت کی طرف روانگی کا وقت آیا تو ہمیشہ کے لئے آپ خیریت کے ساتھ روانہ ہو گئے

حضرت حکیم الاسلامؒ کی وفات

۶ر شوال ۱۴۰۳ھ مطابق ۱۷ر جولائی ۱۹۸۳ء کو آپ دنیا سے آخرت کی طرف اس طرح روانہ ہو گئے کہ سامنے بیٹھنے والوں کو پتہ بھی نہیں چل سکا کہ آپ کب روانہ ہو گئے، جس طرح حضرت حکیم الاسلامؒ کی وفات ہوئی ہے ایسی وفات بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔

اولیاء کاملین کی وفات کے سلسلے میں اس قسم کا تذکرہ ملتا ہے مثلاً حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کا وقت جب قریب آیا تو آپ نے وضو فرمایا اور دو رکعت نماز ادا کی اس کے بعد آپ لیٹ گئے اور فرمایا۔ آقا کا حکم سر آنکھوں پر، اتنا کہتے ہی آپ کی رُوح مبارک جسمِ عنصری سے پرواز کر گئی، آپ نے آہ تک نہیں نکالی، لوگ حیرت کرتے رہے۔ اسی طرح حضرت حکیم الاسلامؒ کی وفات بھی انفرادی اور نرالی انداز سے ہوئی ہے حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب اور حضرت مولانا محمد سالم صاحب دامت برکاتہم وہاں پر موجود تھے، اخیر وقت میں مولانا محمد اسحاق صاحب

مالک کتب خانہ رحیمیہ بھی پہونچ گئے تھے، نہ تو آپ پر کسی قسم کی گھبراہٹ تھی اور نہ ہی شور وغل تھا، آپ کی طبیعت ناساز ضرور تھی لیکن کراہنے اور بے چینی کی کیفیت آپ پر طاری نہیں ہوئی تھی، حکیم محمود مرحوم کا علاج چل رہا تھا، آپ چارپائی پر آرام سے سوئے ہوئے تھے جب حکیم محمود صاحب مرحوم تشریف لاتے تو حضرت حکیم الاسلامؒ نے فرمایا کہ حکیم صاحب آپ مقامی ہو کر بھی غیر مقامی ہو گئے، حکیم محمود مرحوم کئی دن کے بعد تشریف لائے تھے اس لئے حضرتؒ نے یہ جملہ فرمایا۔ اس کے بعد آپ نے حکیم محمود مرحوم کو اپنی بیماری کی کچھ کیفیت بتلائی اس وقت آپ ہوش میں تھے اور باتیں بھی کر رہے تھے اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کو کچھ آرام تھا، حکیم محمود مرحوم نے آپ کی باتیں سننے کے بعد آپ کے پیٹ پر ہاتھ رکھا جس طرح ایک حکیم کسی مریض کے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر مرض کی کیفیت معلوم کرتا ہے حکیم محمود مرحوم بھی اسی طرح کر رہے تھے، اس کے بعد حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے چند سانس لی تقریباً ڈیڑھ منٹ تک تنفس کا سلسلہ جاری رہا اس کے بعد آپکا انتقال ہو گیا، مولانا محمد اسحاق صاحب مالک کتب خانہ رحیمیہ نے فرمایا کہ میں چارپائی کی پائنتی کی طرف بیٹھا ہوا تھا میں نے آپ کے پیر پر ہاتھ رکھا تو آپ کے پیر بالکل ٹھنڈے ہو گئے تھے مگر ان بیٹھنے والوں کو انتقال کی خبر نہیں ہوئی پھر ڈاکٹر شمیم احمد صاحب تشریف لائے انھوں نے آپ کی نبض دیکھ کر آپ کے انتقال کی خبر دی۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ؁

ایک شبہ اور اس کا جواب

ممکن ہے کہ کسی کو یہ شبہ ہو کہ بہترین وفات تو وہ ہے کہ آدمی کلمہ پڑھتا ہوا دنیا سے روانہ ہو جائے، یہاں پر تو کلمہ کا ذکر ہی نہیں پھر نرالی اور انفرادی وفات کس طرح کہی جائے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ابھی آپ نے حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کی کیفیت کا مطالعہ فرمایا، انھوں نے کلمہ کے بجائے آخری وقت میں جو جملہ اپنی زبان مبارک سے ادا کیا تھا وہ یہ ہے "آقا کا حکم سر آنکھوں پر" یہ تو کوئی کلمہ نہیں ہے، کیا اس سے کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ حضرت امام غزالی رح کی زبان مبارک سے آخری وقت میں کلمہ ادا نہیں ہوا؟ کیا ایک امام وقت کے متعلق ان کے ایمان بالخیر کے بارے میں شبہ کیا جا سکتا ہے اس لئے اس مسئلے کو خوب اچھی طرح سمجھ لو، ملک الموت علیہ السلام کے آنے اور قبض روح کی کارروائی کرنے سے پہلے اعمال کے دروازے کھلے رہتے ہیں اس وقت تک ایمان اور کفر کا اعتبار ہوتا ہے، بعض لوگوں پر قبض روح سے پہلے ایک قسم کی گھبراہٹ اور پریشانی اور بے چینی طاری ہو جاتی ہے، اس وقت اعمال کے دروازے کھلے رہتے ہیں، اس حالت کو سکراتِ موت بھی کہتے ہیں، اس وقت شیطان آکر مرنے والوں کو وساوس میں مبتلا کرتا ہے اور بہکاتا رہتا ہے اور آخری وقت تک ایمان والوں کا ایمان چھیننے کی کوشش کرتا ہے اس لئے اس وقت کا حکم یہ ہے کہ مریض کو کلمہ پڑھنے کو نہ کہا جائے بلکہ خود اس کے سامنے کلمہ پڑھا جائے اور شیطان کے پھندے سے چھوٹنے کے لئے اللہ تعالیٰ سے اس کے حق میں دعا مانگی جائے لیکن جب ملک الموت علیہ السلام تشریف لے آتے ہیں اور قبض روح

کی کارروائی شروع کر دیتے ہیں تو فوراً اعمال کے دروازے بند ہو جاتے ہیں اس وقت ایمان اور کفر کا اعتبار ختم ہو جاتا ہے اس وقت ہزاروں مرتبہ بھی آدمی کلمہ پڑھے وہ عنداللہ مقبول نہیں ہوتا اس لئے مریض کا حال قبض روح سے پہلے کا دیکھنا چاہیئے کہ اس کا حال کیا تھا کیونکہ اسلام میں اسی کا اعتبار کیا گیا ہے۔ حضرت حکیم الاسلام رحؒ کا قبضِ رُوح سے پہلے کا حال یہ ہے کہ حکیم سے اپنے مرض کے علاج کے سلسلے میں باتیں کر رہے تھے اور شریعت کا حکم یہ ہے کہ یہ جان خدا کی امانت ہے اگر بھوک لگے تو اسکو کھانا کھلاؤ اور پیاس لگے تو پانی پلاؤ اور اگر مریض ہو جائے تو مرض کا علاج کراؤ، اور سنتِ نبوی یہی ہے کہ آدمی جب بیمار ہو جائے تو اس کا علاج کرائے تاکہ آدمی ٹھیک ہو کر اللہ تعالیٰ کی عبادت میں لگ جائے، حضرت حکیم الاسلامؒ اپنے مرض کے علاج ہی کے سلسلے میں حکیم سے باتیں کر رہے تھے، یہ آپ کا آخری عمل ہے، اس سے پہلے ذکر اللہ اور توجہ الی اللہ کا عمل آپ کے معمولات میں اہم معمول رہا ہے، ظاہر ہے کہ اپنے علاج کے سلسلے میں باتیں کرنا یہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر عمل کرنا ہے اور شریعت کا حکم پورا کرنا ہے، آپ کا یہ آخری عمل حکم شرعی کی تعمیل تھا، یہ تو حیرت انگیز واقعہ ہے کہ آپ کے اوپر سکراتِ موت کی نوبت نہیں آئی اور اگر آئی تو سامنے بیٹھنے والوں کو بھی پتہ نہیں چل سکا، شیطان کو بہکانے اور ان سے بحث کرنے کا موقع ہی نہیں ملا، اتنی جلدی اور آسانی سے قبض روح کا معاملہ ہونا یہ بزرگی نہیں تو پھر کیا ہے، آپ علاج کے سلسلے میں حکیم سے باتیں کر رہے تھے کہ اچانک ملک الموت علیہ السلام تشریف لائے اور ڈیڑھ منٹ میں آپ کی روح اس طرح قبض کر لئے کہ سامنے بیٹھنے والوں کو بھی پتہ نہیں

چل سکا اور نہ ہی آپ نے کوئی آہ نکالی، اگر آپ مقبول بارگاہِ الٰہی نہ ہوتے تو ملک الموت علیہ السلام قبض رُوح کا معاملہ آپ کے ساتھ اتنا آسان نہ فرماتے اس لئے کسی بزرگ پر اس قسم کے اعتراض کر کے اپنا ایمانی نقصان نہیں کرنا چاہیئے، اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل وکرم سے حضرت حکیم الاسلام رحؒ کو غریق رحمت فرما کر ان کے درجات کو بالا اور بلند تر فرمائے آمین ثم آمین۔

حضرت حکیم الاسلامؒ کی شخصیت

ولادت سے لے کر فراغت تک اور فراغت سے لیکر وفات تک ہر زمانے کے بزرگان دین کی دُعائیں اور ان کی خصوصی توجہات اور عنایات حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ شاملِ حال رہیں، ہر ولی دوسرے ولی کو پہچانتا ہے، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی ولایت پر سارے ہی علمائے کرام اور صوفیاءِ عظام کا اتفاق ہے، حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ اس ہونہار نوجوان کو پہچانتے تھے اس لئے عہدۂ اہتمام دار العلوم کے لئے انھوں نے صرف حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو انتخاب فرمایا۔

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ نے اہتمام سے بہت بہت دور دور تک بھاگنے کی کوشش کی مگر حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کا پیچھا نہیں چھوڑا جب حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ دار العلوم چھوڑ کر پاکستان چلے گئے تو حضرت شیخ الاسلام مدنی رحمۃ اللہ علیہ بہت متفکر ہوئے کہ ان کو کسی طرح ہندوستان واپس لایا جائے اور دار العلوم کا عہدۂ اہتمام از سر نو ان کے سپرد کیا جائے، بعض لوگوں نے اعتراض بھی کیا کہ عہدۂ اہتمام کو سنبھالنے

کے لئے دیگر علماء حضرات بھی تو موجود ہیں، آپ نے فرمایا کہ علماء تو بہت ہیں مگر میری نگاہوں میں ایسا صاحبِ نسبت کوئی شخص نہیں ہے اور اہتمامِ دارالعلوم کے لئے ایسا ہی شخص ہونا چاہیئے جو صاحبِ نسبت ہو، حضرت شیخ الاسلام مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی نگاہیں بڑی وسیع تھیں وہ یہی چاہتے تھے کہ دارالعلوم کا مہتمم صاحبِ نسبت ہو تاکہ وہ اسلاف دارالعلوم کا نمونہ بن کر لوگوں کے پاس جائے اور وہ خود دارالعلوم کے اسلاف کا نمونہ بھی ہو اور ان کا ترجمان بھی ہو تاکہ دارالعلوم کی خدمات لوگوں کے سامنے آئیں اور ایسا شخص حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی نگاہوں میں صرف حضرت مولانا قاری محمد طیّب صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے اسی لئے حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو اہتمام دارالعلوم کے لئے انتخاب فرمایا، میں نے سنا ہے کہ حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کسی لیڈر سے ملنے نہیں جاتے تھے بلکہ لیڈرانِ قوم خود ان سے ملنے کے لئے آتے تھے لیکن حضرت مولانا قاری محمد طیّب صاحبؒ کو پاکستان سے ہندوستان میں لانے کے لئے خود جواہر لال نہرو کے پاس ملنے گئے اور کسی نہ کسی طرح ان کو پاکستان سے ہندوستان لے آئے اور دارالعلوم کی خدمات ان کے سپرد کر دیں

معتبر ذرائع سے مجھے یہ خبر ملی ہے کہ حضرت شیخ الاسلام صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا قاری محمد طیّب صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک جگہ کھانا کھا رہے تھے، کھانا کھانے کے بعد ہاتھ دھلانے کا جب وقت آیا تو خادم نے پہلے حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کا ہاتھ دھلانا چاہا حضرتؒ اس پر سخت برہم ہوئے اور برتن ہاتھ میں لے کر حضرت حکیم الاسلامؒ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ تجھے معلوم نہیں میں اس در کا کتا ہوں، یہ کہہ کر خود حکیم الاسلامؒ کے ہاتھ

دُھلائے، حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کا کس قدر اعزاز و اکرام و احترام فرماتے تھے، اگر ایک جگہ وہ مضامین کتابی شکل میں آجائیں تو لوگ تعجب میں پڑجائیں گے۔ حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ ایک ولی کامل تھے اس لئے دوسرے ولی کو پہچان کر ہی ان کے ساتھ یہ برتاؤ کرتے تھے، حضرت حکیم الاسلامؒ کو پاکستان سے بلانے کے بعد جب جلسہ کیا گیا تو اس جلسے میں حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ شعر پڑھا ؎

اے تماشہ گاہِ عالم رُوئے تو ✿ تو کُجا بہرِ تماشہ می رَوی

یعنی تیرا چہرہ تو خود ہی عالم کے لئے تماشہ گاہ ہے، تم دوسروں کا تماشہ دیکھنے کے لئے کہاں جارہے ہو۔

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو یہ بتلانا تھا کہ ہندوستان میں آپ کے ہزاروں عاشق ہیں آپ اس کو چھوڑ کر پاکستان جانے کو کیوں سوچ رہے ہیں، پاکستان کیا دنیا کے کسی گوشہ میں بھی آپ بھاگ کر چلے جائیں گے تو ہم آپ کا پیچھا وہاں پر بھی نہ چھوڑیں گے۔

عہدۂ اہتمام کی خدمات پر ایک نظر

جس طرح شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کے ساتھ حسن ظن تھا انھوں نے مکمل طور پر اس کا احترام فرمایا، جہاں پر وہ گئے خواہ ہند ہو یا بیرونِ ہند ہو اپنے اسلاف کا نمونہ بن کر گئے اور وہاں جاکر دارالعلوم اور اکابرین دارالعلوم کا تعارف کرایا اور ان کی ترجمانی کی اور ان کی پوری پوری نقل بھی کی اسلئے مسلمانوں کی طرف سے آپ کو حکیم الاسلام کا لقب ملا۔ لوگ ان کو دیکھ کر حیرت میں پڑجاتے تھے کہ جب اسلافِ دارالعلوم کے

ایک طالب علم یا ان کے خادم کا یہ حال ہے تو وہ حضرات کیسے رہے ہونگے دنیا والوں نے آپ کی کتنی عزت افزائی کی اور آپ کا کتنا اکرام واحترام کیا یہ بھی آپ کی انفرادیت تھی، آپ جہاں پر بھی تشریف لے جاتے ہر شخص آپ کو اپنی گود میں اُٹھانے کی خواہش ظاہر کرتا تھا، آپ کے اَسفارِ ہند اور بیرونِ ہند میں کتنے ہوئے اور ان کے اثرات لوگوں کے قلوب پر کس قدر پڑے اور لوگ دارالعلوم اور اَسلافِ دارالعلوم سے کتنے متاثر ہوتے اگر یہ ساٹھ سالہ دارالعلوم کی خدمات کوئی قلمبند کرنے والا قلمبند کرلیتا تو خدا جانے کتنی ضخیم ضخیم کتابیں تیار ہوکر امت کے ہاتھوں میں آجاتیں، لوگ اس عالمگیر اور انقلابی شخصیت کی خِدمات کا مطالعہ کرکے حیرت میں پڑجاتے وہ کتابیں علوم ومعرفت اور شریعت کے اَسرار وحِکَم اور بزرگانِ دین کے واقعات سے بھرپور ہوتیں، صدیوں تک آنے والے مسلمان ان سے فائدہ اٹھاتے مگر اس کا اہتمام نہیں کیا گیا بلکہ افسوس یہ ہے کہ اس یگانۂ روزگار شخصیت کی جو قدر کرنی چاہیئے تھی وہ نہیں کی گئی جس کی وجہ سے ایک بڑے علمی اور دینی ومعلوماتی ذخیرے سے ہم محروم ہوگئے۔

مجالسِ حکیم الاسلام کی اہمیت

میں بہت تجربے کے بعد یہ تحریر کررہا ہوں کہ میرے نزدیک اس زمانے میں سب سے بڑا بزرگ اور ولی وہ ہے جس کی مجلس غیبت اور چغلی اور دوسروں پر الزام تراشی اور بہتان سازی سے پاک اور صاف ہو، قرآن وحدیث میں ان بداعمالیوں کی کس قدر مذمت بیان کی گئی ہے اور ان کے جرائم کتنے خطرناک بتلائے گئے ہیں مگر اس کے باوجود جب اسکی لوبت آتی ہے تو لوگ بے خوف وخطر ہوکر قرآن وحدیث کو بالائے طاق رکھکر

عام طور پر ان بداعمالیوں کو استعمال کر کے خوش بھی ہوتے ہیں اور کہتے بھی ہیں کہ ہم نے فلاں کی خوب گت بنائی اور اس کو لوگوں کی نظروں میں ذلیل وخوار بنا دیا، یہ خوش ہونے کا مقام نہیں ہے بلکہ زندگی بھر رونے کا مقام ہے، ان بداعمالیوں پر کیسے کیسے ثمرات مرتب ہوتے ہیں اگر وہ ظاہر کر دیئے جائیں تو لوگ ان سے بھاگتے رہیں گے، جب کوئی ان بداعمالیوں پر اعتراض کرتا ہے تو غیبت اور چغلی کرنے والے اس کی تاویل کرتے ہیں، دنیا میں تو تاویل چل سکتی ہے مگر خدا کے یہاں کسی قسم کی تاویل نہیں چلے گی غیبت اور چغلی کرنے والوں کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ ان کی نیکیاں جن کی غیبت اور چغلی کی جاتی ہے ان کو دے دی جاتی ہیں اور قیامت کے دن ان کی بھگتان کے لئے بڑی قیمت بھی ادا کرنی پڑے گی، غیبت اور چغلی کرنے والے عام طور پر یہی جواب دیتے ہیں کہ ایک عیب دار شخص کے عیوب اور اس کے مکر وفریب سے لوگوں کو ہم آگاہ کرتے ہیں تا کہ لوگ اس کے مکر وفریب سے محفوظ رہیں، یہ غیبت اور چغلی کہاں ہوئی۔ یہ تو حقیقتِ حال کی اطلاع ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اسی قسم کی باتیں کہی تھیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہی تو غیبت ہے کہ ایک شخص کے اندر عیوب ہوں ان کو دوسروں کے سامنے بیان کیا جائے، اگر اس کے اندر وہ عیوب نہیں ہیں تو یہ بہتان اور الزام ہے یہ اس سے بھی زیادہ خطرناک ہے، غیبت اور چغلی کرنے والے دوسروں پر بہتان اور الزام لگانے والے اور سننے والے دونوں پکڑ لئے جاتے ہیں اس لئے میری رائے یہی ہے کہ اگر کسی کی مجلس میں غیبت اور چغلی اور الزام و بہتان کی باتیں ہوتی ہوں تو اس کی بزرگی پر اعتماد نہیں

کرنا چاہیئے، ایسا شخص بزرگ ہو ہی نہیں سکتا، اس لئے وہاں سے اُٹھ کر چلا جانا چاہیئے، جہاں تک میں نے دیکھا ہے یا سنا ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے اسلاف کی مجالس ان بداعمالیوں سے پاک وصاف ہوتی تھیں، ان کا نمونہ حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ ہمارے سامنے تھے، میں حضرت حکیم الاسلامؒ سے اس لئے نہیں معتقد ہوا تھا کہ وہ ایک عالمِ باعمل دارالعلوم کے مہتمم تھے اور عالمگیر شخصیت کے حامل تھے اور بہت بہترین وعظ فرمایا کرتے تھے بلکہ ان سے میرے اعتقاد کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ انکی ہزاروں خوبیوں میں سے جو میں نے بڑی خوبی دیکھی وہ یہ تھی کہ ان کی مجلس غیبت اور چغلی اور دوسروں پر بہتان اور الزام سازی سے پاک اور صاف ہوتی تھی، اسی لئے میں نے ان کو اسلافِ دیوبند کا نمونہ لکھا ہے، وہ صرف وعظ وتقریر اور تبلیغ وخلوص اور تعلق مع اللہ اور حسن اخلاق وغیرہ ہی میں نمونہ نہیں تھے بلکہ اپنی مجالس کو غیبت اور چغلی وغیرہ سے پاک وصاف رکھنے میں بھی اسلافِ دیوبند کا نمونہ تھے، آپ کا سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ ان چیزوں کی نوبت ہی نہیں آنے دیتے تھے، آپ مجلس میں آکر بیٹھ جاتے، اگر کوئی شخص کسی قسم کا سوال کرتا تو آپ اس کا جواب عنایت فرماتے اور اگر کوئی سوال کرنے والا نہ ہوتا تو آپ شریعت کے کسی مضمون پر بیان شروع فرمادیتے، آپ کا بیان خالص قرآن وحدیث کی روشنی میں ہوتا، آپ بزرگانِ دین کے واقعات کو مثال میں دے کر مضمون کو سمجھاتے، آپ کا بیان خالص دینی پیرایہ میں ہوتا تھا، لوگ بڑے ادب اور احترام سے آپ کی باتیں سنتے تھے، یہی وجہ تھی کہ آپ کی شخصیت پر ہر مکتبۂ فکر کے لوگ اعتماد کرتے تھے اور آپ کے بیانات سے متاثر بھی ہوتے تھے، اگر

حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی طرح بیانات ہوں تو یقیناً لوگوں کو فائدہ پہونچے گا، ہمارے اکابر دوسروں کی عیب جوئی نہیں کرتے تھے بلکہ اپنے ہی عیوب پر نظر رکھتے تھے، جب کوئی شخص اپنے آپ کو عیب دار اور گنہگار سمجھے گا تو بلا وجہ دوسروں کی غیبت کرکے اپنے اوپر مزید گناہوں کا بار ڈالنے سے بہت دور رہے گا جس طرح ہمارے اکابرین کی مجالس چغلی وغیبت وغیرہ سے پاک ہوتی تھیں اسی طرح حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی مجالس بھی ان سے پاک ہوتی تھیں، اب وہ نرالی شخصیت ہمیشہ کے لئے ہم سے جدا ہوگئی، اگر ان کی صحبت کے اثرات دیکھنے ہوں تو ان کی مجالس کا برابر مطالعہ کرتے رہیں اور بہتر یہ ہے کہ ایک تعلیمی حلقہ بنا کر برابر لوگوں کو سناتے رہیں۔ انشاء اللہ سنانے والے اور سننے والے دونوں کو علمی اور اصلاحی اور دینی فائدہ پہونچے گا اور ان کی یہ مجالس ان کی صحبت کا بدل بھی ثابت ہوں گی۔

حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کا ایک عجیب واقعہ

حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بڑے عجیب وغریب واقعات سننے میں آئے ہیں اب بھی وقت ہے اگر کچھ حضرات ان لوگوں کے پاس جائیں جن لوگوں کے مکانوں پر حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ ٹھہرا کرتے تھے تو ان کی خصوصیات زندگی کے بڑے عجیب وغریب واقعات ان حضرات کے ذریعہ دستیاب ہوسکتے ہیں اور ان واقعات کو ان کی سوانح حیات کے اندر شامل کرکے ان کی شخصیت کو نمایاں کیا جاسکتا ہے۔ حضرت مولانا نیر احمد صاحب ربانی استاذ دار العلوم سبیل الرشاد بنگلور نے ارشاد فرمایا کہ حضرت حکیم الاسلام رح کی زندگی میں ان کے بہت سے عاشق اور چاہنے والے تھے مگر ان کی عقیدت ان کی زندگی تک محدود رہی اب ان کے چلے جانے کے بعد کوئی عاشق نہیں رہا اسی لئے

حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت ان کے انتقال کے بعد نمایاں نہ ہو سکی حقیقت یہی ہے کہ ان کی زندگی ہی میں ان کی ہر مجلس اور ہر ارشاد اور ہر وعظ اور ان کے اثرات کو خود ان کی خدمت میں رہ کر اور ان کی عملی زندگی کو دیکھکر قلمبند کرنے کا اگر اہتمام کر لیا جاتا تو ایک علمی ذخیرہ مل جاتا مگر نہ ان کی زندگی میں اس کا اہتمام کیا گیا اور نہ ہی انتقال کے بعد ہی اس کا اہتمام کیا گیا میں نے حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب مدظلہٗ العالی کو اس خدمت کیلئے تیار کر لیا تھا اور اپنے طور پر بعض عاشقوں سے گذارش بھی کی تھی مگر اس کام کیلئے کوئی تیار نہیں ہوا مفتی صاحب بھی افسوس کرتے رہے اور میں بھی افسوس کرتا رہا پھر بھی دوڑ بھاگ لگا کر میں نے کچھ مواد جمع ہی کر لیا ان کی مجالس کے پڑھنے والے اس کا خود فیصلہ کریں گے کہ اگر اس طرح آپ کی مجالس قلم بند کر لی جاتیں تو علماء اور عوام اور خواص کو کس قدر ان کی مجالس سے علمی اصلاحی اور روحانی فیض پہونچتا میں نمونہ کے طور پر ان واقعات میں سے ایک واقعہ کو نقل کر رہا ہوں بمبئی میں حضرت حکیم الاسلامؒ کے مریدوں اور عاشقوں میں ایک مرید اور عاشق محمد صدیق صاحب مرحوم فرنیچر والے تھے حضرت حکیم الاسلامؒ کی کبھی کبھی وہ دعوت کرتے تھے، ور اپنے گھر لے جاتے تھے اور رات کو اپنے گھر پر ہی ٹھہراتے تھے انھوں نے مجھ سے یہ واقعہ بیان کیا کہ حضرت حکیم الاسلامؒ ہمارے گھر پر تشریف لائے اور رات کو کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر آرام کیلئے لیٹ گئے میں ان کی چارپائی کے بازو میں بیٹھ گیا حضرتؒ نے نیند ہی کی حالت میں وعظ شروع فرمایا اور کافی دیر تک وعظ فرماتے رہے اگر اسوقت میرے پاس ٹیپ ریکارڈ ہوتا تو میں پورا وعظ ٹیپ کر لیتا ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ حضرت کے وعظ سے علوم و معرفت اور حقائق کا دریا بہہ رہا ہے میں اس وعظ کے سننے میں مست رہا وعظ

ختم ہوا حضرتؒ نیند ہی کی حالت میں سوتے ہی رہے۔ جب صبح کو نماز کے لئے اٹھے اور اپنے معمولات سے فارغ ہو گئے تو میں نے عرض کیا کہ حضرت آپ رات کو سوتے سوتے وعظ فرما رہے تھے آپ کی آواز بالکل صاف تھی اگر ہمارے پاس ٹیپ رکارڈ ہوتا تو میں رات کے وعظ کو ٹیپ کر لیتا حضرت حکیم الاسلامؒ نے مسکراتے ہوئے فرمایا کہ کلکتہ میں میرے وعظ کا پروگرام تھا۔ یہ وعظ جس کو آپ نے سنا ہے میں اسی پروگرام میں بیان کر رہا تھا محمد صدیق صاحب مرحوم پر اس قدر ادب واحترام غالب تھا کہ اس سے زیادہ وہ معلوم نہ کر سکے کہ حضرت آپ تو ہمارے یہاں سو رہے تھے پھر کلکتہ کیسے چلے گئے یہ اولیاء اللہ کا راز ہوتا ہے اس کو کسی خاص مرید ہی کو بتلا سکتے ہیں ورنہ عموماً چھپا ہی دیتے ہیں لیکن محمد صدیق صاحب مرحوم اگر معلوم کرتے تو شاید ان کو بتلا دیتے اب تو نہ شیخ ہی رہے اور نہ مرید ہی رہے اب تو یہ راز چھپا ہوا چھپا ہی رہا لیکن اس عجیب و غریب واقعہ کو پڑھکر حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت کا پتہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کن اولیاء کرام میں سے تھے اور ان کا مقام کتنا بلند تھا۔ یہی وہ تکوینی امور ہیں۔ جو صاحبِ واقعہ ولی کے سمجھانے سے ہی سمجھ میں آسکتے ہیں بعض مرتبہ تکوینی امور کی مجالس میں اولیاء کرام جسم کے ساتھ تشریف لے جاتے ہیں مگر اس واقعہ سے یہی معلوم ہو رہا ہے کہ بعض مرتبہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان کا جسم اپنے مقام پر رہتا ہے صرف ان کی روح جاتی ہے اور روح کا تعلق جسم کے ساتھ ایسا قوی ہوتا ہے کہ اصل بیان تو کلکتہ کے اندر اولیاء کرام کی مجلس میں ہو رہا ہے مگر اس جسم سے زبان کے ذریعہ آواز سنائی دے رہی ہے ممکن ہے یہاں پر بھی ایسا ہی ہوا ہو اگر محمد صدیق صاحب مرحوم باحیات ہوتے تو یہ واقعہ انھیں کے قلم سے لکھواتا حسنِ ظن تو صرف اولیاء کرام اور بزرگانِ دین ہی کے ساتھ مخصوص

اور محدود نہیں ہے بلکہ سارے ہی مسلمانوں سے حسن ظن قائم رکھنا چاہیئے یہی اسلام کا حکم ہے مگر یہاں پر کوئی حسن ظن کی بات نہیں ہے بلکہ اپنی جگہ پر ایک حقیقت ہے اور سننے والے کی سچی شہادت ہے اسلئے جن لوگوں نے بہت قریب سے حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کو دیکھا ہے اور ان کی مجالس اور ان کے مواعظ میں شرکت بھی کی ہے اور ان کے معمولاتِ زندگی کو بھی دیکھا ہے اگر وہ لوگ حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کی ولایت پر شک اور شبہہ کریں تو یہ ان کی نامحرومی ہے کہ ان کی زندگی میں تو ان کی بزرگی اور ولایت کے قائل تھے مگر انتقال کے بعد بدظن ہو گئے بعض بزرگوں سے اللہ تعالیٰ شروع میں امتحان لیتے ہیں اور مختلف قسم کی مصیبتیں اور پریشانیاں ڈال کر ان کو آزماتے ہیں مگر حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ سے آخری عمر میں امتحان لئے۔ حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ رائے پوری، اور بعض بزرگوں نے بہت پہلے اس مصیبت کی اطلاع دی تھی میں نے اس ابتلا کی حالت میں حضرت حکیم الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کا مختلف طریقوں سے جائزہ لیا تھا اس لئے ان کی بے لوثی کا میں نے فیصلہ لکھا ہے البتہ ان کے بعض مریدین اور عاشقین پر افسوس ہوتا ہے کہ بہت دنوں تک ان کی خدمت کرنے اور ان کی صحبت میں رہنے کے بعد بھی حضرت حکیم الاسلامؒ کو نہ پہچان سکے اور ان پر ہنگامی حملے کو دیکھکر ان سے بدظن ہو گئے موجودہ بزرگوں میں سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندوی ہیں اگر اُن کی شخصیت پر اعتماد ہو تو ان کے پیش لفظ کو بار بار پڑھیں اور سوچیں کہ کہیں انھوں نے حضرت حکیم الاسلامؒ کو بغیر جانے اور پہچانے تو ان کا تعارف نہیں کرا دیا ہے اسی طرح حضرت مولانا شیخ الاسلام حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے ارشادات کو دیکھیں اور سوچیں کہ کیا کہیں انھوں نے ان کے سمجھنے میں کوئی غلطی تو نہیں کی ہے ورنہ اعتراض کرنے والے پہلے اپنے آپ ہی کو دیکھ لیں کہ ہم کتنے بڑے بزرگ اور ولی ہیں۔ فقط، حبیب اللہ قاسمی. بانی و صدر تنظیم اولیائے چشتیہ دہلی

حضرت حکیم الاسلام کا آخری خواب

تک ہی محدود۔

جب دارالعلوم کے اندر ہنگامے شروع ہو گئے تو حضرت حکیم الاسلام رحمہ اللہ بہت پریشان ہوئے۔ انہوں نے ایک مرتبہ مجھ سے فرمایا کہ دارالعلوم کے اندر ایسے ہنگامے شروع ہو گئے ہیں کہ اس کے اثرات باہر پھیلتے جارہے ہیں اس کی وجہ سے دارالعلوم کے علماء کی شخصیات مجروح ہو رہی ہیں اور دارالعلوم کا وقار مسلمانوں کے دلوں سے نکلتا جارہا ہے۔ اس لئے دارالعلوم کے معاملات دارالعلوم تک ہی محدود ہونے چاہئیں۔ میں نے کہا کہ حضرت بہتر صورت یہی ہے کہ دارالعلوم کے اساتذہ ایک جگہ بیٹھ کر مصالحت کرلیں اور ایک دوسرے کے متعلق جو شکوک و شبہات ان کے دلوں میں پیدا ہو گئے ہیں ان کو دور کرلیں اور یہ بیٹھ کر آپس میں باتیں کرنے ہی سے حل ہو سکتا ہے۔ حضرت حکیم الاسلام رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اس وقت اس سے بہتر کوئی صورت نہیں ہے اور میں یہی چاہتا ہوں کہ گھر کی باتیں اپنے گھر تک ہی محدود رہیں باہر جانے سے ہماری بڑی بدنامی ہو رہی ہے اس وقت حضرت حکیم الاسلام رحمتہ اللہ علیہ پر ایک عجیب کیفیت طاری تھی ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے ہزاروں فکر و غم میں ڈوب کر حضرت حکیم الاسلام اپنے مفید اور مجرب حکیمانہ نسخے کو خود استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ اور دارالعلوم کے دیگر اساتذہ اور طلباء کو بھی پلانا چاہتے ہیں میں نے کہا کہ حضرت میں بھی اس سلسلے میں ایک کوشش کرلوں حضرت حکیم الاسلام رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ بہتر ہے کرلو اگر ایسا ہو گیا تو ایک بہت بڑی بلا سے نجات مل جائے گی اور دارالعلوم کی روایات اور اس کے کردار کی حفاظت ہو جائے گی۔ ہم کو ایسا ہی کرنا چاہیے۔

اس کے بعد میں نے اس سلسلے میں لوگوں سے حضرت حکیم الاسلام کے منشاء کو بتلانے اور آپس میں مل جانے اور بیٹھ کر مشورہ کرنے کے لئے کوشش کی مگر ناکام رہا آگے کیا ہوا بس وہی ہوا جو ہونا تھا اب پرانی کہانی سنانے سے کوئی فائدہ نہیں مجھے تو صرف حضرت حکیم الاسلام رحمتہ اللہ علیہ کی بے لوث شخصیت کا تعارف کرانا تھا بس کرادیا۔ البتہ آگے یہ لکھتا ہے کہ جب حکیم الاسلام رحمتہ اللہ علیہ پر خدا کی طرف سے کٹھن امتحان ڈال دیا گیا تو وہ پریشان ہوئے وہ کوئی ایسی جگہ تلاش کر رہے تھے کہ جہاں پر کوئی پہنچ نہ سکے۔ غایت تعلق کی بناء پر علی محمد صاحب شیر میوات نے ان کو شاہ ولی اللہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ کی روحانی درگاہ میں لا کر چھپا دیا۔

انہوں نے فرمایا کہ بعض مرتبہ میں نے ان کو ایسا چھپایا کہ لوگوں کو پتہ ہی نہیں چلنے دیا کہ حضرت حکیم الاسلام ہمارے پاس موجود ہیں۔ جس وقت مجالس حکیم الاسلام مع تذکرہ خاندان قاسمی کی کتابت ہو گئی اور نیگیٹو والے کے پاس کتابت شدہ اوراق پہنچ گئے تو میں علی محمد صاحب شیر میوات صدر و متولی درگاہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ و بانی جامعہ رحیمیہ دہلی سے ملنے کے لئے گیا اور مجالس حکیم الاسلام کا پہلا نیگیٹو دکھلا کر کہا کہ میں نے حضرت حکیم الاسلام رحمتہ اللہ علیہ کی زندگی ہی میں یہ کام کر لیا تھا اب آپ کو اس کی طباعت کی خوشخبری سنانے آیا ہوں۔ حضرت حکیم الاسلام رحمتہ اللہ علیہ کا نام سنتے ہی ان کی یاد تازہ ہو گئی سر اوپر اٹھا کر باتیں کر رہے تھے حکیم الاسلام کا نام سن کر اپنے سر کو جھکا لئے تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے سر کو اٹھایا اور فرمایا کہ حضرت حکیم الاسلام رحمتہ اللہ دارالعلوم کے ہنگامے کے وقت کبھی کبھی میرے پاس تشریف لایا کرتے تھے یہاں پر آنے کے بعد ان کو کچھ سکون ملتا تھا اور حضرت اپنی پریشانی کو بھی بیان فرماتے تھے اور کہتے تھے کہ میں بہت کمزور ہو چکا ہوں لڑائی جھگڑے کے قابل نہ رہا مجھے لوگ لڑا رہے ہیں اور تنگ کر رہے ہیں میں اپنی مجبوری ان کے سامنے پیش کرتا ہوں اور کہتا رہوں کہ اب اپنا کمانڈر بدل دو اور مجھے چھوڑ دو مگر لوگ میرا پیچھا نہیں چھوڑ رہے ہیں حضرت علی محمد شیر میوات نے فرمایا کہ لوگوں کو میں نے بہت سمجھایا کہ حضرت کمزور ہو چکے ہیں ان کے حال پر رحم کرو اور ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو مگر لوگ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوئے ایک مرتبہ اسی پریشانی کی حالت میں انتقال سے آٹھ دس دن پہلے میرے یہاں حضرت تشریف لائے اور رات کو ہمارے ہی پاس قیام فرمائے جب میں صبح کو حضرت حکیم الاسلام سے ملنے کی غرض سے گیا تو آپ نے فرمایا کہ آج رات کو میں نے ایک عجیب خواب دیکھا ہے وہ ہے کہ میرے کپڑوں سے بچھو اور کھن کھجورے اور سانپ وغیرہ موذی جانور لپٹے ہوئے ہیں اور میں اپنے مکان کی طرف جارہا ہوں اور وہ موذی جانور ہمارے ـــــ کپڑوں سے خود بخود گرتے جا رہے ہیں یہاں تک کہ مکان تک پہنچتے پہنچتے وہ سب خود بخود گر گئے اور میرے کپڑے ان موذی جانوروں سے صاف ہو گئے اس وقت سے مجھے بہت سکون محسوس ہو رہا ہے اور یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ اب اللہ تعالیٰ مجھے ان فتنوں سے نجات دلانا چاہتے ہیں جو مجھے لپٹے اور چمٹے ہوئے ہیں اس خواب کے بعد حضرت رحمتہ اللہ علیہ دیوبند تشریف لے گئے اور آٹھ دس دن کے بعد آخرت کی طرف روانہ ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

ناقل حبیب اللہ قاسمی